گرہ کھلتی ہے

جہاد کے دور کا پاکستان

جان۔ آر۔ شمٹ

ترجمہ: اعزاز باقر

مشعل بکس

آر۔بی5، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس

عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان

MashalBooks.org

گرہ کھلتی ہے
جہاد کے دور کا پاکستان

جان۔آر۔شمٹ

ترجمہ: اعزاز باقر

کاپی رائٹ اردو © 2014 مشعل بکس

کاپی رائٹ انگریزی © 2011 جان۔آر۔شمٹ

ناشر: مشعل بکس

آر-بی-5، سیکنڈ فلور،

عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن،

لاہور-54600، پاکستان

فون و فیکس 042-35866859

Email: mashbks@brain.net.pk

http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

مندرجات

	تعارف	5
1	ایک غیر یقینی ریاست	25
2	جاگیردار اور فوج	45
3	مذہب، ضیاء، اور افغانستان میں روس مخالف جہاد	73
4	کشمیر، انڈیا اور جہاد کی سرکاری سرپرستی	103
5	طالبان، بن لادن، اور نائن الیون کی سمت آغاز سفر	133
6	قبائلی علاقہ جات، نائن الیون، اور پاکستانی طالبان کا ظہور	159
7	لال مسجد، فوج کی ناکامی، اور ملکی دہشت گردی کی مہم	191
8	ممبئی، وقوعہء بونیر، اور امریکہ کی مشکلات	219
9	مستقبل میں حالات کیا رخ اختیار کر سکتے ہیں	259
10	حتمی گرہ کشائی	287

MashalBooks.org

MashalBooks.org

تعارف

25 مارچ 2000، اسلام آباد

یہ نائن الیون سے تقریباً پورے 18 ماہ قبل کی بات ہے۔صدر کلنٹن نے جنوبی ایشیاء کے اپنے طویل دورے کے اختتام پر پاکستان میں پانچ گھنٹوں کے مختصر قیام کے لئے آمادگی ظاہر کر دی ہے۔ یہ سیاسی طور پر ایک متنازعہ دورہ ہے کیونکہ اسے صدر پرویز مشرف کی اس حکومت کو قانونی جواز فراہم کرنے کے نقطہ نظر سے دیکھا جا سکتا ہے جو کہ گزشتہ اکتوبر میں ایک فوجی بغاوت کے نتیجے میں منظر عام پر آئی تھی۔تاہم ایٹمی طاقت کا حامل ہونے کے ساتھ ہی کشمیر کے تنازعے پر بھارت کے ساتھ جہادی تنظیموں کی وساطت سے جنگ جاری رکھنے والے، ملک کی حیثیت سے پاکستان کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔صدر کی حفاظت کے فرائض انجام دینے والے خفیہ ادارے کے ارکان کے پاس بھی اس دورے کی مخالفت کے اپنے جواز ہیں۔انہیں یہ خدشہ ہے کہ 18 ماہ قبل کینیا اور تنزانیہ میں امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکوں کی ذمہ دار جہادی تنظیم القاعدہ کا گڑھ ہمسایہ ملک افغانستان میں ہونے والی خانہ جنگی میں فاتح کے طور پر سامنے آنے والے ان طالبان کا معزز مہمان ہے جن کی سب سے بڑی پشت پناہ حکومت پاکستان ہے۔

خفیہ والوں کے ان خدشات کے باوجود، صدر کلنٹن دورے کے حق میں فیصلہ کرتے ہیں اور ان کی آمد کا وقت بالکل قریب ہے۔صبح کے سورج کی اجلی روشنی میں ایک طیارے کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ یہ مشہور زمانہ بوئنگ 747 ائرفورس ون نہیں ہے بلکہ کافی حد تک چھوٹا 737 طیارہ ہے جو کہ امریکی حکومت کی نیلی اور سفید وردی کے واضح نشان کے ساتھ جلوہ گر ہو چکا ہے۔طیارہ زمین پر اترتا ہے اور حرکت کرتا ہوا جائزہ لیے جانے والے مقام تک پہنچ جاتا ہے۔مگر

اندر سے کوئی صدر برآمد نہیں ہوتا اس سے اترنے والے مسافر صحافیوں کے دستے کے ارکان نکلتے ہیں۔ جلد ہی افق پر اس سے بھی چھوٹا ایک اور جہاز نمودار ہوتا ہے۔ یہ ایک تجارتی جیٹ طیارہ ہے اور اس پر بھی حکومت امریکہ کے مخصوص امتیازی نشانات نمایاں نظر آتے ہیں۔ زمین پر اتر کر یہ لڑھکتا ہوا 737 کے عقب میں آ کر رک جاتا ہے۔ چند سرکاری عہدیدار برآمد ہوتے ہیں مگر ان میں صدر صاحب شامل نہیں ہیں۔ کچھ دیر بعد ایک اور جہاز نظر آتا ہے جو اگرچہ تجارتی جیٹ کے حجم کا ہے مگر اس پر کسی ملک کا امتیازی نشان نہیں ہے۔ یہ بھی گزشتہ جہاز کے ساتھ آ کر رک جاتا ہے۔ چند ایک اور عہدیدار برآمد ہوتے ہیں مگر ایک مرتبہ پھر صدر کے بغیر۔ کچھ اور وقت گزرتا ہے اور آخر کار ایک اور چھوٹا تجارتی جیٹ طیارہ نمودار ہوتا ہے۔ پچھلے طیارے کی ہو بہو نقل یہ بالکل ہی بے نشان نظر آتا ہے۔ یہ 737 کے عقب میں کسی نہ نظر آنے والے مقام پر رک جاتا ہے۔ چند منٹ اور گزر جاتے ہیں جہاز کا دروازہ اچانک گھوم کر کھل جاتا ہے اور چمکتی دھوپ میں ایک شناسا سا چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ امریکی صدر آخر کار زمین پر قدم رنجہ فرماتا ہے۔

21 فروری 2002، کراچی

وال سٹریٹ جرنل کا جنوبی ایشیا کے لئے نمائندہ ڈینیئل پرل جنوب میں واقع بندرگاہ کے کنارے تیزی سے پھیلتے ہوئے شہر کراچی میں ایک معروف مذہبی عالم سے ملاقات کے لئے جاتے ہوئے راستے میں کہیں غائب ہو جاتا ہے۔ کئی روز کے بعد اس کے آجر کو ایک ای۔میل موصول ہوتی ہے جس میں ڈینیئل پرل زنجیروں میں جکڑا ہوا اور اس کے سر کا نشانہ لیتی ہوئی ایک بندوق کے ساتھ دکھائی دیتا ہے۔ اس کو قید میں رکھنے والوں کا مطالبہ ہے کہ اگر امریکہ نے گوانتاناموبے میں محصور پاکستانی قیدیوں کو رہا نہ کیا تو اسے ہلاک کر دیا جائے گا۔ محبّ وطن پاکستانی جذبات کا مظاہرہ کرتے ہوئے وہ ان ایف سولہ طیاروں کی حوالگی کا مطالبہ بھی کرتے ہیں جو دراصل 1980 میں خریدے گئے تھے مگر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف عائد امریکی پابندیوں کی بناء پر انہیں کبھی بھی پاکستان کے حوالے نہیں کیا گیا تھا۔ ڈینیئل پرل کی تلاش کی وسیع تر کوششوں کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔ جیسا کہ پرل کو یرغمال بنانے والے بخوبی جانتے تھے کہ ایک کروڑ بیس لاکھ آبادی پر مشتمل بے آب و گیاہ شہر میں جہاں کچی آبادیوں کی بھرمار

تھی، چھپ جانا بہت آسان ہوتا ہے۔ اور یہاں پر تشدد کی وارداتیں بشمول کئی عشروں سے جاری گلی محلوں کی لڑائیاں اور لسانی و مذہبی فسادات عام ہیں جن میں 1995 میں اپنے کام پر جاتے ہوئے دو امریکی سفارت کاروں سمیت بے شمار غیر ملکیوں پر حملے اور ان کی ہلاکت کے واقعات بھی نمایاں اہمیت کے حامل ہیں۔

ڈینیئل پرل کا بھی یہی انجام ہوگا۔ 21 فروری کو کچھ نامعلوم افراد امریکی قونصل خانہ کراچی کو ایک عدد ویڈیو ٹیپ بھجواتے ہیں۔ یہ ساڑھے تین منٹ کے دورانئے پر مشتمل ہے اور اس کا آغاز ڈینیئل پرل کی طرف سے اپنے یہودی ثقافتی ورثے کی تفصیلات کے بیان اور اپنے اغواء کنندگان کے مطالبات کی تکرار سے ہوتا ہے۔ اس کے اختتام میں پرل ایک خالی فرش پر بغیر قمیص کے لیٹا نظر آتا ہے اور اس کا گلا کٹا ہوا دکھائی دیتا ہے جس کا مطلب ہے کہ وہ بظاہر پہلے ہی موت کے منہ میں جا چکا تھا۔ اس کے بعد ایک شخص کیمرے کے سامنے رہتے ہوئے، اس کا سر اس کے بے جان تن سے جدا کر دیتا ہے اور ساتھ ہی مطالبات کی فہرست سکرین پر دوبارہ لہراتی نظر آتی ہے۔ پانچ برس کے بعد القاعدہ میں تیسرے نمبر کا عہدیدار اور نائن الیون کا اصل منصوبہ ساز خالد شیخ محمد گوانتانا موبے میں اپنے امریکی نگرانوں کے سامنے یہ گھناؤنا فعل انجام دینے کا فخریہ اعتراف کرتا ہے۔

27 دسمبر 2007، راولپنڈی

شمالی پنجاب کے شہر راولپنڈی میں ایک جلسے کے اختتام پر اپنی ایس یو وی (SUV) گاڑی کی کھل جانے والی چھت (Sunroof) سے منہ باہر نکال کر بے نظیر بھٹو عوام کے ہیجان خیز ہجوم کی طرف ہاتھ لہراتی نظر آتی ہیں۔ وہ ابھی دو ماہ پہلے ہی انتخابات میں شرکت کے لئے صدر پرویز مشرف سے آٹھ سالہ جلاوطنی کے خاتمے کے تفصیلی معاہدے کے بعد وطن واپس لوٹی ہیں۔ کراچی پہنچنے پر ان کا استقبال وطن واپسی پر اسے خوش آمدید کہنے کے لئے بے تاب حامیوں کا موٹر کاروں پر مشتمل قافلہ کرتا ہے۔ مگر ان کی اور ان کے حامیوں کی خوشی اس وقت ادھوری ثابت ہوتی ہے جب کسی تخریب کار کی طرف سے ان کے استقبالی جلوس کے آگے پھینکے جانے والے دو بڑے بم دھماکے سے پھٹ جاتے ہیں اس کے نتیجے میں وہ خود تو بچ جاتی ہیں مگر

ایک وسیع تر تباہی اور افراتفری کی زد میں آ کر 140 سے زائد دیگر افراد ہلاک ہو جاتے ہیں۔

اب وہ ایک بار پھر مقدر کو دعوت دیتے ہوئے اپنی جان کو لاحق خطرات کے حوالے سے احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کے بے شمار مشوروں کے باوجود کھلے عام مہم چلانے لگتی ہیں۔ ان کی ایس یو وی گاڑی جیسے ہی عوام کے الوداع کہتے ہوئے سمندر میں سے ہو کر گزرنے لگتی ہے تو کہیں سے گولیوں کی تڑتڑاہٹ سنائی دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی بم پھٹنے کی زوردار آواز۔ زوردار ضرب کے اثر کی شدت کو محسوس کرتے ہوئے بے نظیر پیچھے ہو کر اپنا سر نیچے کر لیتی ہیں، ان کے سر کا پچھلا حصہ کھلے حصے (hatch) کی پشت سے جا ٹکراتا ہے۔ انہیں جلدی سے ایک قریبی ہسپتال لے جایا جاتا ہے مگر اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ دو مرتبہ وزیر اعظم بننے والی اور اس وقت پاکستان میں اپنی مقبولیت کے عروج طرف گامزن بے نظیر بھٹو موت کی آغوش میں چلی جاتی ہیں الزام تراشی اور جوابی الزامات کا سلسلہ فوری طور پر شروع ہو جاتا ہے کیونکہ بے نظیر کے حامی حکومت کو مناسب تحفظ فراہم نہ کرنے کے جرم کا مرتکب قرار دیتے ہیں۔ ان کی قتل کی ذمہ دار ایک دوسرے کو ٹھہرانے کے دعوؤں اور جوابی دعووں کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔ سی آئی اے کا ڈائریکٹر مائیکل ہیڈن ایک ماہ بعد امریکہ کے حتمی فیصلے کا اعلان کر دیتا ہے، جس کے مطابق اس قتل کی سازش کی ذمہ داری صرف اور صرف پاکستانی طالبان کے لیڈر بیت اللہ محسود پر ہی عائد ہوتی ہے۔

افغانستان کی سرحد کے قریب واقع جنوبی وزیرستان کے ناہموار پتھریلی سطح والے قبائلی علاقوں پر تسلط کے لئے پاکستانی فوج کے ساتھ برسرِ پیکار اور القاعدہ کے ساتھ کے قریبی روابط رکھنے والے محسود نے پاکستان کے شہری علاقوں میں دہشت گردی کے ذریعے جوابی لڑائی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ بے نظیر بھٹو اس کا تازہ ترین ہدف تھیں۔

26 نومبر 2008، ممبئی

دس عدد داڑھی مونچھ صاف خوب تربیت یافتہ کالی ٹی شرٹس اور کارگو پتلونوں میں عمدگی سے ملبوس نوجوان ایک خاص مقصد کے تحت ممبئی کے بندرگاہ والے علاقے سے نکل کر عالمگیر ثقافت والے عظیم الشان شہر کی گلیوں سے گزرتے چلے جاتے ہیں۔ علیحدہ علیحدہ ٹولیوں میں بٹ کر چند نوجوان ٹیکسی کے ذریعے اور چند پیدل چلتے ہوئے شہر کے مختلف مقامات کی جانب روانہ ہو

جاتے ہیں۔ دونو جوان بشمول اجمل قصاب مرکزی ریلوے اسٹیشن سے گزرتے ہوئے اپنی اے کے47 رائفلوں کے منہ سے آگ اگلتے ہوئے مسافروں سے بھرے ہوئے بڑے ہال میں 50 سے زائد لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیتے ہیں۔ دوسرے اہداف میں ایک ہسپتال، ایک مشہور کیفے، اور دو بڑے ہوٹل، اوبرائے اور تاج محل شامل ہیں۔ ایک گمنام سا یہودی مرکز بھی، جو کہ صرف منصوبہ بند ہدف ہی ہوسکتا تھا، حملے کی زد میں آجاتا ہے اور اس کے مکینوں کو یرغمال بنا لئے جانے کے بعد ہلاک کر دیا جاتا ہے۔ تاہم آخرکار جب انڈیا کی پولیس کے کمانڈو حملوں کے آغاز کے 60 گھنٹے گزرنے کے بعد تاج ہوٹل کو گھیرے میں لے لیتے ہیں اور قتل و غارت کی کاروائیاں اختتام پذیر ہوجاتی ہیں تو اس وقت تک بے شمار مغربی سیاحوں سمیت160 افراد ہلاک ہو چکے ہوتے ہیں۔ دہشت گرد حملوں کی زد سے انڈیا اور پاکستان کے درمیان امن مذاکرات کا وہ مرحلہ بھی محفوظ نہیں رہتا جو تقریباً 5 برس قبل شروع ہوا تھا۔ کیونکہ اس ساری کاروائی کے دوران واحد بچ جانے والا دہشت گرد اجمل قصاب گرفتاری کے بعد حکام پر جلد ہی یہ واضح کر دیتا ہے کہ وہ اور اس کے نوجوان ساتھی پاکستان سے تعلق رکھتے ہیں۔

انہیں پنجاب کے دارالحکومت لاہور سے چند میل کے فاصلے پر واقع پرشکوہ عمارت کے اندر دفاتر رکھنے والی جہادی تنظیم لشکر طیبہ نے بھیجا تھا۔ اس گروہ یا تنظیم کی تشکیل 1990 کی دہائی کے شروع میں پاکستانی فوج کے خفیہ ادارے آئی ایس آئی کی حمایت اور ممکنہ طور پر اس کے ایماء پر عمل میں آئی تھی۔ اس کا بنیادی مقصد کشمیر میں بھارت کے خلاف اٹھنے والی اس مسلمان بغاوت کی حمایت کے لئے سرایت کر جانا تھا جو مقبوضہ علاقے کے اندر حال ہی میں دوبارہ جاگ اٹھی تھی۔

بھاری مسلم اکثریت کے حامل کشمیر کے اندر بھارتی افواج پر اپنے دیدہ دلیرانہ حملوں اور اس کے ساتھ ہی بھارت کے اندر بھی حیران کن دہشت گرد واقعات کی بدولت لشکر طیبہ تیزی سے بدنام زمانہ تنظیم کی حیثیت اختیار کر گئی۔ ممبئی حملوں پر شرمندگی اور خجالت محسوس کرنے کے ساتھ ہی واضح طور پر دفاعی پوزیشن پر آئے ہوئے پاکستانی حکام ان حملوں کی ذمہ داری قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں مگر تفتیش کے عمل میں معاونت کی حامی بھر لیتے ہیں۔ اگرچہ وہ آخر کار ان حملوں کی منصوبہ بندی کرنے والے اہم کرداروں اور ان کے بہت سے شریک کاروں پر الزامات عائد کر دیتے ہیں، مگر وہ تنظیم کے خلاف بحیثیت مجموعی کوئی اقدام نہیں کرتے اور اس کے

سرغنہ حافظ سعید کو تحفظ دینے پر آمادہ نظر آتے ہیں۔

3 مارچ 2009، لاہور

سری لنکا کی قومی کرکٹ ٹیم پاکستانی ٹیم کے ساتھ میچ کھیلنے کے لئے لاہور کے قذافی سٹیڈیم کی جانب رواں دواں ہے۔ کرکٹ پاکستان کا دل پسند قومی مشغلہ اور بین الاقوامی سطح پر کھیلا جانے والا واحد اہم کھیل ہے۔ پاکستانی عوام سری لنکا کی ٹیم کے پاکستانی دورے پر اس کے شکر گزار ہیں کیونکہ یہ دنیائے کرکٹ کی واحد با اثر ٹیم ہے جو ان حالات میں پاکستان کا دورہ کرنے پر تیار ہے۔ دہشت گردی کے حوالے سے سری لنکا کے خدشات دور کرنے کے لئے پاکستانی حکام نے ٹیم کو اس طرح کا تحفظ دینے کے حامی بھر لی تھی جو کہ صرف کسی ریاست کے سربراہ کے دورے کے دوران ہی فراہم کی جاتی ہے۔ تاہم جب سری لنکا کی ٹیم کو لے کر جانے والی بس سٹیڈیم کی طرف سفر کے اپنے آخری مرحلے کے قریب لبرٹی گول چکر سے گزر رہی ہوتی ہے تو یہ اچانک مشین گنوں سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں آ جاتی ہے۔ حیران و ششدر کھلاڑی اپنے ارد گرد اڑ کر آتی ہوئی گولیوں کے دھماکے سے پھٹ جانے والے ٹکڑوں کے مابین جلدی سے فرش پر لیٹ جاتے ہیں۔ ان کی بس کا ذکی الحسن ڈرائیور پھرتی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فائرنگ کرنے والوں کو جل دے کر گاڑی بھگا کر قریبی کرکٹ گراؤنڈ تک پہنچا دیتا ہے۔ اگرچہ ٹیم کے ساتھ کھلاڑیوں کو معمولی چوٹیں آتی ہیں تاہم بس کے تمام مسافر حیرت انگیز طور پر سلامت رہتے ہیں۔ مگر بس کے عین عقب میں چلتی ہوئی چھوٹی وین میں بیٹھے ہوئے امپائر حضرات اتنے خوش نصیب ثابت نہیں ہوتے۔ ان کا ڈرائیور ہلاک اور ایک ایمپائر شدید زخمی ہو جاتا ہے۔ موقع پر نصب شدہ سیکیورٹی کیمروں کی مدد سے بعد ازاں ظاہر ہوتا ہے کہ بارہ عدد حملہ آوروں میں سے کئی ایک حملہ آور کھلی جگہوں سے بڑے منظم طریقے سے فائرنگ کر رہے تھے جبکہ پولیس یا دوسرے سیکیورٹی اہل کار تماشائی بنے کھڑے تھے۔ کھلاڑیوں کے قافلے کے ساتھ چلنے والے پولیس کے حفاظتی دستے کے چھ اہلکار پہلے ہی ہلاک ہو چکے تھے۔ لگا تار تیس منٹ کی فائرنگ کے بعد جب ان کے پاس گولیوں کا ذخیرہ ختم ہو گیا تو بارہ کے بارہ دہشت گرد وہاں سے صحیح سلامت کھسک جانے میں کامیاب ہو گئے۔

شک کی پہلی پرچھائیں لشکر طیبہ پر پڑتی ہے کیونکہ یہ حملہ بھی تنظیم کے سابقہ حملوں بشمول 3 ماہ قبل کے ممبئی حملوں کے طریق کار سے مشابہت رکھتا ہے۔ مبصرین کے اندازوں کے مطابق اس حملے کا مقصد حکومت کو خبردار کرنا ہوسکتا تھا۔ تاکہ وہ اس کے خلاف کسی قسم کی کاروائی سے باز رہے۔ تاہم بعدازاں شکوک وشبہات کا رخ ایک نئی ابھرتی ہوئی مگر ہنوز گمنام تنظیم پنجابی طالبان کی طرف ہوجاتا ہے۔ مسلسل ظاہر ہوتے ہوئے حقائق ومعلومات کے ساتھ ساتھ یہ واضح ہونے لگتا ہے کہ یہ جہادی اور فرقہ وارانہ تنظیموں کا ایک ایسا ڈھیلا ڈھالا گروہ یا ان کا کوئی الگ ہو جانے والا دھڑا ہے جو بتدریج پاکستانی ریاست کی مخالفت پر کمربستہ ہورہا ہے۔ جیسا کہ نام سے ہی اندازہ ہوجاتا ہے پنجابی طالبان قبائلی علاقوں کے پاکستانی طالبان سے قریبی ربط رکھتے ہیں۔ تاہم موخرالذکر کے برعکس جو کہ شمال مغربی پاکستان کے مضافاتی علاقوں میں بسنے والی پشتون نسل سے تعلق رکھتے ہیں، پنجابی طالبان میں شامل جہادیوں کا زیادہ تر تعلق پنجاب کے وسطی علاقوں، خصوصاً جنوب کے سرائیکی علاقوں سے ہے جہاں پر سنیوں کی اکثریت غیر مقبول شیعہ جاگیرداروں کی محکوم چلی آرہی ہے۔ لشکر طیبہ کے برعکس جو کہ ابھی بھی ریاست کے ساتھ تعاون پر آمادہ نظر آتی ہے، پنجابی طالبان اس کی تباہی سے کم پر راضی نہیں ہیں۔ سات ماہ بعد انہیں راولپنڈی میں پاکستانی فوج کے ہیڈکوارٹرز (GHQ) پر اس سے بھی زیادہ دیدہ دلیرانہ حملے کا ذمہ دار ٹھہرایا جائے گا۔

یہ ہے وہ کہانی جس سے ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ایک ایسے ملک میں واقعات کیا رخ اختیار کر گئے ہیں جو کہ مغربی طرز کا کاروباری لباس زیب تن کرنے والے اور فیصلہ کن طور پر لادینی نظریات کے حامل وکیل محمد علی جناح نے جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے بڑی امیدوں اور توقعات کے ساتھ تصور کے سانچے میں ڈھالا تھا۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ ان تصورات کے برعکس یہ ملک کس طرح ایک ناقص وغیرہ ذمہ دار حکومت کی عظیم نشانی بننے کے ساتھ ہی روز بروز آلودہ ہوتے ہوئے خیالات کی حامل جادوگرنی کا ایسی انتہا پسند اسلامی تنظیموں پر مشتمل آمیزہ بن کر رہ گیا ہے جو کہ مغربی تہذیب کے خلاف اعلان جنگ کرنے کے ساتھ ہی خود پاکستان کی بنیادوں کے لئے ہی خطرہ بن کر رہ گئی ہیں۔ اور یہ کہانی ہے اپنی ہی دنیا میں گم ان جاگیردار سیاستدانوں کی جو مسائل کو حل کرنے کی بجائے ان سے نظریں چراتے آئے

ہیں، اور اس طاقتور فوج کی جو خود اپنے ہی عکس کے سحر میں گرفتار اور بھارت کے جنون میں مبتلا رہتی ہے جبکہ ان دونوں کی یہ سوچ تھی کہ وہ ان شدت پسند اسلامی تنظیموں کو استعمال کر کے بغیر کوئی بڑی قیمت ادا کیے اپنی خارجہ پالیسی کے اہداف کو آگے بڑھا سکتے ہیں مگر ان کی یہ حکمت عملی غلط ثابت ہوئی ہے۔ یہ ایک احتیاط طلب افسانہ ہے، اور اسے بیان کرنے کا میرا بنیادی مقصد یہ ہے کہ اس امر کو واضح کر سکوں کہ پاکستان ایک خود غرض قیادت، مشاہدے کی ناقص اہلیت، ضمیر فروشانہ قسم کے گھمنڈ اور کسی حد تک بدقسمتی کے عنصر کی بدولت کس طرح دنیا کا خطرناک ترین ملک بن کر رہ گیا ہے۔ اگرچہ میری توجہ کا مرکز صرف اور صرف پاکستان کی حکمران شخصیات ہیں مگر وہ اس ڈرامے کا واحد کردار نہیں ہیں انڈیا اور امریکہ نے بھی اپنی نوعیت کی غلطیوں اور غلط تخمینوں کی بدولت رواں مسائل اور آفات کی پرورش میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کہانی کا، جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے، کوئی ہیرو بھی نہیں ہے۔

ہمیں آج کا پاکستان جن بے شمار مسائل میں گھرا ہوا نظر آتا ہے ان کی بنیاد ریاست کے قیام کے ساتھ ہی رکھ دی گئی تھی۔ اور یہاں سے ہی اس کہانی کا آغاز ہوتا ہے۔ میں پاکستان کی ابتدائی تاریخ کا کھوج 1947 میں برطانوی راج کی طرف سے کی جانے والی تقسیم کے بعد اس کے وجود کے اولین 25 برسوں کے ذریعے لگاؤں گا۔ یہی وہ عرصہ ہے جس کے دوران شہری ثقافت کے حامل جاگیردار سیاست دانوں نے جواب فوج کے ساتھ مل کر اس ملک پر راج کر رہے ہیں، سیاسی عروج حاصل کر کے اقتدار کے ایوانوں تک رسائی حاصل کر لی تھی۔ جیسا کہ ہمارے مشاہدے میں آئے گا مسلم اکثریت کے علاقے جو بعد میں پاکستان کے اندر آ گئے، برطانوی راج کے مضافاتی علاقے اور انتظامی لحاظ سے نسبتاً نظر انداز کردہ شمار کئے جاتے تھے۔ برطانوی دور حکومت میں یہ علاقے ایسے جاگیردار رؤسا کے سیاسی اور اقتصادی تسلط کا شکار رہے تھے جو بڑے بڑے زمینی قطعات کے مالک اور عوامی حلقوں میں جاگیردار کہلائے جاتے تھے۔ مگر ملک کے وجود میں آنے کے بعد ان کا حکومتی معاملات میں عمل دخل بہت کم تھا۔ پاکستان کے اولین حکمران آل انڈیا مسلم لیگ کے وہ سیاست دان تھے جنہوں نے ایک الگ ملک کے لئے جدوجہد میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا مگر ان کا تعلق انڈیا کے اہم شہری علاقوں، مثلاً دھلی، بمبئی اور کلکتہ سے تھا۔ ایک نئے ملک میں جہاں اب ان کی حکومت تھی کوئی سیاسی حلقہ نہ ہونے کی بناء پر باہر سے آنے والی ان

شخصیات کو اپنی قیادت کے بذریعہ ووٹ چناؤ میں بہت کم دلچسپی تھی۔ چنانچہ اس صورتحال کی بناء پر پاکستان کو ابتداء سے ہی جمہوریت کے قحط کا سامنا کرنا پڑا۔

ہماری کہانی میں اس عنصر کو اتنی اہمیت حاصل نہ ہوتی اگر یہ کشمیر کے بارے میں نہ ہوتی۔ مسلم اکثریت کی حامل اس وادی پر اپنا تسلط قائم کرنے کے لئے پاکستان اور انڈیا کے درمیان ہونے والی جنگوں میں پہلے دن سے ہی خونی داستان رقم ہوتی چلی آ رہی ہے۔ پاکستانیوں کے دل میں اس تنازعے کی بناء پر ایک ایسی دشمنی کا احساس جاگزیں ہو چکا ہے جو ان کی ریاست کی ایک امتیازی خصوصیت بن چکی ہے اور ریاست کے عزائم کی تکمیل کے لئے انتہا پسند اسلامی قوتوں کی پرورش کے پس پردہ یہ غیر متنازعہ طور پر ایک بنیادی محرّک ہے۔ تنازعہ کشمیر نے پاکستان کے ابتدائی حکمرانوں کے اس عقیدے کی پختگی میں بھی اہم کردار ادا کیا کہ ایک بڑی اور طاقتور فوج وقت کی اہم ضرورت ہے۔ ایک ہی عشرے کے اندر اندر یہ اتنی طاقتور ہوگئی کہ اس نے مسلم لیگ کی بانی قیادت کو پرے دھکیل کر رکھ دیا۔ بنگلہ دیش کی جنگ آزادی میں خوفناک شکست سے قبل جس نے کہ اسے اقتدار ایک مرتبہ پھر سویلین قیادت کے ہاتھوں میں دینے پر مجبور کر دیا تھا، فوج پورا ایک عشرہ تک تاج وتخت کے مزے لوٹتی رہی۔ تاہم اس وقت تک اصل مسلم لیگیوں کا نام و نشان ہی مٹ چکا تھا، اور ان کی جگہ ان جاگیرداروں نے لے لی تھی جو تقسیم سے قبل طویل عرصہ سے اس خطے پر اپنا تسلط قائم رکھتے چلے آ رہے تھے، اور جو اپنے ساتھ اپنی طرز کی ایسی سیاست بھی لے آئے تھے جو ان کا ہی طرّہ امتیاز تھی۔ اور اس وقت سے فوج کے ساتھ اقتدار میں شرکت کے ساتھ ہی وہ اپنی باری پر حکومت بھی کرتے چلے آ رہے ہیں۔

میں اگلے صفحات میں ان دونوں گروہوں کا بنظر غائر جائزہ لوں گا۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کے اعمال کا نتیجہ نہ صرف ملک میں جہادی قوتوں کے فروغ کی صورت میں نکلا بلکہ ان کی طرف سے مسلط کئے گئے فیصلے آج بھی حالات وواقعات کو اس حد تک لے آنے میں اپنا کردار ادا کرتے چلے آ رہے ہیں۔ اس امر کو پوری طرح احاطہء شعور میں لانا محال ہے کہ آخر پاکستانی انتہا پسند اسلامی نظریات کے حوالے سے اس طرح کے روّیے کا مظاہرہ کیوں کرتے ہیں جو ان کا خاصہ ہے اور اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان دو گروہوں کے روّیے کے پس پردہ محرکات اور عادات کو سمجھے بغیر یہ اور بھی مشکل ہو جاتا ہے۔

سویلین سیاست دان اس طرح کی سیاسی روایات پر عمل پیرا ہیں جو براہ راست خطے کی جاگیر دارنہ ثقافت کی تہہ سے برآمد ہوئی ہیں۔ پاکستان کی سیاسی جماعتیں مربیّانہ سیاست کے باہمی روابط سے تشکیل کردہ ایسے اتحادوں پر مبنی ہیں جن کا مقصد حصول اقتدار کے ذریعے ریاستی وسائل تک رسائی حاصل کرنا ہے جن کو پھر سب مل بانٹ کر کھاتے ہیں۔ سویلین حکمران اپنے مربیانہ روابط کی دلجوئی اور تسکین جیسے مقصد کے حصول پر اپنی ساری توجہ اس طرح مرکوز کر کے رکھ دیتے ہیں کہ وہ ملک کو ایک وباء کی طرح اپنی لپیٹ میں لئے ہوئے باضابطہ مسائل کے حل کی تدبیر کرنے کو بہت مشکل یا ناممکن امر تصور کرتے ہیں۔ سنجیدہ قسم کے مسائل کا سامنا یا حل کرنے کی بجائے ایک سوچے سمجھے طریق کار کے تحت انہیں پس منظر میں دھکیل دیا جاتا ہے۔ اس کا نتیجہ نہ صرف ایک بدترین قسم کے نظم ونسق کی صورت میں نکلا بلکہ انتہا پسند نظریات کے فروغ کی بھی حوصلہ افزائی ہوئی۔

فوج میں بھی اس طرح کے رویے یا صورتحال کے استحکام کا رجحان پایا جاتا ہے، اگرچہ اس کی توجہ کا اہم محور انڈیا ہی رہا ہے جسے کہ وہ تمام دوسرے عوامل کے باوجود پاکستانی ریاست کے لئے سب سے بڑا خطرہ تصور کرتی ہے۔ فوج پاکستان میں ہر لحاظ سے ابھی تک سب سے زیادہ منظّم و پیشہ ورادارہ ہے۔ جاگیردارانہ سیاسی تنظیموں کے برعکس اس میں معیار کے مطابق انتخاب کے اصولوں پر سختی سے عمل کیا جاتا ہے اور فوج کے افسر خود کو معاشرے کے اعلیٰ طبقے میں شمار کرتے ہیں۔ جہادی تنظیموں کو انڈیا کے خلاف ایک کم لاگت ہتھیار کے طور پر پروان چڑھانے کا فیصلہ فوج کا ہی تھا جسے ان کے جاگیردار رشتے داروں کی حمایت حاصل تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھیں گے یہ ان کی بھول ہی تھی کہ وہ انہیں اپنے قابو میں رکھ کر اپنی مرضی سے استعمال کریں گے۔

مذہب کے کردار پر غور کئے بغیر پاکستان کو مکمل طور پر نہیں سمجھا جا سکتا۔ اس ریاست کی بنیاد کے پس پردہ طاقتور ترین شخصیت محمّد علی جناح کے تصور کے مطابق پاکستان جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کا وطن بننا تھا۔ اگرچہ ان کا تصور ایک لادینی ریاست تھی مگر یہاں اسلام کا کردار شروع سے ہی متنازعہ چلا آرہا ہے۔ صرف شہ سرخیوں کی بنیاد پر اندازہ لگایا جائے تو یہی لگے گا کہ پاکستان کینہ پرور قسم کے وحشی مسلمان بنیاد پرستوں کے ہاتھوں تباہی کی طرف گامزن ہے۔ تاہم اصل حقیقت کسی طرح بھی پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ پاکستانیوں کی اکثریت ایک ایسے متنوع قسم کے سنی

عقیدے کی پیروکار ہے جو پوری مسلمان دنیا میں سب سے زیادہ روادار اور بے ضرر قسم کا عقیدہ ہے۔ بلکہ دراصل یہ جنوبی ایشیا کے اکثر ممالک میں اسلام کی سب سے غالب شکل ہے اور اس خطے کی جاگیردارانہ ثقافت میں اس کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان میں سُنی اسلام کے دو سب سے بڑے اقلیتی فرقے بنیاد پرست نوعیت کے حامل ہیں۔ یہی دو فرقے ہیں جن سے پاکستان کی اہم جہادی اور فرقہ ورانہ تنظیموں کے سوتے پھوٹے ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں ایک قابل ذکر شیعہ اقلیت بھی پائی جاتی ہے جو کہ تاریخی طور پر ملک کی جاگیردارانہ ثقافت اور سیاست کے ساتھ بڑے مضبوط طریقے سے جڑی ہوئی ہے۔ جناح بھی، جنہیں پاکستانی بڑی عقیدت کے ساتھ قائداعظم کہتے ہیں۔ ایک شیعہ مسلمان تھے۔

مذہبی سیاسی جماعتیں بھی پاکستان میں موجود ہیں مگر انہوں نے انتخابات میں کبھی بھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ بہت سے پاکستانی عوام خطے کی مضمر جاگیردارانہ روایات کے مطابق بڑی بڑی جاگیردار جماعتوں کو ووٹ دیتے ہیں۔ تاہم مذہبی جماعتیں شروع سے ہی پاکستانی سماج کو اسلامی طرز زندگی کی طرف دھکیلنے کیلئے ایک متواتر دباؤ ڈالنے والی تنظیموں کا کردار ادا کرتی چلی آ رہی ہیں۔ آخر کار انہیں فوجی آمر ضیاء کی شکل میں ایک ہم خیال شخصیت مل گئی جس نے پاکستان کو شدت پسند اسلامی تنظیموں کے تصور کے مطابق نئے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کی جس کے نتیجے میں فرقہ ورانہ آتش فشاں کا لاوا بھڑک اٹھا اور بعد میں بڑے پیمانے پر کی جانے والی دہشت گرد کارروائیوں کی بنیاد بھی ڈال دی گئی۔ شدّت پسند اسلام کی حقیقی سرگرمیوں یا ہلچل کا آغاز بھی ضیاء کے دور میں ہوا۔ اس کا مرکز افغانستان تھا جب پاکستانیوں نے امریکہ کی اکساہٹ اور مالی امداد کے ذریعے خود کو سرد جنگ کی بھٹی میں جھونکتے ہوئے افغانستان کی جلاوطن مذہبی تنظیموں کو استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا تاکہ تکلیف دہ حالات سے گزرنے والے اپنے ہمسایہ ملک پر سوویت حملے کے خلاف ان کی مدد کر سکیں۔ ایک عشرے پر محیط یہ جدوجہد جس کا آغاز 1979 میں ہوا تھا پوری دنیا میں اسلامی بنیاد پرستوں کی توجہ کا مرکز بن گئی، جن میں سے ہی ایک اسامہ بن لادن بھی تھا اور اس کے نتیجے میں روسیوں کو افغانستان سے نکالنے میں کامیابی تو حاصل ہو گئی مگر ساتھ ہی پاکستان کے لئے بہت سے سنگین نتائج بھی چھوڑ گئی۔ روس مخالف جہاد کی فتح کے نشے میں سرشار پاکستان کی اولین جہادی اور فرقہ ورانہ تنظیمیں

اسی وقت کی پیداوار تھیں جن کی پرورش میں تیزی سے پھیلتی ہوئی انتہا پسند مسجدوں اور مدرسوں نے اہم کردار ادا کیا۔ چند ایک نے اپنے جہادیوں کو روسیوں کے خلاف جہاد کے لئے بھیج دیا، جبکہ باقی تنظیموں سے جنگ کرنے کا فیصلہ کرلیا جو خود بھی ایرانی انقلاب کے اثرات کی لپیٹ میں آکر انتہا پسندی کی راہ پر چل پڑے تھے۔

یہ سب کچھ یہیں پر ختم ہو جاتا کیونکہ روسی افغانستان چھوڑ کر جا رہے تھے، اگر پاکستان ان کو نکیل ڈالنے کا فیصلہ کر لیتا۔ مگر قسمت کی دخل اندازی کا یہ بہترین موقع تھا۔ عین اس وقت جب آخری روسی فوجی فرینڈشپ برج کے اس پار قدم رکھ رہا تھا تو کشمیری مسلمان بھارتی تسلط کے خلاف ایک مقبول بغاوت کے لئے تیار ہو رہے تھے۔ افغانستان میں روس کے خلاف ملنے والی اپنی کامیابی پر پھولے نہ سماتے ہوئے پاکستان نے بالکل یہی ہتھکنڈے کشمیر میں بھی استعمال کرنے کا نتیجہ خیز قسم کا فیصلہ کرلیا۔ بغاوت کی تحریک کی حمایت میں بہت سے جہادیوں کو کشمیر کے اندر خفیہ راستوں سے داخل کرنے کے عمل کا آغاز کر دیا گیا۔ ان میں بہت سے ایسے مقامی کشمیری بھی شامل تھے جو لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف ٹریننگ اور امداد کی تلاش میں بھاگ کر پاکستان آگئے تھے۔ تاہم پاکستان نے روس مخالف جنگ لڑنے والے اپنے تجربہ کار جہادیوں کی بھی حوصلہ افزائی کی کہ وہ اپنی کوششوں کا رخ تصادم کے نئے مرکز کی طرف موڑ دیں۔ شاید یہ کوئی حیرت کی بات نہیں ہے کہ اس حوالے سے تشکیل کردہ اپنی نوعیت کی اولین جہادی تنظیم حرکت المجاہدین ہی وہ پہلی تنظیم تھی جسے کشمیر کی جنگ میں جھونکا گیا۔ صرف اسی پر قناعت نہ کرتے ہوئے پاکستان نے تیز ہوتی ہوئی جہادی سرگرمیوں میں شمولیت کے لئے نئی تنظیموں کی تخلیق کی حوصلہ افزائی جاری رکھی ممبئی کے قاتلانہ حملوں کا ارتکاب کرنے والے گروہ لشکر طیبہ کی تشکیل ایسے ہی وقت پر عمل میں آئی، جس کے کئی برس بعد جیشِ محمد کا قیام عمل میں آیا جو کہ حرکت المجاہدین کی جگہ لینے کے لئے تشکیل دی گئی تھی۔ بغاوت کی تحریک کے پہلے عشرے کے دوران جہادی گروہوں کے کشمیر کے اندر بتدریج سرایت ہوتے جانے کے نتیجے میں بھارت کو بھی وادی کے اندر زیادہ سے زیادہ فوج داخل کرنے پر مجبور ہونا پڑا۔ بعض تخمینوں کے مطابق یہ تعداد بڑھ کر آخرکار پانچ لاکھ تک پہنچ گئی، یعنی امریکہ کی طرف سے ویت نام کے لئے مخصوص کی گئی فوج کی تعداد کے برابر۔

پاکستان نے یہی عمل پانچ برس بعد 1994 میں اس وقت دہرایا جب روسی افواج کی

واپسی کے بعد افغانستان میں خانہ جنگی شروع ہوگئی۔ پاکستان نے اس وقت کے اپنے پسندیدہ افغان دھڑے سے ناراضگی کے بعد انتہائی متحرک افغانی مذہبی، جنونیوں کی ایک ایسی نئی تنظیم کی حمایت کا فیصلہ کیا جن کی اکثریت نے روسی قبضے کے دور میں پاکستانی مدرسوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ مذہبی تعلیم حاصل کرنے والے ان مدرسوں کے یہ سابقہ طالب علم خود کو طالبان کہلانے لگے تھے۔ قبائلی علاقوں اور ان کے ساتھ ملحق خیبر پختونخواہ کے صوبے سے بھی بہت سے پاکستانی ان کی صفوں میں شامل ہو گئے۔ جنوبی افغانستان پر غلبہ رکھنے والے چھوٹے چھوٹے جنگجوؤں کے خلاف پھیلی ہوئی نفرت کے ماحول اور پاکستان کی خاطر خواہ حمایت اور تعاون کے نتیجے میں وہ حیران کن رفتار سے پیشرفت کرنے لگے۔ دو برس کے اندر اندر انہوں نے افغانستان کے دارالحکومت کابل کا انتظام سنبھال لیا۔ اور چار برس کی مدت میں وہ افغانستان کے اسی فیصد علاقوں پر قابض ہو چکے تھے۔

آخری روسی فوجی کی افغانستان سے روانگی کے ایک عشرے بعد اپنی محنت کے ثمرات کا جائزہ لیتے ہوئے پاکستان بجاطور پر خوش نظر آ رہا تھا۔ وہ کشمیر میں بھارتی فوج کو بڑی کامیابی سے محصور کر کے رکھ دینے کے بعد پر امید تھے کہ یہاں بھی ان کے ایماء پر لڑنے والے جہادی اسی طرح غالب آ جائیں گے جس طرح وہ افغانستان میں روس کو شکست سے دوچار کر چکے تھے۔ اسی طرح افغانستان میں ہونے والی پیشرفت بھی ان کے حساب سے تسلی بخش تھی کیونکہ وہاں ان کے طالبان گماشتے بڑی بے رحمی سے پیشرفت کرتے نظر آ رہے تھے۔ تاہم فتح کا یہ لمحہ اتنا ہی عارضی ثابت ہوا جتنا کہ یہ پرفریب تھا، کیونکہ خارجہ پالیسی کے مقاصد کی تکمیل کے لئے، انتہا پسند مذہبی تنظیموں کے استعمال کی پاکستانی حکمت عملی پہلے ہی واشگاف ہوتی نظر آ رہی تھی۔ کشمیر میں لشکر طیبہ اور جیشِ محمد نے سویلین اہداف پر روح فرسا دہشت گرد حملے کرنے کے اپنے شوق کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا تھا۔ ان کا اختتام دسمبر 2001 میں نیو دہلی میں پالیمنٹ پر کئے جانے والے حملوں اور مئی 2002 میں کشمیر میں خدمات انجام دینے والے فوجیوں کے اہل خانہ کے قتل و غارت جیسے واقعات کی صورت میں ہوا اور جن کے نتیجے میں پاکستان اور انڈیا جنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔ اس دوران افغانستان میں طالبان نے اسامہ بن لادن کو پناہ دینے کا فیصلہ کر لیا جس کی تنظیم القاعدہ کے کارکنوں نے اگست 1998 میں مشرقی افریقہ کے اندر امریکہ کے دو سفارت خانے بم کے

ساتھ اڑا دینے کے ساتھ ہی دو برس بعد امریکہ کے دوسرے جہازوں کو تحفظ دینے والے تباہ کار (destroyer) جہاز کول کو بھی تقریباً ڈبونے لگے تھے۔ پاکستان کی طرف سے یہ التجائیں کہ ملا عمر اسامہ بن لادن کو پاکستان کے حوالے کر دے بے کار ثابت ہوئیں۔

میں مشرقی افریقہ میں ہونے والے بم دھماکوں سے ایک روز قبل ہی پاکستان پہنچا تھا اور تین برس بعد نائن الیون کے واقعے سے دو ماہ قبل وہاں سے روانہ ہو گیا۔ ایک پیشہ ور فارن سروس آفیسر ہونے کے ناطے میری تقرری اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں سیاسی مشیر کی حیثیت سے کی گئی تھی کہ میں واشنگٹن کو پاکستان کے اندر ہونے والی سیاسی تبدیلیوں سے آگاہ کرتا رہوں۔ چونکہ اس وقت کابل میں امریکہ کا کوئی سفارت خانہ نہیں تھا، اس لئے افغانستان کے حالات و واقعات کا احاطہ کرنا بھی ہماری ذمہ داریوں میں شامل تھا۔ یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک انتہائی نازک دور تھا۔ پرویز مشرف نے فوج کے ذریعے ایک جمہوری حکومت کا تختہ الٹ کر اقتدار پر قبضہ کر لیا تھا جبکہ کشمیر میں لائن آف کنٹرول پر کارگل میں بھارتی سرحدی چوکیوں پر پاکستانی فوج کے قبضے کی بنا پر منڈلا رہے تھے۔ یہ بہت اہم نوعیت کے ایسے واقعات تھے جن کی خبریں صفحہ اول کی زینت بن رہی تھیں، تاہم اپنی تعیناتی کے تین برسوں کے دوران مجھے جو بہت گہری اور متواتر پریشانی لاحق ہوتی رہی وہ بنیاد پرست مذہبی طاقتوں کا عروج کی طرف گامزن ہونا تھا۔ مسئلہ صرف یہ نہیں تھا کہ پاکستان ان شدت پسندوں کو اپنی خارجہ پالیسی کے اہداف کے حصول کے لئے افغانستان اور کشمیر میں بطور ہتھیار استعمال کر رہا تھا۔ اصل میں ان شدت پسندوں کو خود پاکستان کے اندر بھی بہت پذیرائی مل رہی تھی۔ چونکہ من پسند جہادی انہی مسجدوں اور مدرسوں سے بھرتی کئے جا رہے تھے جو تشدد پسند فرقہ ورانہ تنظیموں کو بھی افرادی قوت فراہم کرنے کے ذمہ دار تھے، اس لئے پاکستان ان سب کو لاوارث چھوڑ دینے کی پالیسی پر گامزن نظر آ رہا تھا۔ ملک کے ان علاقوں میں جہاں ان کا اثر و نفوذ پہلے سے ہی مقامی آبادیوں تک پھیلنا شروع ہو چکا تھا، لفظ طالبنائزیشن روزمرہ زبان کا حصہ بن گیا۔ مجھے یہ احساس ہونے لگا تھا کہ پاکستانی آگ سے کھیل رہے ہیں۔ اور یہ آگ نائن الیون والے دن بھڑک کر ان کے چہروں کو جھلسانے والی تھی۔

نائن الیون کے واقعے نے جس طرح پاکستان کی قسمت کا رخ تبدیل کیا میں یہاں اس کے تباہ کن اثرات کا جائزہ لیتا ہوں۔ اپنے طالبان حلیفوں اور حد سے زیادہ ناراض امریکہ میں

سے کسی ایک کے انتخاب پر مجبور ہو کر پاکستان نے موخر الذکر کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرنے کے بعد امریکی قیادت میں اتحادی افواج کو طالبان اور پاکستان میں ان کے مہمان اسامہ بن لادن کو نکال باہر پھینکنے کی کاروائی کے دوران خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا۔ جیسا کہ ہم آگے چل کر دیکھیں گے بعدازاں پاکستان کی طرف سے القاعدہ کے اہم عہدیداروں کی کھوج لگانے میں مدد کے ذریعے امریکہ کی حمایت حاصل کرنے کی کوششوں کا نتیجہ واشنگٹن کی طرف سے شاباش مگر آگے جا کر اسامہ بن لادن اور اس کے پیروکاروں کی دشمنی کی صورت میں برآمد ہوا۔ معاملات اس وقت اور بھی خراب ہو گئے جب بہت سے پاکستانی جہادیوں نے پاکستان کی طرف سے امریکہ کی حمایت کے مظاہرے پر ناراض ہو کر اپنا وزن القاعدہ کے پلڑے میں ڈالتے ہوئے ریاست مخالف کاروائیاں شروع کر دیں۔ اور اس سے بھی زیادہ خرابی اس وقت پیدا ہوئی جب امریکہ کے دباؤ میں آ کر عالم تذبذب میں پاکستان نے القاعدہ کے جنگجوؤں کو کھوج لگانے اور خاتمہ کرنے کے لئے اپنی فوج کو دور دراز قبائلی علاقوں میں بھیج دیا۔ اس کاروائی کا نتیجہ، جو کہ 2004 کے آغاز میں شروع ہوئی تھی القاعدہ کو پناہ دینے والی مقامی تنظیموں کے ساتھ مسلح تصادم کی صورت میں نکلا۔ ان تنظیموں نے جلد ہی متحد ہو کر ایک ایسے اکٹھ کی شکل اختیار کر لی جسے پاکستانی طالبان کا نام دیا گیا اور انہوں نے ریاست کے خلاف خود اپنے طور پر جنگ شروع کر دی۔ تاہم پاکستان نے افغان طالبان کو خود اپنی ہی سرزمین پر ڈیرے ڈالے رہنے دیا تاکہ مستقبل میں کسی قسم کی سودے بازی میں آسانی رہے۔ خدشہ یہ تھا کہ افغانستان پر ان کے جانی دشمن بھارت کا غلبہ ہو جائے گا۔

تشدد پسند پاکستانی طالبان کے حملوں سے گھبرا کر پاکستانیوں نے باغی طاقتوں کے ساتھ جنگ بندی کے معاہدوں کا ایک سلسلہ شروع کرتے ہوئے حالات کا رخ اپنے حق میں کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ تاہم یہ حکمت عملی دیرپا ثابت نہ ہوئی جس کی ایک وجہ 2007 کی گرمیوں میں لال مسجد پر حکومت کی طرف سے کی جانے والی وہ چڑھائی تھی جس میں ایک سو سے زائد جانیں ضائع ہو گئیں اور جو پاکستان کے لئے اثرات کے حساب سے نائن الیون کی طرح ہی تھا۔ لال مسجد کا شمار اسلام آباد کے مرکز میں واقع ایک ایسی مسجد اور مدرسے میں ہوتا تھا جہاں انتہا پسند نظریات کی تعلیم دی جاتی تھی اور جس کے مکین اغواء اور خود حفاظتی حملوں کی پھیلتی ہوئی وارداتوں کے ذمہ دار تھے۔ کئی ماہ تک کشمکش میں رہنے کے بعد لال مسجد کی عمارت پر حملے

کے پاکستانی فیصلے نے شدت پسند مذہبی طبقات کو مشتعل کر کے رکھ دیا۔ پاکستانی طالبان نے پاکستانی دفاعی اداروں پر دوبارہ حملے شروع کر دیئے اور انہیں مجبور کر دیا کہ وہ مذہبی انتہاء پسندوں کے ٹھکانے خالی کروانے کی کوششیں ختم کر دیں۔ فوج کی ناکامی کے ایک وجہ تو یہ تھی کہ وہ اپنی جدو جہد کے عمل کو مضبوط بنانے کے لئے مناسب افرادی قوت وقف کرنے کے لئے تیار نہ تھی اور دوسرے اسے اپنے ہی ہم وطنوں کے ساتھ لڑائی کی صورت میں اندرون ملک سے مخالفت کا خطرہ بھی تھا۔ اور پھر وہ بھارتی سرحدوں سے اپنی فوجیں ہٹانے پر بھی رضامند نہیں تھی، پاکستانی طالبان آخر کار پاکستان کے بہترین سیاحتی مقام سوات کی حسین وادی سمیت، جو کہ صوبہ خیبر میں اسلام آباد سے صرف سو میل کے فاصلے پر واقع ہے تقریباً تمام کے تمام قبائلی علاقوں کو اپنے زیر تسلط لانے میں کامیاب ہو گئے۔ اس سے بھی بدتر صورتحال اس وقت پیدا ہو گئی جب پاکستانی طالبان اور ان کی مربی و سرپرست القاعدہ کے ارکان نے پاکستان کے شہری علاقوں کے اندر تباہی پھیلا دینے والی ایسی دہشت گرد کاروائیاں شروع کر دیں جن کی لپیٹ میں، پاکستان کی سابقہ اور مستقبل کی امکانی وزیر اعظم بے نظیر بھٹو بھی آ گئیں۔

میں نومبر2008 میں ممبئی کے ان بدنام زمانہ حملوں سے آغاز کر کے جو لشکر طیبہ کی جانب سے کئے گئے تھے جو کہ پاکستان کی وہ واحد جہادی تنظیم ہے جو ابھی تک ریاست کی مخالف نہیں ہوئی، اپنی کہانی کو زمانہ حال تک لے آتا ہوں، ممبئی حملوں کے بعد پاکستان اور انڈیا کے درمیان امن کی ان کوششوں کو شدید دھچکہ لگا جن کا آغاز پانچ برس قبل ہوا تھا۔ انڈیا نے الزام لگایا کہ ان حملوں کے پس پردہ پاکستان کا ہاتھ تھا جس کو اس لئے بھی تقویت ملتی نظر آ رہی تھی کہ پاکستان نے بعدازاں لشکر طیبہ کے ٹھکانوں کو زیر عتاب لانے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم پاکستان کے پاس اس امر کا یہ آسان جواز موجود تھا کہ اگر پاکستان کی صف اول کی دہشت گرد اس جہادی تنظیم کے خلاف کاروائی کی گئی تو وہ ریاست مخالف سرگرمیاں شروع کر دے گی۔ تاہم اس امر کا فیصلہ کہ اصل حقیقت کیا ہے پاکستان کی طرف سے دہشت گرد تنظیموں کی پشت پناہی کی دوسری مثالوں کی طرح ایسے ناقابل تردید ثبوتوں کا متقاضی ہے جو کہ دستیاب نہیں ہو سکتے۔ اس لئے ضروری ہے کہ فیصلہ سازوں کے طرز عمل کے پس پردہ عوامل کا سراغ لگانے کے لئے اصل محرکات کا شعور حاصل کیا جائے۔ ممبئی حملوں کی اصل حقیقت سے قطع نظر، اس امر کا سراغ لگانا بہت مشکل

ہے کہ اس سے پاکستان کو کیا مفادات حاصل ہوئے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ ممبئی حملوں کے فوری عواقب کی صورت میں پاکستان کی مشکلات اس وقت اپنے عروج پر پہنچ گئیں جب وادیءِ سوات میں موجود پاکستانی طالبان ایک اور امن معاہدہ سبوتاژ کرتے ہوئے اسلام آباد سے صرف 60 میل کی دوری پر واقع ضلع بونیر میں داخل ہو گئے۔ یہ ایک ایسا فیصلہ کن قسم کا اقدام تھا جس نے پاکستانیوں کو بھرپور قسم کے جوابی اقدامات کے حق میں وزن ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ ملک کے اندر رائے عامہ کی اس تبدیلی کے پیش نظر فوج کی ایک بڑی تعداد کو جو کہ معمول کی فوج کا تیسرا حصہ بنتی تھی مطلوبہ علاقوں یعنی پہلے سوات اور پھر قبائلی علاقوں میں بھیج دیا گیا۔ یوں اگرچہ پاکستانی طالبان کی اہم تنظیموں کو ان کے بنیادی ٹھکانوں سے نکالنے میں تو کامیابی حاصل ہو گئی مگر انہیں مکمل طور پر شکست نہ دی جا سکی۔ چنانچہ پاکستان کے شہری علاقوں میں دہشت گرد کارروائیوں کا سلسلہ پنجابی طالبان کی صورت میں نمودار ہونے والی ان نئی تنظیموں کے ذریعے جاری رہا جو سوات اور قبائلی علاقوں میں اپنی ہم نام تنظیموں سے قریبی ربط رکھتی تھیں۔ اسی طرح پاکستان امریکہ کو بھی مطمئن نہ کر سکا جو ہمسایہ افغانستان میں طالبان کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ سے کچھ زیادہ ہی تنگ آتا جا رہا تھا۔ اگرچہ پاکستان نے قبائلی علاقوں میں افغان طالبان کے اہداف کو نشانہ بنانے کے لئے امریکی میزائل حملوں کی مخالفت سے تو خود کو بادل ناخواستہ دور رکھا مگر فوج ان کے خلاف بذات خود کوئی کارروائی کرنے کے موقف پر اس امید کے ساتھ مضبوطی سے قائم رہی کہ ایک وقت آئے گا جب امریکی فوجوں کے اس خطے سے روانہ ہو جانے کے بعد وہ انہیں استعمال کرتے ہوئے انڈیا کو افغانستان میں قدم جمانے سے باز رکھنے میں کامیاب ہو جائے گی۔

افغانستان کی اس صورتحال سے جہاں پاکستان، امریکہ اور بھارت کے مختلف مفادات آپس میں ٹکراتے نظر آئے، یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ یہ محض پاکستان اور پاکستان کی طرف سے مختلف دستیاب ترجیحات میں سے کسی ایک کے انتخاب کی کہانی نہیں ہے۔ یہ انڈیا کی کہانی بھی ہے جس کے بانی رہنما تقسیم کے وقت کشمیر کو پاکستان سے چھیننے کی للچاہت سے اس حقیقت کے باوجود خود کو باز نہ رکھ سکے کہ یہ مسلم اکثریت کا وہ علاقہ ہے جس کے پنجاب سے گہرے تاریخی روابط ہیں۔ چنانچہ اس خطہءِ زمین پر قبضے کے بعد اسے اپنے مسلمان ہمسائے کی دائمی دشمنی مول لینی پڑی جس کے نتائج ایک مستقل تصادم، بے شمار جنگوں اور وقتاً فوقتاً ہونے والی مسلح جھڑپوں، کشمیر میں طویل عرصے سے جاری بغاوت، ممبئی کی طرح کے دہشت گردی کے

خوفناک واقعات اور ایک ایسی ایٹمی جنگ کے خطرے کی صورت میں ہمارے سامنے ہیں جو کسی دن دونوں ملکوں کے بڑے شہروں کو ملیامیٹ کر کے رکھ سکتی ہے۔ بھارت کے ساتھ پاکستان کی دشمنی اسلامی بنیاد پرستوں کو ریاستی مفادات کے لئے استعمال کرنے کے پس پردہ ایک بنیادی محرک کی حیثیت رکھتی ہے۔حتیٰ کہ آج بھی افغانستان کے حوالے سے پاکستانی پالیسی، خاص طور پر افغانستان میں امریکی فوجیوں پر حملے کے لئے افغان طالبان کو اپنی سرزمین کے استعمال کی اجازت دینے پر رضامندی کے پس پردہ بھی وہاں پر بھارت کی واضح طور پر موجودگی کے حوالے سے پائے جانے والے خدشات ہیں۔ تاہم اس کے باوجود انڈیا اس ساری صورتحال کی ذمہ داری قبول کرنے سے گریزاں ہے اور الٹا خود کو بلا شرکت غیرے مظلوم بنا کر پیش کرتا ہے۔ وہ اپنے دشمن ملک کے ساتھ تنازعات کے حل کے حوالے سے کی جانے والی تمام بیرونی کوششوں کو بھی اشتعال آمیز انداز میں مسترد کر دیتا ہے باوجود اس حقیقت کے کہ افغانستان اور کشمیر میں اس کی پالیسیوں کی بدولت امریکہ کے اہم مفادات پر براہ راست زد پڑتی ہے۔

یہ امریکہ کی کہانی بھی ہے جس کے پاکستان کے ساتھ تعلقات برسہا برس سے دورنگی کی عکاسی کرتے چلے آرہے ہیں۔ امریکہ بیک وقت پاکستان کا دوست بھی ہے اور ہیکڑی باز دشمن بھی، جس طرح کہ خارجہ پالیسی مفاد کا تقاضا ہو، چنانچہ پاکستانی اس صورتحال پر الجھن کے ساتھ ہی مایوسی بھی محسوس کرتے ہیں کیونکہ وہ نسبتاً پائیدار دوستی اور دشمنی میں یقین رکھتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح یاد ہے کہ کس طرح پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی وجہ سے امریکہ نے افغانستان میں ان کے ساتھ مل کر آخری روسی فوجی کو بھی وہاں سے نکال باہر کرنے کے صرف اٹھارہ ماہ بعد ہی ان کے ملک پر پابندیاں عائد کر دی تھیں جیسے جیسے پاکستان کا اپنے خارجہ پالیسی اہداف کے حصول کے لئے جہادیوں پر انحصار بڑھتا چلا گیا، امریکہ کی توجہ وہاں سے ہٹتی چلی گئی۔ امریکہ کو جب مشرقی افریقہ میں اپنے سفارت خانوں پر ہونے والے بم حملوں کے وقت اس غفلت کا احساس ہوا تو اس کے سامنے بہت کم راستے رہ گئے تھے۔حتیٰ کہ آج بھی افغان طالبان کے خلاف کاروائیوں میں اضافے کے حوالے سے امریکہ پاکستان پر زیادہ دباؤ اس لئے نہیں ڈال سکتا کیونکہ افغانستان میں اپنی فوجوں کو رسد پہنچانے کے لئے وہ پاکستان کے زمینی راستوں کا محتاج ہے امریکہ کے پاس راستے اس لئے بھی کم ہیں کیونکہ واشنگٹن انڈیا پر دباؤ ڈالنے کے لئے بھی کافی عرصے سے ہچکچاہٹ

کا اظہار کرتا چلا آ رہا ہے۔ افغانستان میں امریکہ کے فوجیوں کی ہلاکت کی کچھ حد تک ذمہ داری وہاں بھارت کی خاطر خواہ تعداد میں موجودگی پر بھی عائد ہوتی ہے، باوجود اس حقیقت کے کہ بھارت کا وہاں ماسوائے اس کے اور کوئی مفاد نہیں ہے کہ وہ پاکستان کو اس کی مغربی سرحدوں سے دھمکاتا رہے۔ اسامہ بن لادن کی اس وقت ہلاکت جبکہ میں اس کتاب کو حتمی شکل دے رہا تھا، امریکہ اور اس کے واضح پاکستانی حلیف کے درمیان تعلقات کی بڑھتی ہوئی تلخ نوعیت کی المناک صداقت کو عیاں کرتی نظر آتی ہے۔ اس سلسلے میں امریکہ کی سپیشل فورسز کی طرف سے پاکستانی حدود کے اندر پاکستانی حکام کے علم یا رضامندی کے بغیر کی جانے والی کاروائی کے باعث پاکستان کو اچھی خاصی ندامت یا شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک نسبتاً چھوٹا شہر ایبٹ آباد، جہاں اسامہ بن لادن اپنے انجام سے دوچار ہوا تھا، اسلام آباد کے شمال میں محض تیس میل کے فاصلے پر ہونے کے علاوہ پاکستان ملٹری اکیڈمی کا گڑھ بھی ہے جو کہ ویسٹ پوائنٹ کے مقابلے کا ادارہ ہے۔

یہ حقیقت کہ اسامہ بن لادن پاکستان کے سیاسی دارالحکومت سے تھوڑی سی مسافت پر واقع ایک ایسے شہر میں اپنے انجام کو پہنچا جو پاکستانی فوج کے ساتھ وابستگی کے حوالے سے شہرت رکھتا ہے، کسی حد تک موزونیت کی حامل ہے۔ کیونکہ یہ آخرکار پاکستان اور اس کی طرف سے کیے گئے ایسے فیصلوں کی کہانی ہے جنہوں نے دنیا کو سوائے مایوسی اور اضطراب کے اور کچھ نہیں دیا اور اس کے ساتھ ہی ملک کو تباہی کے خطرات کے دہانے لا کھڑا کر دیا ہے۔ آج کا پاکستان انتہا پسند مذہبی تنظیموں کا گڑھ بن چکا ہے، جن میں سے کچھ کے خلاف کاروائی کی جا رہی ہے جبکہ دیگر کے خلاف کوئی قدم اٹھانے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کیا جا رہا ہے یا تو منفی نتائج کے خوف کے مدنظر یا پھر اس امید کے باعث کہ شاید انہیں کبھی انڈیا کے خلاف لڑی جانے والی یکا و تنہا جنگ میں استعمال کرنا پڑ جائے۔ اس کہانی کا اختتام کس طرح سے ہوگا؟ یہ وہ سوال ہے جو میں نے آخری سے پہلے باب میں خود اپنے لئے رکھ چھوڑا ہے۔ کیا پاکستان ان انتہا پسند اسلامی طاقتوں کی مزاحمت کرنے میں کامیاب ہو جائے گا جو اسے دباؤ میں رکھے ہوئے ہیں یا پھر ان کے آگے ہتھیار ڈال دے گا؟ میں اس سوال کے جواب کی کوشش میں افغانستان میں پیش آنے والے واقعات، بن لادن کی موت کے بعد بھی خطے میں القاعدہ کی مسلسل موجودگی، اور امریکہ کے ساتھ تعلقات جیسے ان عوامل کا جائزہ لوں گا جن کے پاکستان کے حالات پر گہرے اثرات رونما ہو سکتے ہیں۔ میں اس نکتے پر بھی غور کروں گا کہ آیا پاکستانی طالبان کا مکمل طور پر خاتمہ ممکن ہے اور اگر نہیں تو کیا پاکستان کے

صوبے پنجاب کے اندر موجود جہادی طاقتوں کے ساتھ بڑھتا ہوا تعاون پاکستانی ریاست کے وجود کو لاحق خطرات کی علامت ہے۔ میں ممبئی کے طرح ایک اور حملے کے امکانات کا جائزہ بھی لوں گا اور یہ کہ آیا لشکر طیبہ کسی دن ریاست کی مخالفت کی جانب بھی آسکتی ہے۔ چونکہ اس امر پر اصرار کرنا اور بات ہے کہ پاکستان جہادی قوتوں کے آگے ہتھیار ڈال دے گا اور مدلل طریقے سے یہ بتانا کہ ایسا کس طرح ہوگا اور بات ہے، اس لئے میں ایک انتہائی معقول قسم کی امکانی صورتحال کا خاکہ کھینچنے کی کوشش کرتا ہوں۔

میں پاکستان کی اس داستان یا کہانی کا آغاز جہاد کے دور سے کرتا ہوں اور اس کا اختتام ان امکانات کے جائزے سے کروں گا جو ان قوتوں کے برسر اقتدار آنے کی صورت میں حقیقت میں پیش آسکتے ہیں۔ میرا مقصد اس امر کی اچھی طرح سے وضاحت کرنا ہے کہ یہاں کیا کچھ داؤ پر لگا ہوا ہے یا کسی طرح کے خطرات درپیش ہیں۔ پاکستان ایک ایٹمی اسلحہ رکھنے والی طاقت ہے۔ اگر جہادی اسلام آباد میں اقتدار پر قبضہ میں اسلحے کا ایک ایسا ذخیرہ آجائے گا جو اس وقت تقریباً ایک سو ایٹمی میزائیلوں (warheads) پر مشتمل ہے۔ حالیہ دنوں میں اس حوالے سے بھی اچھی خاصی بحث کی جاتی رہی ہے کہ آیا اگر ایران بھی ایٹمی ہتھیار بنالے تو کیا اسے خطرناک انجام سے باز رکھا جاسکتا ہے۔ تاہم پاکستان میں جہادیوں کے حکومت کے بارے میں کیا خیال ہے؟ بنیاد پرستوں کی اکثریت کے اس عقیدے کے پیش نظر کہ جہاد کے دوران شہادت انہیں سیدھی جنت میں لے جانے کی ضامن ہے، کیا اس یقین کی کوئی معقول وجہ نظر آتی ہے کہ انہیں خطرناک انجام سے خبردار کر کے ایٹمی ہتھیار چلانے سے روکا جاسکے گا؟ کیا امریکہ یا پھر بھارت یہ معلوم کرنے کا خطرہ مول لینے کے استطاعت کا مظاہرہ کر سکیں گے یا پھر وہ اس حوالے سے پیش قدمی کرنے کی ضرورت محسوس کریں گے؟ اور اگر انہوں نے پہلے ہی حملہ کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اس کے خود پاکستان پر کیا اثرات رونما ہوں گے؟ کیا وہ اس طرح کے حملے کے بعد قائم رہ سکے گا یا پھر کیا یہ پاکستانی ریاست کے تضاد کے منطقی انجام کے عمل کو تیز کر دے گا؟ یہ ہیں وہ چند سوالات جن کی کھوج میں پاکستان میں مستقبل کے تاریک ترین امکانات میں سے ایک کو زیر غور لا کر لگاؤں گا۔ ہمیں امید کرنی چاہئے ایسا کبھی نہیں ہوگا۔

1

ایک غیر یقینی ریاست

پاکستان ایک ایسا ملک ہے جہاں صورتحال ہمیشہ غیر یقینی رہتی ہے۔ ملک پر اس وقت جن لوگوں کا سیاسی اور فوجی تسلط قائم ہے ان کے آباؤ اجداد نے پاکستان کے قیام کی جدو جہد میں محض تماشائی کا کردار ادا کیا ہے۔ اس کی تخلیق کی اصل ذمہ دار شخصیات کا تعلق اس سرزمین سے نہیں تھا جس پر اب پاکستان قائم ہے۔ مسلم لیگی رہنما اور قوم کے قائد محمد علی جناح بمبئی سے تعلق رکھنے والے ایک وکیل تھے جو برصغیر کے مسلمانوں کے لئے اس لئے ایک علیحدہ ملک بنانا چاہتے تھے کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان ایک ایسے متحدہ ہندوستان میں دوسرے درجے کے شہری بن کر رہ جائیں گے جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہوگی۔ ان کا تصور ایک ایسی ریاست کا تھا جہاں مذہب فرد کا نجی معاملہ ہوگا بالکل وہی تصور جس کی بنیاد پر اسرائیل کا قیام بھی ایک ایسے ملک کے طور پر عمل میں لایا گیا جہاں یہودی ہر طرح کے ظلم و جبر سے آزاد زندگی گزار سکیں۔ لیکن ہمیشہ اس طرح سے نہیں تھا۔ اپنی سیاسی سرگرمیوں کے آغاز کے وقت جناح گاندھی اور نہرو کی سیاسی جماعت کانگرس کے رکن تھے اور ان کے ساتھ ہندوستان کو برطانیہ سے آزاد کرانے کی جدو جہد میں شریک عمل رہے تھے تاہم بعد ازاں ایک آزاد ہندوستان کے اندر مسلمانوں کی حیثیت کے حوالے سے نظریاتی اختلاف پیدا ہو جانے کے نتیجے میں انہوں نے اپنے سابقہ ساتھیوں کو حتمی طور پر الوداع کہہ کر مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی۔ جناح کا خیال تھا کہ مسلمان اپنی ایک علیحدہ شناخت رکھتے ہیں اور ان کے لئے انہوں نے ''قوم'' کی اصطلاح استعمال کی جس کی بنیاد پر وہ ہندو اکثریت کے برابر مقام رکھتے تھے جبکہ کانگرس کا اصرار تھا کہ آزاد ہندوستان ایک ایسی متحدہ

ریاست ہوگی جہاں کسی فرقے کو بھی مذہب کی بنیاد پر کوئی خصوصی حیثیت عطا نہیں کی جائے گی۔ یہ ایک ایسا اختلاف تھا جس کے حل کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تھی اور 1940 میں لاہور میں ہونے والے مسلم لیگ کے عظیم الشان عوامی جلسے سے خطاب کرتے ہوئے قائداعظم نے ایک قدم اور آگے بڑھاتے ہوئے آزاد ہندوستان میں محض مسلمان کے علیحدہ تشخص پر ہی زور نہیں دیا بلکہ فرقہ ورانہ بنیادوں پر ہندوستان کی تقسیم کی طرح کی تجویز بھی پیش کردی۔

دوسری جنگ عظیم کے اختتام تک یہی صورتحال برقرار رہی۔ اس وقت جنگ کے نتیجے میں شکستہ اور تباہ حال برطانیہ نے برصغیر کی آزادی کے حوالے سے تیزی سے پیشرفت شروع کر دی۔ چنانچہ اس حوالے سے بعد میں جس مذاکراتی عمل کا آغاز ہوا اس میں مسٹر جناح نے اپنی چالیں بڑی احتیاط سے چلیں بعض مورخوں کی دلیل کے مطابق جناح دراصل ایک علیحدہ مسلم ریاست کے حق میں بالکل نہیں تھے بلکہ ریاستوں کا ایک ایسا الحاق (confederation) چاہتے تھے جس میں مسلمان اکثریت والے علاقوں پر مبنی اکائی کی نمائندگی کرنے والے مسلمانوں کو اسی طرح ہندو اکثریت والے علاقوں پر مبنی اکائی کے نمائندوں کے مساوی حیثیت یا اختیارات حاصل ہوں گے۔ اس تصور کے مطابق پنجاب اور بنگال کو مرکزی حیثیت حاصل ہونی تھی۔ یہ دونوں علاقے مسلمان اکثریت والے علاقوں میں سب سے زیادہ گنجان آباد اور سیاسی لحاظ سے سب سے زیادہ اہمیت کے حامل تھے، اگرچہ ہر ایک صورتحال میں اکثریت کا فرق معمولی نوعیت کا تھا۔ جناح ان دونوں صوبوں کو مسلمان علاقے میں محض اس لئے شامل نہیں رکھنا چاہتے تھے کہ وہ مسلم اکثریت کے علاقے ہیں بلکہ اس لئے بھی کہ دوسرے مسلم اکثریتی صوبوں کے برعکس یہاں ہندوؤں کی بھی اچھی خاصی آبادی موجود تھی۔ مسلم اکائی کے اندر ہندوؤں کی موجودگی سے یہ یقین دہانی حاصل ہوجانی تھی کہ ہندو اکثریت کے صوبوں میں مسلمانوں کی ان اقلیتی آبادیوں کے ساتھ جو ان صوبوں کے اندر رہ جانی تھیں کوئی امتیازی سلوک نہیں کیا جائے گا۔ جناح کسی بھی ایسی تجویز کے سخت مخالف تھے جس کے مطابق پنجاب اور بنگال کو جہاں ہندو اور مسلمان دونوں تقریباً تقریباً برابر تعداد میں تھے، فرقہ ورانہ بنیادوں پر تقسیم کیا جاسکتا، کیونکہ ان کی دلیل کے مطابق ان کا نتیجہ ''ایک ایسی مسخ شدہ اور شکستہ حال''، مسلم اکائی کی صورت میں نکلے گا جس کا اپنا وجود ہی مشکوک ہوجائے گا۔

کانگریس کو اس سے کسی طرح بھی اتفاق نہیں تھا۔ وہ ایک ایسی مسلم آبادی کو مساوی حیثیت دینے پر کسی طرح آمادہ نہیں تھی جو کل ہندو آبادی کا محض ایک چوتھائی تھی، اور اس کا اصرار تھا کہ ایک آزاد و خود مختار ہندوستان میں ایک ایسی مضبوط مرکزی حکومت ہونی چاہئے جو تمام ہندوستانیوں کی بلاتفریق مذہب و عقیدہ نمائندگی کرتی ہو۔ تاہم اگر حالات کے دباؤ کے تحت جب برطانوی حکومت نے ان پر ایک علیحدہ مسلم اکائی مسلط کرنے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں نے پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا مطالبہ کر دیا۔ دونا موافق قسم کے مطالبات کے درمیان انتخاب کی مجبوری کے تحت برطانیہ نے درمیانی راستہ نکالنے کی کوشش کی۔ کانگریس کو اس کی خواہش کے مطابق ایک متحدہ ہندوستان دینے کی بجائے انہوں نے ہندوستان کو فرقہ ورانہ بنیادوں پر تقسیم کرنے کا فیصلہ کیا۔ جناح کو ایک عدد مسلم اکائی مل گئی مگر ایک مکمل آزاد ریاست کی صورت میں، نہ کہ الگ الگ اکائیوں پر مشتمل وفاقی ہندوستان کے اندر ایک ایسی مساوی اکائی کی صورت میں جہاں انہیں سارے ہندوستان کے مسلمانوں کے جذبات کی ترجمانی کا موقع مل جاتا۔ جناح کے لئے اتنی ہی تکلیف دہ دوسری حقیقت یہ تھی کہ برطانیہ نے کانگرس کے پرزور مطالبے کے آگے جھکتے ہوئے پنجاب اور بنگال کی تقسیم پر رضامندی ظاہر کر دی اور یوں جناح کے پاس ''مسخ شدہ اور شکستہ حال'' ریاست کے سوا کوئی چارہ نہ رہ گیا۔ یہ ریاست دو تقسیم شدہ صوبوں کے بچے کھچے حصوں اور غیر متنازعہ طور پر مسلم اکثریت کے حامل تین دیگر صوبوں پر مشتمل تھی جو کہ سب کے سب برطانوی ہندوستان کی مغربی حدود کی سمت واقع تھے: سندھ شمال مغربی سرحدی صوبہ (اب خیبر پختونخواہ) اور بلوچستان۔ اور یوں ایک نیا ملک اس حالت میں پاکستان کے طور پر وجود میں آ گیا۔

اکثریت کی توقعات کے برعکس جو کہ بعد ازاں احمقانہ ثابت ہوئیں، تقسیم ایک خونچکاں واقعہ ثابت ہوئی۔ یہ خاص طور پر پنجاب کے حوالے سے واضح حقیقت تھی جہاں پاکستانی مغرب میں رہنے والے ہندو اور سکھ بھاگ کر مشرقی سمت چلے گئے جبکہ بھارتی مشرق میں رہنے والے مسلمان بھاگ کر مغرب کی طرف آ گئے۔ راستے میں ہر ایک فرقے کے لوگوں کا سامنا فسادات کے ایسے ہزاروں انفرادی واقعات کی صورت میں دوسرے فرقے کے لوگوں سے ہوتا رہا جن میں لاکھوں افراد کو اپنی جان سے ہاتھ دھونے پڑے۔ برطانوی ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں قائم ہونے والی پاکستانی ریاست ایسے نصف مغربی اور مشرقی حصوں پر مشتمل تھی جن کے

درمیان ہزاروں میل پر محیط ہندوستانی علاقہ آجاتا تھا۔ جیسا کہ جناح کو علم ہونے کے ساتھ ساتھ شکایت بھی تھی یہ دونوں نصف حصے برطانوی ہندوستان کے انتہائی دور دراز علاقوں پر مشتمل ہونے کے علاوہ نسبتاً پسماندہ بھی تھے۔ جو علاقہ مغربی پاکستان بنا تھا اور بعدازاں مشرقی پاکستان کے بنگلہ دیش کی صورت میں الگ ہو جانے پر موجودہ پاکستان بن چکا ہے برطانوی ہندوستان کی حدود میں نسبتاً دیر سے شامل ہوا تھا۔ پنجاب جو کہ دو حصوں میں تقسیم ہونے کے باوجود مغربی پاکستان کے دل کی شکل اختیار کر گیا تھا اور اس کا سب سے گنجان آباد صوبہ بھی تھا، مغلیہ سلطنت کا ایک ناگزیر جز و تھا۔ اس کا دارلحکومت لاہور مغلیہ دور کی بعض عظیم الشان یادگاروں کا منظر پیش کرتا ہے۔ جب اٹھارویں صدی کے شروع میں مغلیہ سلطنت اپنے زوال کی طرف گامزن ہو رہی تھی تو پنجاب ذرا کمتر قسم کے حکمرانوں کے زیر تسلط آنا شروع ہو گیا اور آخر کار ایک ایسی سکھ سلطنت کی مرکزی صورت اختیار کر گیا جو انیسویں صدی کے آغاز میں تشکیل پائی تھی۔ مغربی پاکستان کا حصہ بننے والے دوسرے علاقوں، یعنی سندھ، بلوچستان اور صوبہ سرحد (پختونخواہ) کا بھی یہی انجام ہوا، موخر الذکر کا بھی اچھا خاصہ حصہ سکھوں کے زیر انتظام آگیا تھا۔

اس خطے میں برطانیہ کے عمل دخل کا آغاز انیسویں صدی کے وسط میں کئی عشروں اور بعض صورتوں میں ایک صدی سے زائد عرصے کے بعد اس وقت ہوا جب کہ وہ برصغیر کے مرکزی یا وسطی علاقوں کو اپنے زیر انتظام لا چکے تھے۔ ان کے اس علاقے تک رسائی کا مقصد صرف اپنے جغرافیے کو وسیع کرنا نہیں تھا بلکہ بعدازاں اس منصوبے کے ایک حصے کے طور پر روس کے خطے میں سرایت کر جانے کے خطرے کے خلاف انہیں روک کے طور پر بھی استعمال کرنا تھا جسے اب گریٹ گیم کہا جاتا ہے۔ سندھ پر قبضہ 1843 میں عمل میں آیا۔ پنجاب اور بعدازاں صوبہ سرحد کہلانے والے علاقے کے بڑے بڑے حصے سکھوں سے 1849 میں چھین لئے گئے۔ بلوچستان کے اکثر علاقوں کو اس سے اگلے عشرے میں شامل کیا گیا۔ خطے میں برطانیہ کو ہمیشہ آسانی سے راستہ نہیں ملا۔ برطانیہ نے سکھوں سے دو خونی جنگیں لڑیں۔ افغانستان کو فتح کرنے کی کوششیں بری طرح ناکام ہو گئیں، اور کابل میں تعینات سارے کے سارے برطانوی فوجی دستے کو 1842 میں افغان دارلحکومت سے دلدوز قسم کی پسپائی کے دوران پشتون قبائلی مجاہدین کے ہاتھوں ذلت آمیز طریقے سے صفایا دیکھنے میں آیا۔

برطانیہ کی ان علاقوں کو بنیادی طور پر روسی توسیعی منصوبے کے خلاف ایک روک کے طور پر استعمال کرنے کی خواہش دراصل ان کے طرز حکومت کی عکاس تھی۔ اگرچہ پورا علاقہ ہی روسی سرایت کے خطرے کے خلاف ایک عظیم فوجی چھاؤنی بن کر رہ گیا تھا، تاہم برطانیہ کے نقش قدم یہاں دوسرے علاقوں کی نسبت کم نمایاں تھے۔ پنجاب میں برطانیہ نے مسلم زمیندار اشرافیہ کو جو کہ خود کو سکھا شاہی دور کے اثرات سے بھی الگ تھلگ رکھنے میں کامیاب ہو گئی تھی، لازمی طور ان کے اپنے حال پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں اس کے مغربی سرحدی علاقوں کو جہاں زیادہ تر پشتون آباد تھے، افغانستان سے چھینے گئے اضافی علاقے سمیت شمال مغربی سرحدی صوبے میں ضم کر دیا گیا، اور یوں روک والے علاقوں میں ایک اور تہہ یا پرت کا اضافہ ہو گیا۔ حتمی روک کے طور پر برطانیہ نے اپنے زیر انتظام علاقوں اور افغانستان کے علاقے کے درمیان صوبہ سرحد کے مغرب میں سرحدی قبائلی علاقے قائم کر دیئے تھے جن کے حکمران دونوں علاقوں کے درمیان اس سرحد کو تسلیم کرنے کے پابند تھے جسے بعد میں ڈیورنڈ لائن کہا جانے لگا۔ اسی طرح بلوچوں کو بھی خود اپنے معاملات کا نگران رہنے دیا گیا، جبکہ صدی کے زیادہ حصے میں سندھ پر، ایک استثناء کے طور پر، ہمسائے بمبئی کے ذریعے حکومت کی گئی۔

فوج کی بڑی تعداد میں موجودگی کے ساتھ ایک روک کا کام کرنے والا یہ زیادہ تر خود مختار علاقہ جو کہ برطانوی راج کی انتہائی مغربی حدوں پر واقع تھا، مرکزی علاقوں کے ان سیاسی ہنگاموں سے بہت دور تھا جن کے نتیجے میں ایک وقت ایسا آیا جب ملک کی آزادی اور تقسیم عمل میں آ گئی۔ بنگال کے برعکس جہاں جناح کی مسلم لیگ کو اچھی طرح مقبولیت حاصل تھی، ان علاقوں میں جو بعد میں مغربی پاکستان بن گئے تھے، مقامی اشرافیہ کا تسلط تھا۔ پنجاب اور سندھ میں مسلم لیگی قیادت دیہی زرعی، علاقوں کی ان ممتاز شخصیات کے سپرد کی گئی تھی جو ''جاگیردار'' کے طور پر معروف تھے۔ اس کی سیاست کے اطوار جو کہ طویل عرصے سے رائج مربی۔ طفیلی رشتے کی عکاسی کرتے تھے، شہری ماحول میں پروان چڑھنے والی مسلم لیگی قیادت کے لئے اجنبی تھے جس کی توجہ کا واحد مرکز یہی مقصد تھا کہ مسلمانوں کے شہری اور سیاسی حقوق کو پروان چڑھایا جائے۔ پنجاب میں مقامی یونینسٹ پارٹی کی سرپرستی میں فعال جاگیردار زمینداروں نے 1937 میں برطانوی حکومت کی طرف سے تازہ تازہ نافذ کردہ گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ کے تحت کرائے گئے انتخابات میں

MashalBooks.org

مسلم لیگی امیدواروں کو شکست فاش دے دی۔ سندھ میں بھی یہی نتائج سامنے آئے۔ مسلم لیگی قیادت کو کوئی اندازہ نہیں تھا کہ جاگیردارانہ سیاست کے اصول کیا ہوتے ہیں اور نہ ہی انہیں کبھی سمجھ آئے گی۔ تاہم دوسری جنگ عظیم کے اختتام پر سر پر منڈلاتے ہوئے آزادی کے بادلوں کے ساتھ ہی انہوں نے ان بااثر مقامی شخصیات کے تعاون میں کامیابی حاصل کر لی جنہوں نے مسلم لیگی جھنڈے تلے1946 کے صوبائی انتخابات میں اسی روایتی طرز کی جاگیردارانہ سیاست کے ذریعے مخالفین کو عبرتناک شکست دے ڈالی۔

نئی وجود میں آنے والی قوم پر اصل میں راج کرنے والوں کا تعلق ان علاقوں سے نہیں تھا۔ محمد علی جناح کراچی میں پیدا ہوئے تھے مگر ان کی تعلیم انز آف کورٹ، لندن میں ہوئی تھی اور پیشہ ورانہ سرگرمیوں کا مرکز بمبئی تھا۔ مسلم لیگ کی زیادہ تر قیادت اسی پس منظر کی حامل تھی اور ان کا تعلق شمالی اور مغربی ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں مثلاً نئی دہلی، کلکتہ اور بمبئی سے تھا۔ اور یہی فطری طور پر ان کے سیاسی حلقہءہائے انتخاب اور ووٹ بنک تھے۔ تاہم ان کے تعداد میں نسبتاً کم سیاسی حمایتی ایسے تھے جنہوں نے ان کے ساتھ نئے ملک میں جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ زیادہ تر کے پاس غالباً اتنے وسائل ہی نہیں تھے کہ وہ اتنا طویل سفر کر سکتے یا پھر وہ اجنبی دین کی سرزمین پر نئے سرے سے زندگی بسر کرنے کا خطرہ مول لینے پر تیار نہیں تھے۔ برطانوی ہندوستان میں بسنے والے مسلمانوں کی پوری ایک تہائی تعداد جو کہ کوئی ساڑھے تین کروڑ بنتی تھی وہیں رہ گئی۔ مغرب کی طرف نقل مکانی کرنے والی 6 کروڑ سے زائد کی اکثریت کو تقسیم کے وقت ہونے والے دو طرفہ خونی فسادات کے دوران مشرقی سے مغربی پنجاب کی طرف بہت مختصر سفر کرنا پڑا۔ ایسے لوگ بہت تھوڑی تعداد میں تھے، نئی ریاست کی آبادی کا صرف 3 فی صد، جنہوں نے برطانوی ہندوستان کے مرکزی شہری علاقوں سے نئے قیام میں آنے والے ملک کی طرف ہجرت کی، اور ان میں سے اکثر نے نئے دارالحکومت کراچی میں سکونت اختیار کر لی۔

یہ مہاجرین، جیسا کہ انہیں بعد میں نام دیا گیا، شروع سے ہی باہر کے علاقوں سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کو ایک پہلو سے جو برتری حاصل تھی اور وہ بھی اچھی خاصی، وہ یہ تھی کہ ان کی رسائی مسلم لیگ کے بالائی طبقوں اور یوں سول سروس تک تھی۔ جب تک محمد علی جناح سیاسی منظر پر چھائے رہے اس وقت تک ان کی تھوڑی تعداد اور مہاجرانہ حیثیت سے کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔

تاہم جناح آزادی کے وقت سے پہلے ہی تپ دق کی وجہ سے خرابیءصحت کا شکار چلے آرہے تھے اور موت کے منہ میں جانے سے قبل ہی نیم جاں ہو چکے تھے۔ تقسیم کے بمشکل ایک برس بعد ہی ان کی موت سے ایک ایسا خلاء پیدا ہو گیا جسے ان کی سیاسی وارثوں کے لئے جن میں سے کوئی ان کی قدر آور شخصیت سے دور کی مماثلت بھی نہیں رکھتا تھا، پر کرنا انتہائی مشکل ہو گیا تھا۔ تین برس کے بعد ان کے بااعتماد نائب اور جانشین لیاقت علی خاں کے قتل کے نتیجے میں اقتدار کے سنگھاسن پر نسبتاً غیر اہم قسم کی شخصیات براجمان ہو گئیں۔ خواجہ ناظم الدین، غلام محمّد اور اسکندر مرزا جیسے نام تاریخ کے صفحات سے ہی مٹ چکے ہیں، حتیٰ کہ پاکستان کے اندر بھی ان کی کوئی یاد باقی نہیں رہی۔ ایک نئی قوم کی بنیاد رکھنے جیسے کام کی مشکلات کے بوجھ کے ساتھ ہی ریاستی امور کے تجربے کے فقدان کی بنا پر، بچی کھچی مسلم لیگی قیادت کا افسر شاہی کے کرتا دھرتا لوگوں پر انحصار بڑھتا چلا گیا۔ جن میں سے اکثر خود بھی مہاجر تھے، اور پاکستان آنے سے پہلے برطانوی نو آبادیاتی انتظامیہ کے تحت خدمات سرانجام دے چکے تھے۔ پاکستان کی سرزمین پر چونکہ ان دونوں گروہوں میں سے کسی کا بھی سیاسی حلقہ انتخاب موجود نہیں تھا اس لئے ان میں سے کسی کو بھی ووٹ کی طاقت یا سیاست پر اپنا سکّہ جمانے سے کوئی حقیقی دلچسپی نہیں تھی۔

آئین کی تیاری و نفاذ کے لئے ایک عدد آئین ساز اسمبلی موجود تھی جس میں مغربی پاکستان کے اندر اکثریت انہی جاگیرداروں کی تھی جو 1946 کے صوبائی انتخابات کے دوران مسلم لیگی جھنڈے تلے جمع ہو گئے تھے۔ تاہم اس اسمبلی کو کوئی اہمیت نہ دی گئی اور 1954 میں اسے برخواست کر دیا گیا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ 1956 سے پہلے کوئی آئین ہی نہیں بنایا گیا اور آزادی کے تقریباً ایک عشرے بعد یہ مقصد ایک نئی تشکیل کردہ اسمبلی کے ذریعے پورا کیا گیا۔ اس سے قبل پارلیمانی نظام کے حامل ملک میں جس چیز پر تقریباً اتفاق رائے ہو چکا تھا وہ 1949 میں قرارداد مقاصد کی منظوری تھی جو کہ نصف سے بھی کم صفحہ لیتی ہے۔ یہ صورتحال انتظامیہ میں اکثریت رکھنے والے مہاجر سیاستدانوں اور افسر شاہی کے کارندوں کے لئے موافق تھی کیونکہ اس طرح سے وہ ملک کو کم یا زیادہ اپنی مرضی سے چلانے کے قابل ہو گئے تھے۔ تاہم انہیں اس وقت اس امر کا احساس ہوا یا نہیں مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ حکومت کے اہم ترین عہدوں پر ان کا اختیار یا قبضہ ایک تیزی سے تباہ ہوتے ہوئے ورثے کی طرح تھا کیونکہ اس کو سنبھالنے یا درست طریقے سے

چلانے کے لئے نہ تو ان کے پاس کوئی ذاتی صلاحیت تھی اور نہ ہی سیاسی بنیاد۔ مہاجروں کے مقدر میں پہلے ہی کم تر درجے کی ایک ایسی طاقت بن کر رہ جانا تھا جو گلی محلے کی لڑائیوں کا ذوق رکھنے والے سابقہ شدت پسند طلباء کی قیادت میں کراچی تک محدود ہو کر رہ گئی تھی۔ تاہم ان کے انجام کا سامان جھگڑالو قسم کے وہ جاگیردار نہیں بننے لگے تھے جو سب سے پہلی قانون ساز اسمبلی میں مغربی پاکستان کی ساری نشستوں پر قابض تھے۔ سیاسی اقتدار تک عروج کے لئے انہیں بنگلہ دیش کی صورت میں مشرقی بازو کی علیحدگی کے بعد سندھی جاگیردار ذوالفقار علی بھٹو کے سیاسی عروج کے ساتھ ہی برسر اقتدار آجانے کے وقت کا انتظار کرنا تھا۔ تاہم اس میں ابھی ایک عشرے سے زیادہ وقت لگا۔

جس طاقت نے مہاجروں کی اقتدار پر گرفت ختم کرنے کے ساتھ ہی اصل مسلم لیگ کے حتمی زوال کے عمل کو تیزی عطا کی وہ پاکستانی فوج تھی۔ مہاجروں کے برعکس فوج زیادہ تر ایک مقامی جڑیں رکھنے والی طاقت تھی۔ شمالی پنجاب میں راولپنڈی، اٹک اور جہلم کی نام نہاد فوجی تکون سے تعلق رکھنے والے پنجابی سپاہی برطانوی دور حکومت میں ہندوستانی فوج میں غالب حیثیت رکھتے تھے۔ تاہم تقسیم کے وقت جناح نے نئی تشکیل کردہ پاکستانی فوج میں برطانوی سینیئر افسران سے درخواست کی تھی کہ سینیئر عہدوں کو پر کرنے کے لئے وہ کچھ عرصہ فوج میں رہیں۔ فوج کے پہلے دو سربراہان برطانوی تھے: تیسرا سربراہ ایوب خان تھا، جو کہ پاکستان کا پہلا فوجی آمر تھا۔ یہ ایوب ہی تھا جس کی تعلیم برطانوی طرز پر سینڈ ہرسٹ میں ہوئی تھی اور جو اپنے اردگرد موجود سیاستدانوں اور سرکاری عہدیداروں کے باہمی تنازعات سے تنگ آیا ہوا تھا جس نے مہاجر زوال سے پیدا ہونے والے خلاء کو پر کرنے کی طرف پیش قدمی کی۔ تاہم اگر انڈیا کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر جو کہ تقسیم کے وقت سے ہی چلا آرہا تھا، کوئی جھگڑا نہ ہوتا تو شائد اسے ایسا کوئی موقع فراہم نہ ہوتا۔

جموں و کشمیر، جیسا کہ اس کا پورا نام ہے، ایک ایسی شاہانہ ریاست تھی جس میں غالب اکثریت والی مسلمان آبادی پر ہندو مہاراجہ کی حکومت تھی۔ برطانوی حکومت کے زیر انتظام ایسی سینکڑوں ریاستیں تھیں، جن میں سے ہر ایک کو نام کی آزادی تو حاصل تھی مگر دراصل وہ پوری طرح حکومت برطانونیہ کی فرمانبردار تھیں۔ آزادی کے وقت برطانوی حکومت نے خصوصی

حیثیت عطا کرنے کا ڈرامہ جاری رکھتے ہوئے ہر خود مختار شاہانہ ریاست کو انڈیا یا پاکستان کے ساتھ الحاق کرنے کا نام نہاد حق دے دیا تھا۔ تقریباً ہر ایک مثال میں یہ حکمت عملی اس بنیادی اصول کے لئے کسی طرح کے خطرے کا باعث نہیں تھی جس کے مطابق تقسیم کے وقت مسلمان اکثریت کے علاقے پاکستان کے پاس اور ہندو اکثریت کے علاقے بھارت کے پاس چلے جانے تھے۔ تاہم اس حوالے سے تین استثنائی صورتیں موجود تھیں۔ دو شاہانہ ریاستوں ، حیدرآباد اور جونا گڑھ میں اگرچہ ہندوؤں کی بھاری اکثریت تھی مگر ان پر مسلمانوں کی حکومت تھی۔ تیسری ریاست کشمیر تھی۔ جونا گڑھ کے مسلمان حکمران نے پاکستان کے حق میں فیصلہ دیا مگر اسے انڈیا کے دباؤ کے باعث فرار ہونا پڑا۔ اس کے حیدرآبادی ہم منصب نے ایک برس کی مہلت مانگ لی مگر اس سے پہلے ہی ایک انڈین حملے کے نتیجے میں اسے انڈیا کے ساتھ الحاق پر مجبور ہونا پڑا اور یوں یہ سب سے بڑی شاہانہ ریاست بھی انڈیا کے قبضے میں آ گئی۔ تاہم کشمیر کے واقعات نے ذرا مختلف رنگ اختیار کیا تھا۔

کشمیر کا راجہ ہری سنگھ ایک ہندو تھا۔ اس شاہانہ ریاست کا مسلم مرکز جو کہ کشمیر کی خوبصورت وادی کے عین وسط میں واقع تھا صرف ایک صدی تک ہندوؤں کی تحویل میں رہا تھا۔ ہری سنگھ کا مہم جو دادا گلاب سنگھ جو کہ کشمیر کے عین جنوب میں واقع نسبتاً بہت ہی کم ہندو اکثریت کی وادی جموں کا حکمران تھا، برطانوی حکومت کو اس لاگت کی ادائیگی پر رضا مند ہو گیا تھا جو انہوں نے کشمیر کی حکمرانی کے حصول میں برطانیہ کو دی جانے والی مدد کے بدلے پہلی سکھ جنگ کے اخراجات کی صورت میں کی تھی۔ یہ وادی اس زمانے میں ابھی تک سکھوں کی اس سلطنت کا حصہ تھی جسے برطانیہ نے تازہ تازہ شکست دی تھی اور ایک ایسے مسلمان گورنر کے زیر انتظام تھی جس کی تقرری اوپر سے کی گئی تھی۔ پیسے کے لئے بے چین برطانوی حکومت نے علاقے میں دس ہزار سپاہی روانہ کر کے گورنر کو وہاں سے چلتا کیا اور تخت گلاب سنگھ کے حوالے کر دیا۔

اس واقعہ کی بدولت، جو کہ گریٹ گیم کی تاریخ میں بظاہر ایک معمولی سا اتفاق نظر آتا ہے، ہری سنگھ کو تقسیم کا وقت قریب آنے پر انڈیا یا پاکستان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ اس نے بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرتے ہوئے نئی ظہور میں آنے والی پاکستانی حکومت سے ایک مہلت طلب معاہدے کی گفت و شنید شروع کر دی جس کے تحت کشمیر کے محکمہ ڈاک اور مواصلات کے

نظام کی ذمہ داری پاکستانی حکومت پر ہوگی۔ اس طرح کے معاہدے عموماً الحاق سے قبل کے ابتدائی تیاریوں کے طور پر کیے جاتے تھے اور یوں پاکستان کو جو کہ مسلم اکثریت کے علاقے کشمیر کو ویسے ہی اپنا حق سمجھتا تھا، یقین ہو گیا کہ واقعات اس کے حق میں جا رہے ہیں۔ تاہم اس موقع کچھ غیر متوقع حالات پیش آ گئے۔ کشمیر کے علاقے پونچھ میں مسلمان اچانک ایک ایسی بغاوت کے تحت اٹھ کھڑے ہوئے جو مقامی حکام کی طرف سے عائد کردہ نئے محصولات کے خلاف ایک طرح بے ساختہ تحریک نظر آتی تھی۔ نئی پاکستانی حکومت نے اس خدشے کے پیش نظر کہ کہیں بنا بنایا کھیل بگڑ نہ جائے، کشمیر پر بذریعہ طاقت قبضہ جمانے کے لئے جلد بازی میں صوبہ سرحد سے بے قاعدہ یا عارضی طور پر تعینات پشتون مغربی دستے اس شاہانہ ریاست کی طرف روانہ کر دیئے۔ جیسے ہی ان غیر منظّم گنوار قسم کی فوج نے کشمیر کے دارلحکومت سری نگر کی طرف پیش قدمی شروع کی، تو ایک حواس باختہ ہری سنگھ نے فوراً انڈیا سے مدد طلب کر لی۔ انہوں نے اس شرط پر حامی بھر لی کہ ہری سنگھ انڈیا کے ساتھ الحاق کے معاہدے پر دستخط کر دے اور اس کی طرف سے رضامندی پاتے ہی بھارتی فوجیں سری نگر کے ہوائی اڈے پر پہنچنا شروع ہو گئیں۔

بھارتی فوجوں نے پشتونوں کے حملے کو نہ صرف ناکام بنانے میں کامیابی حاصل کر لی بلکہ اصل میں انہیں پیچھے دھکیلنا شروع کر دیا۔ جلد ہی پاکستان سے بھی باقاعدہ فوجیوں نے وہاں پہنچنا شروع کر دیا مگر وہ صورتحال کو صرف تعطّل کی حد تک ہی لے جا سکے۔ دو نئی اور تیزی سے تھکی ہوئی فوجوں کے درمیان ایک برس سے زائد عرصہ تک لڑائی جاری رہنے کے بعد آخر کار دونوں فریق جنگ بندی پر رضامند ہو گئے۔ تاہم اصل چیز یعنی کہ مسلم اکثریتی وادی کشمیر، بدستور انڈیا کے قبضے میں رہی۔ پاکستان کو محض جنوب مغرب میں کشمیر کے علاقے کے اندر چھوٹے سے ٹکڑے پر ہی اکتفا کرنا پڑا جس کا نام اس نے آزاد جموں وکشمیر رکھ دیا اور اس کے ساتھ ہی شمال میں قراقرم کے پہاڑوں کے اندر ایک وسیع مگر کم آباد علاقہ بھی اس کے قبضے میں آ گیا۔ تاہم یہ امر طے ہونے کے ابھی دور دور تک بھی امکانات نظر نہیں آ رہے تھے کہ کشمیر پر آخر کس کی حکمرانی ہوگی۔ پاکستان اور انڈیا اس مسئلے کو اقوام متحدہ کے پاس لے جانے کے لئے تیار ہو گئے جس نے استصواب رائے کرانے کا فیصلہ دے دیا۔ اس پر عملدرآمد کی راہ میں ایک بڑی رکاوٹ یہ مطالبہ تھا کہ پاکستان اپنے زیر انتظام آنے والے علاقوں سے فوجیں واپس بلا لے۔ تاہم پاکستان نے اس خدشے کے

پیش نظر انکار کر دیا کہ اگر اس نے اپنی فوجیں واپس بلالیں تو ہندوستان اپنی فوج داخل کر دے گا جو کہ بھارتیوں کے خیال میں ان کا حق تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ نکلا کہ استصواب رائے آج تک نہ ہو سکا۔

اس شاہانہ ریاست پر دونوں فریق اپنے اپنے دعووں پر ابھی تک برقرار چلے آ رہے ہیں۔ بھارت کا موقف ہے کہ ہری سنگھ کی طرف سے الحاق کی دستاویز پر دستخط ہو چکنے کے بعد سارے جموں و کشمیر پر اب اس کا حق بنتا ہے۔ جب کہ پاکستان کا دعویٰ ہے کہ اب معاملہ اقوام متحدہ کے پاس چلے جانے اور اس حقیقت کے پیش نظر کہ بھارت نے ایک مرتبہ استصواب رائے پر اصولی رضامندی ظاہر کر دی تھی اب اس حق کا کوئی جواز نہیں بنتا۔ تاہم پاکستان کے دعوے قانونی نزاکتوں کو نظر انداز کرتے نظر آتے ہیں۔ ان کی دلیل یہ ہے کہ چونکہ تقسیم کے وقت اصولی طور پر یہ طے کر لیا گیا تھا کہ مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے پاس جائیں گے اس لئے کشمیر پر ان کا حق بنتا ہے۔ وہ ہندو اکثریت پر مشتمل ریاستوں، حیدر آباد اور جونا گڑھ کا اس حقیقت کے باوجود کہ ان کے حکمران مسلمان تھے بھارت کے ساتھ ان کے الحاق اور کشمیر کے حوالے سے یہی حق پاکستان کو دینے سے انکار کی منافقت کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ بہت سے پاکستانیوں کے نزدیک کشمیر پر انڈیا کا تسلط، بالکل واضح اور کھلم کھلا طور پر زمین کے اس ٹکڑے پر ناجائز قبضے کی طرح ہے اور وہ اس ناانصافی کو کبھی بھی دل سے تسلیم نہیں کر سکے۔ اس امر سے قطع نظر کہ کون غلط ہے اور کون صحیح، قانونی یا اخلاقی دونوں پہلوؤں سے، اصل حقیقت یہ ہے کہ مسئلہ کشمیر شروع سے ہی انڈیا اور پاکستان کے تعلقات میں زہر گھولتا چلا آ رہا ہے۔ اس حقیقت کی بناء پر بھی تعلقات میں بہتری نہ آ سکی کہ انڈیا نے تقسیم کے معاہدے کی شرائط کے تحت پاکستان کے حصے میں آنے والے بعض مادی اور مالی اثاثوں کی منتقلی میں تاخیر اور بعض اوقات تو نرا انکار کر کے رکھ دیا۔ بہت سے پاکستانی اس نتیجے پر متفق نظر آتے ہیں کہ انڈیا پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور انہیں شک ہے کہ اس نے ایک علیحدہ مسلمان ریاست کے وجود کو کبھی دل سے تسلیم نہیں کیا۔ چنانچہ انہیں ہوشیار رہنے کی ضرورت کے ساتھ ہی ایک طاقتور فوج رکھنے پر مجبوری کا سامنا بھی ہے۔

اس کے بعد آگے جا کر ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان کے حصے میں آنے والے چند قلیل وسائل کا اچھا خاصا تناسب فوج کو منتقل ہونا شروع ہو گیا۔ ایوب خان نے جو کہ پاکستان کا پہلا مقامی چیف آف آرمی سٹاف تھا، سیاسی اقتدار کے عروج پر مسٹر جناح اور لیاقت علی خان کے

جانشینوں کے ساتھ جلد ہی اپنی جگہ بنانی شروع کر دی۔ مسٹر جناح اور تحریک پاکستان کے دور کے دوسرے رہنماؤں کی طرح ایوب خان بھی غیر مذہبی نظریات اور عزائم رکھتا تھا۔ اپنی سینڈ ہرسٹ کی تعلیم اور اس نظریئے کے باوجود کہ فوج کو سیاست سے دور رہنا چاہیے وہ اپنے سویلین رفقائے کار کے مفاد پرستانہ اور متعصّبانہ طرزِ عمل سے سخت نالاں رہنے لگا تھا۔ اس کی یادداشتیں ان کی حرام خوری اور ضمیر فروشی کے فسانوں سے بھری پڑی ہیں۔ اس کے تنفر میں اضافہ اس وقت ہوا جب مغربی اور مشرقی پاکستان کے باہم دست و گریبان سیاست دان اپنے تازہ تازہ منظور کردہ 1956 کے آئین کی شقوں کے تحت قومی انتخابات کروانے کے کسی کلیے پر بھی متفق ہوتے نظر نہ آئے تھے۔ اس نے یقیناً یہ بھی محسوس کر لیا ہوگا کہ اگرچہ اس کے سویلین رفقائے کار ''وزیراعظم'' اور ''صدر'' جیسے متاثر کن سیاسی خطابات لئے پھرتے تھے مگر وہ سیاسی طور پر مقبول نہیں تھے۔ اور پھر اس کے علاوہ ساری فوج بھی اس کے ماتحت تھی۔ اکتوبر 1958 میں اس نے صدر اسکندر مرزا کے ساتھ سازش کر کے جو کہ ایک سرکاری عہدیدار تھا نہ کہ سیاست دان، مارشل لاء نافذ کرنے کا اعلان کر دیا۔ صرف تین ہفتوں کے بعد ہی ایوب نے سکندر مرزا کو برطرف کرتے ہوئے اقتدار پر خود قبضہ جما لیا۔ فوج اب ملک کے سب سے بڑے عہدے پر براجمان ہو چکی تھی اور اس کے بعد وہ اس سے کبھی بھی دور نہیں گئی۔

ایوب نے ایک مغرب نواز اور کاروباری طبقے کے ایسے خیر خواہ رہنما کے طور پر حکومت کی جو کہ ان مہاجرین کی طرح کافی حد تک غیر مذہبی خیالات رکھتا تھا جنہیں اس نے بعد ازاں ایک طرف دھکیل کے رکھ دیا تھا۔ اس کے غیر مذہبی رویے اس حد تک مضبوط تھے کہ ایک مرتبہ تو اس نے ریاست کے سرکاری نام سے لفظ اسلامی بھی خارج کر دینے کی کوشش کی تھی۔ سیاست دانوں سے اس کی بیزاری کی عکاسی اس نئے آئین سے ہوتی تھی جس کے ذریعے اس نے ایک ایسا سیاسی نظام تشکیل کرنے کی کوشش کی تھی جس کو اس نے بنیادی جمہوریتوں کا نام دیا تھا جس میں براہ راست انتخابات صرف بہت ہی نچلے مقامی حکومت کے اداروں کی سطح پر ہوتے تھے۔ چالیس برس کے بعد جنرل پرویز مشرف جو بالکل ایسا ہی مزاج رکھتا تھا انہی وجوہات کی بناء پر اسی طرح کے ادارے تشکیل کر رہا تھا۔ ایوب خان کو پاکستان کا کشمیر پر دعویٰ بھی یاد تھا اور اس نے پاکستان کو انڈیا کے ساتھ ایک اور جنگ میں جھونک دیا تھا۔ سابقہ شاہانہ ریاست میں پہلی جنگ عظیم کے

اختتام کے وقت سے ہونے والے واقعات کے نتیجے میں بھارتی حکومت کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ پہلے پہل جموں وکشمیر کے مسلمانوں کے مانے ہوئے لیڈر، شیخ عبداللہ نے بھارتی حکمرانوں کے ساتھ تعاون کا مظاہرہ کیا تھا۔ کشمیر کا شیر کہلانے والی یہ شخصیت نہرو کے ساتھ ہی دوستی کا دم بھرتی تھی اور کانگرس کے لئے دل میں نرم گوشہ رکھتی تھی اس کے زرعی اصلاحات کے پروگرام نے اسے اپنے مسلمان ووٹروں میں بے پناہ مقبول کر دیا تھا اور اس نے بھارتی آئین کی دفعہ 370 کے تحت کشمیر کے لئے تقریباً مکمل 1953 تک اسے یہ سب کچھ بہت کم محسوس ہونے لگا تھا۔ شاید خود ہی اپنی ہی قائدانہ صلاحیتوں سے ضرورت سے زیادہ متاثر ہو کر اس نے مکمل آزادی کے لئے حمایت کے حصول کی کوششیں کرتے ہوئے یہ تجویز پیش کر دی کہ کشمیر کو اقوام متحدہ کی قراردادوں کے مطابق انڈیا یا پاکستان سے الحاق کرنے کا حق استعمال کرنے کی آزادی دینے کے ساتھ ہی یہ اختیار حاصل کرنے کی آزادی بھی دی جائے کہ وہ دونوں سے علیحدہ ایک آزاد و خود مختار ریاست بننے کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔ حالات کو اس رخ پر جاتا دیکھ کر بھارتی حکومت کو خطرے کا احساس ہوا تو اس کے بلند عزائم رکھنے والے ماتحت ساتھیوں کے ذریعے اس کا تختہ الٹوا دیا گیا اور بعد ازاں سے ریاستی وجود کے لئے خطرہ قرار دے کر پابندِ سلاسل کر دیا گیا۔

ایک اور عشرے تک معاملات یونہی چلتے رہے۔ 1963 کے اواخر میں کشمیر کی سب سے زیادہ مقدس یا متبرک مذہبی یادگار یعنی حضور پاکؐ کی ریش مبارک کا ایک بال سری نگر کی اس مسجد سے غائب پایا گیا جہاں یہ محفوظ کر کے رکھا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں مسلمان بڑی تعداد میں مشتعل ہو کر گھروں سے باہر نکل آئے اور کشمیر کے علاوہ بھارت کے دیگر شہروں میں بھی ہندوؤں پر حملے شروع ہو گئے۔ حواس باختہ بھارتی حکومت نے حالات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے شیخ عبداللہ کو جیل سے رہا کر دیا اور حتیٰ کہ اسے ایوب خان سے مل کر بحران کے خاتمے کے حوالے سے تبادلہ خیال کرنے کے لئے پاکستان کے اندر سفر کرنے کی اجازت بھی دے دی۔ آخر کار موئے مبارک کشمیر میں واپس اپنے محفوظ مقام پر آ گیا اور حالات واپس معمول پر آ گئے جبکہ ندامت سے عاری عبداللہ بھارت لوٹتے ہی دوبارہ جیل میں چلا گیا۔ تاہم اس واقعہ سے پاکستان نے جو نتائج اخذ کئے ان کا انجام جلد ہی ایک جنگ کی صورت میں سامنے آیا۔ ایوب اور اس کے ساتھ فوجی 1962 میں چین کے ساتھ سرحدی جھڑپوں میں بھارت کی عبرتناک شکست سے حوصلہ مند اور

MashalBooks.org

1965 کے اوائل میں رن آف کچھ کے متنازعہ سرحدی علاقوں میں چھوٹی چھوٹی جھڑپوں میں بھارتی فوجوں کو مات دینے کی اپنی مہارت پر نازاں دکھائی دیتے تھے۔ انہوں نے ایک تجویز سوچی کہ کشمیر میں غیر رسمی یا بے قاعدہ فوجیں بھیج کر وہاں کے مسلمانوں کو بغاوت پر اکسایا جائے نوجوان پاکستانی وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو اس تجویز کے بڑے حامیوں میں سے ایک تھے۔ یہ کوئی نئی تجویز نہیں تھی۔ سابقہ عشرے کے دوران پاکستانی فوج نے کم شدت کی گوریلا لڑائیوں کو بھارت میں کشمیر کے خلاف ایک ممکنہ ہتھیار کے طور پر استعمال کرنے کے حوالے سے تحقیق و جائزے کا کام شروع کر دیا تھا۔ اس کی تحریک انہیں دوسری جگہوں خاص طور پر الجیریا، یوگوسلاویہ، شمالی کوریا، اور چین میں ہونے والی بے شمار کامیاب بغاوتوں کے مطالعہ سے حاصل ہوتی تھی۔

تاہم یہ چال بُری طرح ناکام ہوگئی۔ بہت سے دراندازوں کو راستے میں ہی دھر لیا گیا اور باقی جو پہنچنے میں کامیاب ہوگئے تھے وہ کسی بھی قسم کی مسلم بغاوت کی آگ بھڑکانے میں ناکام و نامراد رہے۔ بعدازاں پاکستان کی سرکاری فوج کی طرف سے کیا جانے والا باقاعدہ حملہ بھی زیادہ کامیابی حاصل نہ کر سکا، اور جب بھارتی فوجوں نے جنوب کی طرف مزید پیش قدمی کرتے ہوئے پنجاب کے دارالحکومت لاہور کے قریب پاکستان پر حملہ کر دیا تو پاکستانی خواب خرگوش کے مزے لے رہے تھے۔ اس کا نتیجہ ایوب کی سیاسی شکست کی صورت میں برآمد ہوا۔ جسے امریکہ کی طرف سے اسلحہ کی بندش کے بعد جس کے باعث فوج کو فالتو پرزوں کی قلت کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا، ایک ذلت آمیز جنگ بندی پر مجبور ہونا پڑا۔ 1965 کی جنگ انڈیا اور پاکستان کے مابین کشمیر پر لڑی جانے والی دوسری جنگ تھی، اور یہ دوسرا موقع تھا جب پاکستان نے متنازعہ علاقے میں غیر رسمی یا بے قاعدہ فوجیں روانہ کی تھیں جبکہ اس سے قبل ایسا 1947 میں ہوا تھا جب غیر تربیت یافتہ پشتونوں کو وادی میں دھکیل دیا گیا تھا۔ تاہم ہماری کہانی کے لئے اس کی خاص اہمیت اس حقیقت میں مضمر ہے کہ ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ پاکستان نے کشمیر میں اس کی طرف سے لڑنے والی غیر رسمی فوجوں کے لئے مجاہدین کی اصطلاح استعمال کی تھی۔

اس اصطلاح کا منسوب کیا جانا جس کا آغاز بھٹو کے ساتھ ہی ہوا تھا، اس لئے بھی اہمیت رکھتا تھا کیونکہ یہ مذہبی مفہوم کی حامل تھی۔ اسلامی بول چال میں مجاہدین سے مراد ایسے جنگجو ہیں جو جہاد کے ذریعے اسلامی نظریات کا فروغ و اطلاق چاہتے ہیں۔ تاہم یہ تعریف 1965 کے

واقعات پر بالکل صادق نہیں آتی۔ اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ کشمیر میں داخل ہونے والی غیر رسمی فوجیں یا دراندازانتہا پسند اسلامی نظریات رکھتی تھیں یا پھر ان کو تحریک دینے والا مذہبی تصور ایوب جیسی غیر مذہبی شخصیت کے تصور سے زیادہ گہرا یا وسیع تھا۔ زیادہ تر بیانات وشواہد سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ درانداز وہ کشمیری تھے جو اصل جنگ بندی لائن کی پاکستانی سمت رہ رہے تھے اور مذہب کی نسبت اپنی مادر وطن کو دوبارہ متحد کرنے اور اپنے ساتھی کشمیریوں کو انڈیا کے تسلط سے آزاد کرانے کے جذبے سے زیادہ سرشار تھے۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں مجاہدین کا خطاب دے کر پاکستانی حکام انہیں جھنڈے کے اسلامی مترادف کی شناخت دے رہے ہوں جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ حتیٰ کہ نسبتاً ابتدائی عرصے میں بھی جہادی محرکات کا تقدس اور تحسین کے پہلو سے دیکھا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ ایوب اور بھٹو جیسے لوگ بھی جو کہ ریاستی معاملات کو مذہب سے الگ رکھے ہوئے تھے جہاد کو تعظیم وستائش کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ چنانچہ اس طرح کا تاثر پیدا کر کے یہ لوگ مذہبی محرکات کی بناء پر خود اپنے طور پر ہی جہاد کر رہے ہیں، ان کو رسمی طور پر تسلیم بھی نہیں کیا جارہا تھا۔

اگرچہ 1965 کی جنگ سے ایوب کو زبردست سیاسی دھچکہ لگا، مگر اس نے ذوالفقار علی بھٹو کی سیاست میں جوش اور ولولہ پیدا کر دیا، جن کی دلیل یہ تھی کہ پاکستان کو ہر حال میں جنگ جاری رکھنی چاہیے تھی۔ اس سے اگلے برس انہوں نے وزیر خارجہ کے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور اس سے ایک برس بعد پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھ دی۔ 1965 کی جنگ سے جو اور بڑا نقصان ہوا وہ مغربی اور مشرقی پاکستان کے درمیان پہلے سے ہی کشیدہ تعلقات میں مزید بگاڑ کا پیدا ہونا تھا۔ ان دونوں اکائیوں یا وحدتوں کے درمیان جو کہ ایک دوسری سے انڈیا جیسے ملک کی چوڑائی کے فاصلے پر تھیں، کوئی قدر بھی مشترک نہیں تھی ماسوائے اس کے کہ دونوں مسلمان اکثریت کے علاقے تھے۔ آزادی سے قبل کا بنگال برطانوی راج کے بانی علاقوں میں سے ایک تھا اور اس کا اہم ترین شہر کلکتہ 1911 تک برطانوی حکمرانوں کا دارالحکومت بھی رہا تھا۔ جناح کو کلکتہ کی شدید تمنا تھی اور اس کا اظہار انہوں نے ایک موقع پر یہ کہہ کر کیا تھا کہ کلکتہ کے بغیر پاکستان ایسے ہی ہوگا جیسے دل کے بغیر کوئی انسان۔ تاہم برطانیہ نے اسے نصف مغربی بنگال سمیت انڈیا کے حوالے کر دیا تھا اس امر کو تسلیم کرنے کے باوجود کہ اس کا باقی نصف جو کہ ڈھاکہ کے گرد پایا جاتا تھا، ایک ''پسماندہ دیہی علاقے'' سے ذرا ہی بہتر ہوگا۔ چنانچہ یہی رویہ نئی تخلیق کردہ پاکستان ریاست میں بھی سرایت

کر گیا تھا جہاں سیاسی طاقت تیزی سے مغربی حصے کی طرف مرکوز ہو گئی۔ کچھ حد تک یہ انڈیا کے ان شمالی اور مغربی علاقوں کی جہاں سے مہاجروں نے نقل مکانی کی تھی مغرب کے بالکل قریب واقع پنجاب اور سندھ کے متصل علاقوں کے ساتھ ثقافتی ہم آہنگی کی عکاسی بھی تھی۔ اور اس صورتحال کی عکاسی آزادی کے بعد فوج اور سول انتظامیہ کے پروان چڑھتے ہوئے شعبوں میں مغربی پاکستان کے غلبے سے بھی ہوتی تھی۔ حتیٰ کہ خالص پاکستانی تناظر میں بھی مشرقی پاکستان کو پسماندہ علاقہ سمجھا جاتا تھا۔

یہ صورتحال بنگالیوں سے پوشیدہ نہیں تھی۔ وہ کراچی کی حکمران مہاجر اشرافیہ کی طرف سے بنگالی کو اردو کی طرح سرکاری زبان کا درجہ نہ دینے پر پہلے ہی ناخوش تھے۔ چنانچہ 1952 میں ڈھاکہ میں ہڑتالوں اور پرتشدد مظاہروں کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ بنگالیوں کے مفادات کے ترجمان ایک نئی سیاسی جماعت 1950 میں عوامی لیگ کے نام سے منظر عام پر آ گئی تھی جس نے مسلم لیگ کو تیزی سے گمنامی کی سرحدوں کی طرف دھکیل دیا۔ تاہم یہ جماعت مشرقی پاکستان کی اقتصادی حالت سدھارنے میں ناکام رہی کیونکہ ایوب دور میں ہونے والی بے پناہ اقتصادی ترقی کے ثمرات سے فائدہ نہ اٹھایا جا سکا۔ 1965 میں انڈیا کے ساتھ کشمیر کے مسئلے پر ہونے والی جنگ کے دوران مشرقی پاکستان کو عملی طور پر بغیر کسی دفاع کے یکا و تنہا چھوڑ دیا گیا تھا جو کہ ایک ایسی حقیقت تھی جس سے وہ لوگ اچھی طرح باخبر تھے۔ چنانچہ یہ ایک ایسا فیصلہ کن موڑ ثابت ہوا جس نے بنگالیوں کے اندر شدت سے یہ احساس پیدا کر دیا کہ انہیں اپنے معاملات خود چلانے پڑیں گے۔ ان خواہشات کا عملی اظہار ایک برس بعد اس وقت دیکھنے میں آیا جب عوامی لیگ کے رہنما شیخ مجیب الرحمٰن نے اپنا چھ نکاتی منشور پیش کرتے ہوئے مشرقی پاکستان کی مکمل خود مختاری کا مطالبہ کر دیا۔ یہ واقعہ اصل پاکستانی ریاست کی الجھن کے حتمی حل کا پیش خیمہ ثابت ہوا۔

ہر طرف سے محصور، ایک بیمار اور دلگرفتہ ایوب خان نے آخر کار 1968 میں استعفیٰ دے دیا اور اس کے ساتھ ہی اس کا بنیادی جمہوریتوں کا محل بھی دھڑام سے نیچے آ گرا۔ اس کی جگہ لینے والے ایک غیر معروف جنرل بنام یحییٰ خان نے قومی سطح کے پہلے عام انتخابات کا اعلان کر کے مشرقی پاکستان کی جلتی ہوئی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی کوششوں کا آغاز کر دیا۔ اس نے یہ فیصلہ بھی کیا کہ نئی قومی اسمبلی میں نشستوں کی تقسیم آبادی کی بنیاد پر ہو گی۔ چنانچہ اس طرح بنگالیوں کو اپنے

سامنے ایک بھرپور موقع دکھائی دیا کیونکہ اس وقت مشرقی پاکستان کی آبادی مغربی پاکستان سے زیادہ تھی۔ چونکہ نئی وجود میں آنے والی اسمبلی کا پہلا اہم فریضہ ایوب کے مسترد کردہ آئین کی جگہ نئے آئین کی تشکیل کرنا تھا، اس لئے بہت سی چیزوں کا انحصار نتائج پر تھا۔ تاہم مشرقی پاکستان کی زیادہ نشستوں کے باوجود یحییٰ خان اور انتخابات میں حصہ لینے والے مغربی پاکستان کے دوسرے سیاستدان جن میں ذوالفقار علی بھٹو پیش پیش تھے ایسے ملے جلے نتائج کی توقع کر رہے تھے جن کا فائدہ دونوں حصوں میں سے کسی کو بھی نہیں ہوگا۔ مگر جب آخر کار 1970 کے آخر میں نتائج سامنے آئے تو مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے مشرقی پاکستان سے ماسوائے دو نشستوں کے باقی ساری نشستیں جیت لیں اور یوں اسے نئی اسمبلی میں مطلق اکثریت حاصل ہوگئی۔

چنانچہ مغربی پاکستان نے ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتے ہوئے نتائج کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ یحییٰ نے بھٹو کو شہ دیتے ہوئے نئی اسمبلی کا اجلاس بلانے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ پہلے مجیب اس امر کی یقین دہانی کروائے کہ وہ نئے آئین میں اپنے چھ نکات داخل نہیں کرے گا۔ مجیب اس کے لئے تیار نہیں تھا اور یہاں سے حالات مزید بگاڑ کی طرف چل پڑے جن کا نتیجہ مشرقی پاکستان میں بغاوت اور فوج کی طرف سے باغیوں کو کچلنے کے لئے ایک خون آشام دھاوے کی صورت میں نکلا۔ چنانچہ اس صورتحال میں مشرقی پاکستان سے بہت سے باشندے سرحد پار کر کے انڈیا فرار ہوگئے۔ مہاجرین کی یلغار سے بوکھلا اٹھنے کے ساتھ ہی اپنے تکلیف دہ ہمسائے کو سبق سکھانے کا موقع دیکھتے ہوئے انڈیا نے مداخلت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ اس صورتحال کے نتیجے میں ہونے والی جنگ میں جو کہ تقسیم کے بعد دونوں ملکوں کے درمیان تیسری جنگ تھی، انڈیا نے بنگال میں محصور ہو کر رہ جانے والی پاکستانی فوج کو شکست سے دوچار کرتے ہوئے 90,000 سے زائد پوری کی پوری مورچہ بند فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ انہوں نے کشمیر پر جلد بازی میں کئے جانے والے اس حملے کو بھی ناکام بنا دیا جس کا مقصد بھارتی فوج کی توجہ مشرقی پاکستان سے ہٹانا تھا۔ ان واقعات کے نتیجے میں بنگلہ دیش کے نام سے ایک نئی قوم وجود میں آگئی۔ پاکستانی فوج کو اپنا وقار پہلی مرتبہ مجروح ہوتا نظر آیا اور یحییٰ خان کو بطور فوجی سربراہ و صدر پاکستان استعفیٰ دینے پر مجبور ہونا پڑا۔ چنانچہ ایک نئے کٹے پھٹے ملک میں اس خلاء کو پر کرنے کے لئے سب سے نمایاں و مقبول رہنما ذوالفقار علی بھٹو کو آگے آنا پڑا۔

بھٹو جن کی پیپلز پارٹی نے مغربی پاکستان سے بھاری اکثریت حاصل کی تھی، پاکستان میں سیاسی اقتدار کی بلندی پر پہنچنے والا مقامی جاگیردار اشرافیہ کا پہلا نمائندہ تھا۔ وہ وزارت خارجہ میں وزارت کے ذریعے سرکاری ایوانوں میں داخل ہوا تھا اور تیزی سے ترقی کے مدارج طے کرتا ہوا وزیر خارجہ بننے سے قبل کئی وزارتوں کی سربراہی کر چکا تھا۔ اس کا شہرت کی بلندیوں تک پہنچنا اپنے طبقے کی بحیثیت مجموعی نمائندگی کے مترادف تھا کیونکہ اس کے مرّبی ایوب خان کا اپنی حکومت کے لئے سیاسی جماعت کے حصول کی خاطر مغربی پاکستان کی مقامی شخصیات پر انحصار بڑھتا جا رہا تھا۔ کنونشن مسلم لیگ میں بہت سے لوگوں نے شمولیت اختیار کر لی تھی جو کہ ایوب خان نے قریب المرگ مگر اصل مسلم لیگ کی فوج نواز جانشین کے طور پر تیار کی تھی۔ بھٹو اگرچہ جاگیردار خاندان سے تھا مگر وہ اپنے دور کے تقاضوں سے بخوبی آگاہ تھا۔ جہاں ایوب کاروباری طبقے کا نمائندہ تھا، وہاں بھٹو تیسری دنیا کا سوشلسٹ نمائندہ تھا۔ جہاں ایوب امریکہ نواز تھا، وہاں بھٹو چین نواز تھا اور اس نے پاکستان کو غیر جانبدار تحریک (NAM) میں شامل کر دیا تھا۔ ایک کرشماتی مگر بے رحم شخصیت کا مالک وہ اتنا ہی تحکم آمیز مزاج رکھتا تھا جتنا کہ کسی فوجی آمر کا ہوتا ہے۔ اس نے ایک بچے کھچے نئے پاکستان میں طاقت کے دیگر مراکز کو محدود تر کر دینے یا اپنے زیر اختیار رکھنے کی شعوری کوشش کی مگر اسے یہ دیکھ کر سخت کوفت ہوئی کہ ان کے بغیر نظام حکومت چلانا آسان نہیں تھا۔ اس نے سول سروس کی از سر نو تنظیم کر کے، بہت سے افسران اعلیٰ کو برخواست کرتے ہوئے اس کا حجم کم کر دیا مگر اسے جلد ہی احساس ہو گیا کہ وہ جن صنعتی اور مالیاتی اداروں کو قومیانے پر تلا ہوا تھا ان کو چلانے کے لئے اسے افسر شاہی کی ضرورت تھی۔ اس نے اپنی پیرا ملٹری فورس بنا کر پہلی سے ہی شکست خوردہ فوج کا حجم مزید کم کرنے کی کوشش کی، مگر اسے جلد ہی یہ اندازہ ہو گیا کہ بلوچستان میں علیحدگی کی تحریک کو کچلنے کے لئے فوج کی ضرورت تھی۔ یوں اس مداخلت کی بدولت فوج کے اعتماد اور طاقت دونوں میں اضافہ ہوا۔ 1972 میں اس نے انڈیا کے ساتھ مقابلہ کرتے ہوئے ایک ایٹمی پروگرام کی بنیاد رکھنے کا نتیجہ خیز فیصلہ کیا۔ اور اگرچہ اس کی سوشلسٹ مقبولیت اداروں کو قومیانے کے جنون نے اسے غریب اور محروم طبقات کی حمایت سے نواز تاہم اس کی اپنی پالیسیوں کی بدولت پاکستانی معیشت کو ایسا ناقابل تلافی نقصان پہنچا کہ وہ آج تک بحالی کی راہ پر گامزن نہیں ہو سکی۔

1977 میں ہونے والے قومی انتخابات میں جو کہ بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے چھ برس بعد ہوئے تھے، پیپلز پارٹی نے ناقابل یقین حد تک بھاری اکثریت حاصل کر لی تھی۔ چنانچہ دھاندلی کے الزامات کی بوچھاڑ میں پورے ملک میں ایک تشدد سے بھرپور احتجاجی تحریک شروع ہوگئی جس میں سارے کے سارے سیاسی مخالفین شامل ہو گئے اور فوج کو قائل کیا گیا کہ اس کی مداخلت ناگزیر ہوگئی ہے۔ بھٹو کو اقتدار سے ہٹا کر جیل میں ڈال دیا گیا اور بعد ازاں بڑی آسانی سے دریافت کردہ الزامات قتل عائد کر کے اسے پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔ اس کے زوال میں اہم کردار جنرل ضیاء نے ادا کیا تھا جو کہ ایسا ناشکرا فوجی تھا جسے بھٹو نے کئی سینیئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے فوج کا سربراہ بنایا تھا۔ کہا جاتا ہے کہ بھٹو نے اس کے خوشامدانہ طرز عمل سے متاثر ہو کر اسے فوج کی سربراہی عنایت کی تھی جو کہ بعد ازاں ایک مہلک غلطی ثابت ہوئی۔ اگرچہ جنرل ضیاء پاکستان کو ایک مختلف راستے پر لے گیا مگر بھٹو بھی اپنے پیچھے ایک قابل ذکر ورثہ چھوڑ گئے تھے۔ اگرچہ اس کی سوشلسٹ پالیسیاں اپنے عہد کے تقاضوں سے مطابقت نہیں رکھتی تھیں مگر وہ اپنے جاگیردرانہ پس منظر کے ساتھ اس طرف پہلے ہی بڑی ثابت قدمی سے گامزن ہو چکا تھا۔ ہر طرف سے بڑھتی ہوئی مخالفت میں گھر جانے کے بعد اس نے حمایت و تعاون کے لئے اپنے ساتھی جاگیرداروں سے ہی رجوع کیا جنھوں نے تازہ تازہ قومیائے گئے بنکوں سے بہت سستے قرضے حاصل کر رکھے تھے۔ تیسری دنیا کے دوسرے ممالک کی طرح قومیائی گئی صنعتوں کی بدولت حکومت کے پاس اچھے خاصے وسائل جمع ہو گئے جو کہ سیاسی تعاون حاصل کرنے کا بہترین وسیلہ ثابت ہوئے۔ یوں یہ حکمت عملی بعد ازاں پاکستانی سیاست کا ایک اہم جزو بن کے رہ گئی۔

تاہم بھٹو کا سب سے اہم ورثہ کوئی پالیسی یا پروگرام نہیں بلکہ خود اس کے اپنے سماجی و اقتصادی طبقے کا عروج تھا۔ اس کے دور حکومت میں نہ صرف پنجاب اور سندھ کے روایتی جاگیردار طبقے کی طاقت میں اضافہ دیکھا گیا بلکہ اس کے ساتھ ہی ایک ایسا نیا مالدار شہری صنعتی طبقہ بھی ابھر کر آیا جس کے اندر سے نکلنے والی قیادت اسی روایتی جاگیردارانہ سیاست کی پیروکار بن گئی۔ خود اس کی اپنی سیاسی جماعت نے اس کی بیٹی بے نظیر بھٹو کی قیادت میں اس کے دقیانوسی قسم کے سوشلزم کو مسترد کر دیا اور پاکستانی سیاست میں لاہور کے صنعت کار نواز شریف کی جماعت کے ساتھ جس نے کہ مسلم لیگ کا نام غصب کر لیا تھا، مرکزی مقام حاصل کر لیا۔ تاہم یہ مسلم لیگ جناح

MashalBooks.org

والی مسلم لیگ نہیں تھی۔ وہ لیگ اور پاکستان جس پر اس کا راج تھا اب کہیں نہیں پائے جاتے تھے۔ نیا پاکستان جو منظر عام پر آ رہا تھا برصغیر کے مسلمانوں کا وہ عظیم الشان وطن نہیں تھا جس کا جناح نے خواب دیکھا تھا بلکہ صحیح معنوں میں اس کی تبدیل شدہ شکل جس پر ان دو سیاسی گروہوں کا قبضہ تھا جو پہلے سے ہی اپنے وطن میں جڑیں پکڑ چکے تھے۔

ان میں سے ایک تو ان دولت مند زمینداروں اور ان کے صنعتی اہم منصوبوں پر مشتمل سویلین سیاسی جماعت تھی جو ایک ایسی مخصوص طرز کی سیاست کرنے لگی جس کا براہ راست ماخذ ان کا جاگیردارانہ ماضی تھا۔ دوسرا گروہ، یعنی فوج، جس کی قیادت کافی حد تک ایک کم تر وسائل کے مالک طبقے سے ابھری تھی، اس تصوراتی صورتحال کے خلاف جس کو وہ مشتمل بھارتی خطرہ کہتی ہے قوم کے محافظین کے طور پر اپنے خودساختہ عظیم یا مقدس مقاصد کی پیروی میں مصروف رہتے ہوئے اپنے سے برتر سویلین سیاستدانوں کو لگام ڈال کر رکھنے لگی۔ عزائم میں پرجوش مگر قوت مشاہدہ سے محروم یہ دو گروہ پاکستان کو جہاد کے دور میں لے جاتے ہیں۔

2

جاگیردار اور فوج

پاکستان میں جاگیردارانہ ثقافت پر اپنی تحقیق کے دیباچے میں سماجی ماہر بشریات سٹیفن لیون ملک آصف نام کے ایک دیہاتی زمیندار کا قصہ بیان کرتا ہے۔ یہ دریائے سندھ کے کنارے پر پنجاب کے ضلع اٹک کا ایک روشن دن ہے۔ ایک دن جب کہ اس کے پاس کوئی اور مصروفیت نہیں ہوتی وہ مقامی دیہاتیوں کے لئے وقتاً فوقتاً صبح سویرے لگائی جانے والی پنچایتوں میں سے ایک پنچایت لگانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ اس مخصوص صبح اسے دو آدمی ملنے آتے ہیں۔ ان میں سے ایک تو بوڑھا مزارع (Share cropper) بابا رحیم ہے جو آصف کے باپ کے لئے اس وقت سے زمین کاشت کرتا آ رہا ہے جب ملک ایک لڑکا ہوتا تھا اور اب وہ آصف کے چچا کی زمینیں کاشت کرتا ہے۔ وہ ملک آصف کے پاس ایک ایسا پیچیدہ فارم پر کروانے کے لئے آیا ہے جو اس کے بیٹے کا شناختی کارڈ بنوانے کے لئے ضروری ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے جو بابا رحیم اور اس کا بیٹا اپنے طور پر شاید اس لئے نہیں کر سکتے کیونکہ وہ دونوں ان پڑھ ہیں۔ بابا رحیم ملک آصف کے پاس اس لئے آیا ہے کیونکہ اس کا موجودہ مالک ملک آصف کا چچا اس سے ناراض ہے کہ اس نے اس کی کچھ زمینوں پر کام کرنے سے انکار کر دیا ہے اور اب سزا کے طور پر اس کی مدد نہیں کر رہا تھا۔ بابا رحیم کو امید ہے کہ ملک آصف اس کا کام کر دے گا کیونکہ وہ اس کے باپ کے لئے بہت عرصہ تک وفاداری سے خدمات انجام دیتا رہا تھا۔

دوسرا آدمی ایک ہمسایہ زمیندار ہے جس کا نام ظہیر خان ہے۔ اس کے چچا نے جو وہاں سے دور کچھ فاصلے پر دوسرے ضلع میں رہتا ہے اسے کہا ہے کہ وہ اس کے گاؤں کے ایک شخص کو

مزارعت کا کام ڈھونڈنے میں مدد دے۔ظہیر خان اپنے چچا کی مدد کرنے کے لئے اس آدمی کی خدمات خود اپنے طور پر اس لئے حاصل نہیں کرسکتا کیونکہ اس کے پاس کاشت کے لئے کوئی فالتو زمین نہیں ہے۔مگر اسے پتہ چلا ہے کہ ملک آصف کو اپنی کئی ایکڑ زمین کاشت کرنے کے لئے ایک عدد مزارع درکار ہے۔اس نے اس کی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس کو ایک فائدہ پہنچانے کا فیصلہ بھی، یعنی مدد کی ایک ایسی پیش کش جس کے مطابق وہ یہ سمجھتا ہے کہ وہ اپنے چچا کے خاندانی احسان کا بدلہ اتارنے کے قابل ہوجائے گا۔اسے اس امر کا کوئی اندازہ نہیں ہے کہ آیا اس کے چچا نے جس آدمی کی سفارش کی ہے اسے اس کام میں مہارت بھی حاصل ہے کہ نہیں۔اگر وہ اپنے کام میں اچھا نکل آیا تو ملک آصف اس سے خوش ہوجائے گا۔اور اگر اسے کام میں اتنی مہارت نہ بھی ہوئی تو زیادہ فرق نہیں پڑے گا کیونکہ ملک آصف کو ایک آدمی کی سخت ضرورت ہے اور اکثر مزارعین اپنے کام میں اتنے ماہر نہیں ہوتے۔

ملک آصف بابا رحیم کی مدد کرنے پر آمادہ دکھائی دیتا ہے باوجود اس حقیقت کے کہ اس کا چچا اس بات پر اس سے ناراض بھی ہوسکتا ہے کیونکہ وہ اس کے خاندان کے ساتھ طویل عرصہ تک تعلقات رکھنے کے باعث اپنے دل میں اس کے لئے وفاداری کے خاص جذبات رکھتا ہے۔وہ ظہیر خان کے سفارش کردہ آدمی کو بھی رکھ لیتا ہے کیونکہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ ہو سکتا ہے اس آدمی کو کام نہ آتا ہو مگر اسے کسی کارکن کی شدید ضرورت ہے جو اس کی فالتو زمینوں پر کام کرسکے اس لئے وہ اپنے ہمسایہ زمیندار کو خوش کرنے کا موقع ضائع نہیں کرتا ہے۔

لیون حقیقی زندگی کے اس مختصر واقعہ کو اس حقیقت کی وضاحت کے لئے بیان کرتا ہے کہ پاکستان کی جاگیردارانہ ثقافت کی تہہ میں باہمی احسانات پر مبنی رشتے کام کررہے ہوتے ہیں۔پاکستانی جاگیردارانہ ثقافت میں رہنے والے افراد ایک دوسرے پر احسانات کے ایسے سلسلوں میں منسلک رہتے ہیں جن کی بالکل واضح نوعیت کا تعین ان مختلف کرداروں سے ہوتا ہے جو ہو مجموعی سماجی ڈھانچے کے اندر رہ کر خلا پر کرتے ہیں۔اگرچہ ملک آصف سماجی درجے میں بابا رحیم سے برتر ہے مگر اس کے باوجود وہ اس کے ساتھ احسان کے رشتے میں بندھا ہوا ہے۔اس کے برعکس ظہیر خان مرتبے میں اس کے برابر ہے مگر ان میں سے ہر ایک دوسرے کے ساتھ مثبت تعاون پر آمادہ نظر آتا ہے یعنی فائدہ حاصل کرنے اور فائدہ پہنچانے پر۔ملک آصف کو فائدہ

پہنچانے کی کوشش کرتے ہوئے ظہیر خان نے نہ صرف اپنے ہمسائے کو یہ جواز فراہم کردیا ہے کہ وہ بعد میں اس احسان کا بدلہ اتار دے بلکہ اس نے اپنے چچا کے لئے جو فرض محسوس کیا تھا وہ بھی پورا کر دیا جو کہ اب اس کا احسان مند ہونے کی بناء پر جوابی طور پر اس کی مدد کرنے پر بھی تیار رہے گا۔ یہ فائدہ پہنچانے اور احسان مند ہونے کی روایت پاکستان کے جاگیردارانہ معاشرے کا ایک اہم عنصر ہے۔

ملک آصف، اپنے ساتھی زمینداروں کی طرح، باہمی توقعات اور احسانات کے ایک مقامی سلسلے کی بالائی کڑیوں سے منسلک ہے، اس کی مزارعین یا پٹے دار اس امر کے پابند ہیں کہ اس کی زمین کی کاشت کے حقوق کے بدلے اسے اپنی فصل میں سے کچھ حصہ دیتے رہیں۔ اسی طرح جوابی طور پر وہ بھی اس امر کا پابند ہے کہ انہیں کھانا اور ایسی دوسری ضروریات زندگی بھی فراہم کرتا رہے جو کہ وہ خود اپنے طور پر پوری نہیں کر سکتے اور اس کے علاوہ کبھی کبھار کوئی اور مشکل آجائے تو اس میں بھی ان کی مدد کرے۔ اگرچہ زمیندار اور اس کے مزارعوں کے درمیان مربی۔ طفیلی کا یہ رشتہ جاگیردار پاکستانی معاشرے کا ایک ضروری جزو ہے مگر کسی طرح سے بھی واحد جزو نہیں ہے۔ ہر زمیندار خاندانی تعلقات کے ایک وسیع تر سلسلے بھی منسلک ہے۔ وہ ان بیٹوں کا باپ بھی ہے جو اس کے لئے اطاعت اور وفاداری کے جذبات رکھتے ہیں۔ خود اپنی ہی نسل یا برابر کے رشتوں کے اندر وہ چھوٹے، بڑے بھائیوں اور رشتہ داروں پر مشتمل ایک سماجی سلسلہء مراتب سے بھی جڑا ہوا ہے۔ اور وہ خود اپنے والد، چچاؤں/ماموؤں، دادا/نانا اور تایا وغیرہ کی عنایتوں کا بھی طلبگار رہتا ہے جو سب کے سب پدرانہ کنبے کے اس سے بھی وسیع تر ایک ایسے سلسلے سے منسلک ہیں جسے پاکستان میں برادری کہا جاتا ہے۔ برادری کے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ باہمی توقعات اور احسانات کے خود اپنے منفرد سلسلوں کے ذریعے جڑے ہوئے ہیں جن میں باہمی تعاون وحمایت اور بسا اوقات مخالف و مسابقت کے انداز یا قرینے شامل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ ملک آصف اور ظہیر خان کی مثال سے ظاہر ہوتا ہے، اس طرح کے مربوط سلسلے کھیت اور خاندان سے آگے جا کر ہمسایہ زمینداروں اور گاؤں کے اندر برادری کی اہم شخصیات تک جا ملتے ہیں۔ یہ باہم پیوست یا مربوط سلسلے مل کر پاکستان کی دیہی زندگی کے بنیادی ڈھانچے کی تشکیل کرتے ہیں۔

طاقت پر مبنی رشتے اس ڈھانچے کے بنیادی عناصر میں شمار ہوتے ہیں۔ اگرچہ ایک

زمیندار اپنے مزارعین کے ساتھ احسان کے رشتے میں بندھا ہوتا ہے مگر وہ ان سے زیادہ طاقتور ہوتا ہے اور ان کو اپنے تابع فرمان رکھتا ہے۔ طاقت اور سماجی رتبے کی ایک منفرد (Nuclear) خاندان اور وسیع معنوں میں ایک برادری کے اندر بھی مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ باپ اور چچا/ماموں زیادہ بااثر ہوتے ہیں اور بیٹوں و بھانجوں/ بھتیجوں سے زیادہ اختیارات رکھتے ہیں۔ اکثر اوقات برادری کا ایک بزرگ فرد کنبے یا قبیلے کا سربراہ تسلیم کرلیا جاتا ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ بعض زمیندار اپنے ہمسایہ زمینداروں سے زیادہ طاقتور ہوتے ہیں اور اپنے علاقوں میں زیادہ سماجی اثر ورسوخ رکھتے ہیں۔ ایک زمیندار کی طاقت اور سماجی درجے کا انحصار صرف اس امر پر نہیں ہوتا کہ اسے اپنے باپ سے کتنی زمین ورثے میں ملی ہے بلکہ ان زمینوں کو غصب ہونے سے بچائے رکھنے کی صلاحیت اور ان میں مزید اضافہ کرنے کی استطاعت پر بھی ہوتا ہے۔ ازل سے یہ دستور چلا آ رہا ہے کہ سب سے زیادہ کامیاب زمینداروں کا مرتبہ اور اثر ورسوخ اپنے مقامی علاقوں کی تنگ حدود سے بہت آگے تک پھیلا ہوتا ہے۔

چنانچہ یہ تصور کرنا اتنا مشکل نہیں ہے کہ اس طرح کی روایات انتخابی سیاست کے تقاضوں سے کس طرح مطابقت پیدا کر لیتی ہوں گی۔ ایک برادری مقامی انتخابات میں بھی اپنی ہی ذات/قبیلے کے لوگوں کی حمایت کرے گی اور ہمسایہ برادریوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کر کے بڑے پیمانے پر ضلعی سطح کے انتخابات میں بھی اپنی پسند کے امیدوار کو جتوانے کی کوشش کرے گی۔ ملک آصف اور ظہیر خان نہ صرف ایک دوسرے کے کام آنے والے شناسا لوگ ہیں بلکہ سیاسی حلیف بھی ہیں۔ علاقائی اور قومی سطح پر سیاسی اتحاد برادریوں کے اس سے بھی وسیع تر ایسے مربوط سلسلوں کی نمائندگی کرتے ہیں جو سیاسی جماعتوں کی تشکیل کی صورت میں اختتام پذیر ہوتے ہیں۔ ایک لحاظ سے سخت عملی مفہوم میں سیاسی جماعتوں کی تشکیل نیچے سے اوپر کی طرف نہیں ہوتی بلکہ اوپر سے نیچے ہوتی ہے، جس طرح ذوالفقار علی بھٹو یا نواز شریف ایسے علاقائی اور مقامی دھڑوں کے سربراہوں تک رسائی رکھتے تھے جو کہ خود اپنے اپنے علاقائی اور مقامی سلسلوں کی اوپری کڑیوں سے منسلک ہیں۔ یہ کوئی نئی روایت نہیں ہے۔ جیسا کہ باب نمبر 1 میں ذکر کیا گیا ہے، پنجاب میں 1937 میں ہونے والے علاقائی انتخابات میں جاگیرداروں نے مسلم لیگ کو ذلت ناک شکست سے دوچار کیا تھا۔ انہوں نے یونینسٹ پارٹی کے جھنڈے تلے انتخاب لڑا تھا اور اپنے چکرائے

ہوئے مخالفین کو مات دینے کے لئے برادری اور دوسرے منسلک اتحادوں کو استعمال کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

یہ بالکل وہی جاگیردارانہ اتحاد تھے جنہوں نے بعدازاں یونینسٹ پارٹی کو چھوڑ کر کئی برس بعد اس وقت مسلم لیگ میں شمولیت اختیار کر لی تھی جب انہیں یہ واضح ہو گیا تھا کہ برطانوی ہندوستان کی تقسیم کے نتیجے میں برصغیر کے مسلمانوں کا ایک نیا ملک ظہور میں آنے والا ہے۔ 1946 کے علاقائی انتخابات میں مسلم لیگی جھنڈے کے نیچے انتخاب لڑتے ہوئے انہوں نے زبردست فتح حاصل کر لی تھی اور آزادی کے بعد بھی نئی آئین ساز اسمبلی کے مغربی پاکستانی ارکان کی عظیم اکثریت انہی لوگوں پر مشتمل تھی۔ اگرچہ پاکستان کے معرض وجود میں آنے کے بعد کے پہلے دو عشروں کے دوران یہ سیاسی طور پر مغلوب رہے، پہلے مہاجر طبقے کے اثر سے اور بعد میں فوج کی طاقت کے نیچے، تاہم آخر کار مشرقی پاکستان کی بنگلہ دیش کی صورت میں علیحدگی کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کے برسر اقتدار آنے کے ساتھ ہی یہ طبقہ ایک بار پھر عروج پر پہنچ گیا۔ اگرچہ بھٹو کو بعدازاں ایک اور فوجی آمر کے ذریعے اقتدار سے باہر پھینک دیا گیا، مگر اس وقت تک ایک جاگیردار سیاسی طبقہ فوجی حکمرانی کے متبادل کے طور پر اپنے قدم جما چکا تھا۔ بے نظیر بھٹو اور اس کے سب سے اہم حریف نواز شریف نے جنرل ضیاء کی موت کے بعد جس طرزِ سیاست کو فروغ دیا وہ جاگیردارانہ نوعیت کی تھی اور حتیٰ کہ فوج بھی خود کو ناگزیر طور پر اس طرف کھنچی ہوئی محسوس کر رہی تھی۔

پاکستان کی بڑی بڑی سیاسی جماعتوں کو بہترین طور پر مربیانہ روابط کی کڑیوں پر مشتمل ایک ایسا سلسلہ سمجھا جا سکتا ہے جن کا سیاسی مقصد عہدے حاصل کرنا ہوتا ہے جن کو پھر اپنے طفیلی مصاحبوں میں تقسیم کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو کی وفات کے بعد سیاست کے میدان میں دو سیاسی جماعتیں چھا گئی ہیں۔ اس کی قائم کردہ پیپلز پارٹی ان میں سے ایک ہے جس کی سربراہی دسمبر 2007 میں قتل ہو جانے سے قبل بے نظیر بھٹو کے پاس تھی، دوسری جماعت نواز شریف کی پاکستان مسلم لیگ ہے۔ نواز شریف کو اس وقت شہرت ملنی شروع ہوئی جب جنرل ضیاء نے اسے پنجاب کے سب سے بڑے انتظامی منصب یعنی وزارت اعلیٰ سے نواز دیا تھا۔ ان دونوں سیاسی جماعتوں کی بنیاد میں دراصل کچھ حد تک قدر مشترک پائی جاتی ہے اور وہ یہ کہ دونوں کو فوجی آمروں کی سویلین سرپرستی میں پروان چڑھایا گیا تھا۔ بھٹو کی طرف سے پیپلز پارٹی

کی بنیاداس وقت رکھی گئی جب اس نے ایوب کوخیر باد کہہ دیا تھا، جبکہ نواز شریف بے پی ایم ایل فوج کی آشیر باد سے بنائی تھی اگر چہ بعدازاں فوج کے جرنیلوں نے ایک بغاوت کے ذریعے اس کا تختہ الٹ دیا تھا۔

اوپر بیان کئے گئے واقعہ کے مرکزی کردار ملک آصف کی طرح نواز شریف اور آصف زرداری جو کہ اپنی بیوی بے نظیر کی وفات کے بعد پارٹی لیڈر بنا، باہمی توقعات اور احسانات کے ایک وسیع مربوط سلسلے کی بالائی کڑیوں سے منسلک ہیں۔ ان کے نیچے وہ طاقتور مربی طبقات آجاتے ہیں جن کا ایک اپنا اثر ورسوخ ہے اور جنہوں نے ان سیاسی رہنماؤں کی اس لئے حمایت کی ہے تا کہ وہ انہیں اس کے بدلے فوائد سے نوازیں یہ مرد اور بعض اوقات عورتیں ایسے علاقائی سلسلہ ہائے ارتباط کی سرپرستی کرتے ہیں جس کی اپنی کڑیاں نیچے برادری اور زمینداراوراس کے مزارعین کے تعلقات باہمی تک جاملتی ہیں۔ تاہم پاکستان کی سیاسی جماعتیں اس وقت یا ماضی میں بھی خالص دیہی ثقافت کی پیداوار نہیں رہیں۔ جاگیردار طرز سیاست طویل عرصے سے شہروں اور قصبوں میں سرایت کر چکی ہے اور حالیہ عشروں میں شہرت کے عروج پر جانے والے دولت مند سیاستدانوں نے کاروبار کے جاگیردارانہ اطوار پوری طرح اپنا لئے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال خودنواز شریف ہے جیسے اپنے باپ کی طرف سے ٹیکسٹائل کے کارخانوں اور لوہے کی بھٹیوں پر مشتمل ایک بہت بڑی صنعتی سلطنت عطا ہوئی تھی۔ یہی مثال چوہدری شجاعت کی ہے جس نے فوجی سربراہ جنرل پرویز مشرف کی طرف سے1999 میں نواز حکومت کا تختہ الٹ دیئے جانے کے بعد مسلم لیگ کے اپنے تشکیل کردہ دھڑے کی قیادت سنبھال رکھی ہے۔ ان کے مربیانہ سلسلوں کی کڑیاں نیچے شہروں میں واقع کارخانوں اور دوکانوں سے لے کر دیہات کے کھیتوں اور کھلیانوں تک جاملتی ہیں۔

انتخابی سیاست فطری طور پر مسابقت کی حامل ہے جاگیرداری سیاسی نظام میں جو اس وقت پاکستان میں فروغ پا چکا ہے، سیاسی جماعتیں اوران کے انفرادی امیدوار سیاسی عہدوں سے حاصل ہونے والے فوائد میں دوسروں کو بہتر طور پر شریک کرنے کے وعدوں کے ذریعے نہ کہ خالص مقابلے کے ذریعے حمایت وامداد حاصل کرتے ہیں، اور حتیٰ کہ انتہائی بنیادی سطح پر بھی اگر اس کا مطلب کسی مزارع کی مدد کرنے یا کسی کارخانے کے ملازم کے مقررہ تاریخ گزر جانے کے

بعد واجب الادا بجلی کے بل کی ادائیگی جیسے کاموں سے ذرا زیادہ اہم کام کروادینا ہی کیوں نہ ہو۔اپنے گاؤں کے ملک آصف کی طرح، بہت سے سیاستدان باقاعدہ عوامی اجلاس منعقد کرتے ہیں جہاں ان کے حلقے کے لوگ اپنے مسائل کے حل کے لئے آسکتے ہیں۔قومی اور صوبائی حلقوں کے بہت سے امیدوار ایک یا ایک سے زائد مربیانہ سلسلوں کی معاونت پر انحصار کرسکتے ہیں جن کے لئے پاکستانی ووٹ بنک کی اصطلاح استعمال کرنا پسند کرتے ہیں۔ یہ روایتی طور پر ایک مخصوص سیاسی جماعت کے گرد گھومتے ہیں،اس انداز میں کہ ان جماعت کا کوئی بھی امیدوار اس جماعت کو ووٹ بنک کی حمایت پر انحصار کرسکتا ہے۔ چونکہ پاکستان میں جاگیردارانہ طرز کی سیاست خاندانی بادشاہت کے اصولوں کے مطابق چلنے کا رجحان رکھتی ہے،اس لئے بہت سی اہم جماعتیں روایتی طور پر ایک مخصوص خاندان کے ساتھ وابستہ ہونے کے ساتھ ہی اس کے غلبے تلے کام کرتی ہیں۔ پیپلز پارٹی پر بھٹو خاندان کا غلبہ ہے۔ یہ بے نظیر بھٹو کے قتل کے وقت اس کی ذاتی شخصیت کے سحر میں اس قدر گرفتار تھی کہ بعض مبصرین کو لگ رہا تھا کہ شاید پارٹی اس نقصان سے جانبر نہیں ہوسکے گی۔تاہم بے نظیر کے رنڈوے آصف زرداری اوران کے انیس سالہ بیٹے بلاول کو، جو کہ اس وقت برطانیہ میں زیر تعلیم تھا، پارٹی کی مشترکہ کمان سونپ کراسے زوال پذیر ہونے بچالیا گیا۔زرداری کو اتنے بڑے عہدے پر اس حقیقت کے باوجود فائز کردیا گیا کہ اسے ان حریفانہ بدعنوانیوں کی بناء پر ہمیشہ تضحیک کا نشانہ بنایا جاتا تھا جن کی بناء پر عوام نے اسے مسٹر ٹین پرسنٹ کا خطاب دے دیا گیا تھا۔

اس طرح پی ایم ایل کے نوازشریف دھڑے پر بھی (جو کہ پی ایم ایل۔ن؛ن برائے نواز کے طور پر معروف تھا) مکمل طور نوازشریف اور اس کے چھوٹے بھائی شہباز شریف کا غلبہ ہے۔ یہ دھڑا اس وقت زوال پذیر ہوگیا جب ان دونوں کو مشرف بغاوت کے بعد سعودی عرب جلاوطن کردیا گیا تھا۔تاہم 2007 میں وطن واپسی کی اجازت ملنے کے بعد اس کی بحالی کے عمل میں تیزی آگئی۔ جبکہ وہ جلاوطن تھے تو اس وقت ان کی جماعت کی قیادت عارضی طور پر ایک اور دھڑے (معروف بنا پی ایم ال ق؛ق برائے قائداعظم) کے ہاتھوں عدم استحکام کا شکار ہوگئی جس میں چوہدری شجاعت کی قیادت میں جماعت کے ممتاز رہنما شامل تھے جنہوں نے بغاوت کے بعد بننے والی نئی حکومت کا ساتھ دینے کا فیصلہ کرلیا تھا۔تاہم خود چوہدری دھڑے کی مقبولیت میں اس

وقت کمی آ گئی جب شریف برادران کی واپسی پر مشرف کی اپنی ساکھ کے متاثر ہونے کے ساتھ ہی اس کے بہت سے حواری اپنے مربیانہ روابط کے سلسلوں کے ساتھ دوبارہ نواز شریف کے ساتھ مل گئے۔ اگرچہ تمام بڑی جماعتوں میں سے ہر ایک کے پاس ایک اپنا غیر متزلزل حلقہء حمایت موجود ہے، تاہم چوہدری دھڑے نے پاکستانی سیاست میں چالبازیوں کے کردار کو عیاں کر کے رکھ دیا ہے۔ سیاسی روابط رکھنے والے دھڑے اور انفرادی سیاست دان بڑے کائیاں پن سے اپنے مفادات کو سامنے رکھ کر اکثر و بیشتر اپنی وفاداریاں بدلتے رہتے ہیں۔

مربّیانہ رویوں اور ذاتی مفادات پر مبنی سیاست میں یہ سب کچھ کرنا اس لئے آسان ہوتا ہے کیونکہ بنیادی طور پر فیصلہ نظریاتی بنیادوں پر نہیں بلکہ تنگ نظر قسم کے ذاتی مفاد کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے۔ اگرچہ جاگیردارانہ معاشرے میں وفاداری ایک واضح عنصر ہوتی ہے، مگر سیاسی رہنما اور انفرادی سیاست دان آخر کار صرف انتخاب جیتنے اور کسی حد تک ریاستی وسائل تک رسائی جیسے مقاصد سے تحریک پاتے ہیں۔ ایک جماعت چھوڑ کر دوسری جماعت میں شمولیت یعنی تیزی سے وفاداریاں تبدیل کرنے کا سلسلہ اس حد تک شدت اختیار کر گیا تھا کہ اپنے دوسرے دور حکومت میں نواز شریف نے وزیر اعظم کے طور پر اپنی پارلیمانی اکثریت کو استعمال کرتے ہوئے صوبائی اور قومی اسمبلی کے ارکان کے وفاداریاں تبدیل کرنے کے عمل کو آئینی ترمیم کے ذریعے غیر قانونی قرار دے دیا تھا۔ کہنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بڑی جماعتوں کے درمیان کوئی نظریاتی اختلافات ہی نہیں پائے جاتے۔ پی پی پی اپنے سوشلسٹ نظریات کی صرف نام نہاد ہی دعویدار ہے، اگرچہ عملی طور پر اس کا مطلب صرف یہ بنتا ہے کہ سماجی اور مذہبی معاملات کے حوالے سے ذرا زیادہ روشن خیالی کا مظاہرہ کیا جائے۔ پی ایم ایل نواز اور چودھری دھڑے کے ارکان سماجی اور مذہبی رویوں میں ذرا قدامت پسندی کا مظاہر کرتے ہیں، اور جب تک کہ نواز شریف نے اس رویے کی مذمت نہیں کر دی اس وقت تک وہ فوج کی بھی قریبی حمایت اور اس سے تعلق کا مظاہرہ کرتے رہے۔

پاکستان کی سیاست بدنامی کی حد تک بے رحم مقابلہ بازی کی عکاس ہے جس میں کہ بڑی سیاسی جماعتیں سیاسی سرپرستی یا تعاون کے حصول کے لئے مقابلے کے دوران ایک دوسرے کو کھوکھلا کرنے کی کوششوں میں مصروف رہتی ہیں۔ اقتدار سے باہر رہ جانے والی جماعتیں اور

سب کچھ ہوتی ہیں مگر ایک وفادار یا پرخلوص حزبِ مخالف نہیں ہوتیں، چاہے ان کی ترکیب کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ اپنے مربیانہ جذبوں کی تسکین کے لئے پانچ برس انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتیں اور یوں اسی طرح کے طرزِ عمل کا مظاہرہ کرتی ہیں۔ دوسری طرف برسرِاقتدار جماعتیں بھی شکست خوردہ مخالفین کو امن اور چین سے نہیں بیٹھنے دیتیں۔ کچھ برسوں سے اپنے مخالفین پر بدعنوانی کے الزامات عائد کرنا ایک پسندیدہ حربہ بن چکا ہے۔ دوسری مرتبہ وزیراعظم بننے پر نواز شریف کی طرف سے قائم کیا جانے والا احتساب بیورو تو اس حوالے سے خاصہ بدنام تھا۔ ایک بزرگ مسلم لیگی سیاست دان نے اس زمانے میں اعتراف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کی سوچ کے مطابق پاکستان کا اولین سیاسی مسئلہ برسرِاقتدار جماعتوں کی طرف سے اس طرزِ عمل کا مظاہرہ کرنے کی اہلیت کا فقدان تھا کہ ایک دن وہ خود بھی حزبِ مخالف میں آسکتی ہیں۔

پاکستانی سیاست کی مسابقانہ اور اکثر اوقات معاندانہ نوعیت کے باوجود تمام سیاست دان جس ایک نکتے پر متفق ہوتے نظر آتے ہیں وہ اپنے سماجی اور اقتصادی طبقے کی بقا کے تقاضوں کی تکمیل کی ضرورت کو مقدم رکھنا ہے۔ اس کی سب سے واضح عکاسی ان کی طرف سے انکم ٹیکس کی ادائیگی کے لئے بلاتفریق جماعتی وفاداری، متحدہ مزاحمت کی شکل میں ہوتی ہے۔ اسی طرح زرعی آمدنی پر ٹیکس کے نفاذ کی کسی بھی کوشش کی جاگیردار طبقے نے بڑی ثابت قدمی سے مخالفت کی ہے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ زراعت کے شعبے سے حاصل ہونے والی آمدنی کا خام ملکی پیداوار میں تناسب 22 فی صد ہے، اس شعبے سے صرف ایک فی صد محصولات حاصل ہوتے ہیں۔ مجھے ایک مرتبہ اس موضوع پر ایک دولت مند پنجابی خاتون زمیندار سے جو کہ ایک سیاستدان اور سابقہ وزیر بھی تھی تبادلہ خیال کا موقع ملا۔ اس نے اظہار خیال کیا اس پر اور اس کی ساتھ دوسری زمیندار عورتوں پر ان کی زمینوں پر کام کرنے والے مزارعوں کو بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے۔ اور چونکہ انہیں اتنے سارے لوگوں کا خیال رکھنا ہوتا تھا اس لئے وہ کسی قسم کا ٹیکس دینے کی استطاعت نہیں رکھتی تھیں۔ اس کی دلیل کسی حد تک تو بالکل درست تھی۔ جیسا کہ پہلے یہ نکتہ نمایاں کیا گیا ہے کہ خوراک اور دوسری ضروریات زندگی کی فراہمی اور ضرورت کے وقت امداد کرنا واقعی بہت اہم قسم کے احسانات باہمی میں شمار ہوتے ہیں جو کہ پاکستانی زمینداروں اور جاگیرداروں کی روایات کا حصہ ہیں۔

تاہم اس نظریئے کی تہہ میں کارفرما دلیل گمراہ کن نظر آتی ہے۔ بڑی بڑی جاگیریں رکھنے والے زمیندار جو پاکستان کی سیاست میں اہم مقام رکھتے ہیں، محض اپنا وجود برقرار رکھنے کی جدوجہد نہیں کر رہے خواہ معاشی صورتحال کتنی ہی نازک کیوں نہ ہو۔ وہ اپنے مزارعین کو ضروریات زندگی تو فراہم کرتے ہوں گے مگر وہ انہیں یا ان کے بچوں کو تعلیم جیسی فیصلہ کن سماجی خدمات تک رسائی فراہم نہیں کرتے۔ دوسری جگہوں کی طرح پاکستان میں بھی یہ ریاست کی ذمہ داری سمجھی جاتی ہے۔ مگر ریاست نے کبھی بھی ذمہ دارانہ طرزِ عمل کا مظاہرہ نہیں کیا۔ جیسا کہ ہم نے اس باب کے شروع میں دیکھا ہے بابا رحیم اور اس کا بیٹا دونوں ہی ان پڑھ تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بوڑھے رحیم کو اصل میں ملک آصف کی مدد کی ضرورت پیش آئی تھی۔ بدقسمتی سے بابا رحیم اور اس کے بیٹے کی مثال کوئی ایسی انوکھی بھی نہیں خاص طور پر دیہی معاشرے کے پس منظر میں۔ پاکستان میں خواندگی کی شرح صرف 57 فی صد ہے جو کہ اس لئے بھی کوئی حیران کن امر نہیں ہے کیونکہ تعلیم پر خام قومی پیداوار کا صرف 2 فی صد خرچ کیا جاتا ہے جو کہ خطے کی جس کے اندر نیپال اور بنگلہ دیش بھی آجاتے ہیں، پست ترین شرح ہے۔ اس صورتحال کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ جاگیردار ٹیکس ادا نہیں کرتے جس کے نتیجے میں ریاست کے پاس اتنے وسائل اکٹھے نہیں ہو پاتے کہ وہ عوام کی تعلیم پر خرچ کر سکے۔ تاہم یہ محض جاگیرداروں کی فرائض سے غفلت نہیں ہے۔ پاکستانی صنعتکاروں نے ٹیکس کی مزاحمت کے لئے بھی وہی جاگیردارانہ طرزِ عمل اپنایا ہے جس طرح انہوں نے جاگیر دارانہ سیاست کو اپنا شعار بنا لیا ہے۔ پرویز مشرف نے اقتدار پر قبضے کے ایک برس بعد یہ شکایت کی تھی کہ صرف ایک فیصد پاکستانی ایسے ہیں جنہوں نے کوئی انکم ٹیکس ادا کیا ہے۔ اب تازہ ترین تخمینوں کے مطابق یہ شرح 2 فی صد ہوگئی ہے۔ حتیٰ کہ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن بھی 2009 کے خزاں میں پاکستان کے دورے کے دوران یہ محسوس کرنے پر مجبور ہوگئی تھیں کہ خام پیداوار میں ٹیکسوں کا تناسب دنیا میں سب سے کم ہے۔

یہ محض دلچسپ حقائق نہیں ہیں؛ ان کے نتائج بہت اہم مضمرات کے حامل ہیں۔ پاکستان میں تعلیم کی ہر سطح پر پست شرح سرمایہ کاری عالمی، معیشت میں اس کی ناقص کارکردگی کی ایک اہم وجہ ہے۔ انڈیا میں نہرو کی طرف سے قائم کئے گئے ٹیکنالوجی کے ان پانچ اداروں کا بھی پاکستان میں کوئی مدمقابل نہیں تھا جس سے نکلنے والے گریجویٹس نے ملک کو انفارمیشن ٹیکنالوجی

MashalBooks.org

کے میدان میں آگے آگے پہنچا دیا۔ پاکستان میں 40 فیصد افرادی قوت زراعت کے شعبے میں ہی مصروف عمل چلی آ رہی ہے اور اس کی برآمدات کا زیادہ تر انحصار کم تر معیار کی ان ٹیکسٹائل مصنوعات پر ہے جو عالمی منڈی میں مقابلے کی زیادہ استعداد نہیں رکھتی تھیں۔ یہاں اس طرح کے معاشی انقلاب کے دور دور تک کوئی آثار نظر نہیں آ رہے جس نے جنوبی کوریا کو ایک نسل آگے دھکیل دیا تھا یا پھر چین اور انڈیا کو بھی ترقی کی راہ پر گامزن کیے ہوئے ہے۔ مجھے ایک بزرگ پاکستانی سفارتکار سے کئی برس قبل کی جانے والی گفتگو ابھی بھی اچھی طرح یاد ہے۔ وہ انڈیا کو اس حوالے سے تنقید کا نشانہ بنا رہا تھا کہ اس کی معیشت دورنگی ہے، یعنی ایک تو انتہائی کامیاب اور اعلیٰ معیار کی ٹیکنالوجی پر مبنی معیشت جو کہ انگلش بولنے والے طبقے کی ضروریات کے مطابق تھی اور دوسری کم سرمایہ کاری والے منصوبوں پر مبنی وہ معیشت تھی۔ تاہم اپنی موجودہ معیشت کی خستہ حالی کے باوجود 50 برس قبل پاکستان کی فی کس آمدنی سے بہت زیادہ تھی۔ تعلیم کے شعبے میں کم سرمایہ کاری کے باعث نہ صرف یہ کہ پاکستانی معیشت مفلوج ہو کر رہ گئی ہے بلکہ اس کے نتیجے میں دینی مدارس کے فروغ کی بھی براہ راست حوصلہ افزائی ہوئی ہے۔

تاہم حقیقت محض یہ نہیں ہے کہ جاگیردار سیاست دان خود غرض ہیں۔ وہ اپنے مربیانہ نوعیت کے حامل روابط کو پروان چڑھانے کے خود غرضانہ مقصد اور اپنے قلیل مدتی مفادات کے زیادہ سے زیادہ حصول پر اس قدر توجہ مرکوز کیے رکھتے ہیں کہ طویل المیعاد اقتصادی مسائل کا حل یا اہداف کا حصول انہیں بہت مشکل یا ناممکن نظر آتا ہے۔ جب کوئی سیاسی جماعت یا سیاسی جماعتوں کا کوئی اتحاد انتخابات میں فتح حاصل کر لیتا ہے تو اس کی قیادت کے سامنے جو سب سے زیادہ توجہ طلب مسئلہ ہوتا ہے وہ تعلیمی نظام کی اصلاح نہیں ہوتا بلکہ سیاسی عہدے سے حاصل ہونے والے فوائد کی اپنے طفیلیوں میں بندر بانٹ ہوتا ہے۔ دھڑوں کی قیادت یا سیاسی جماعتوں کی بانی یا سرپرست شخصیات کی نظریں اپنے مرتبے یا حیثیت کے مطابق حکومتی عہدوں اور مراعات کے حصول جیسے مقصد پر لگی ہوتی ہیں اور کابینہ کی اہم ترین وزارتیں ان کی اولین ترجیح ہوتی ہے۔ یہ مرحلہ نچلی سطح کے سرکاری عہدوں تک کی بندر بانٹ کے بعد اپنے حتمی انجام کو اس وقت پہنچتا ہے جب اقرباء پروری کے اصول کے تحت دستیاب تمام اسامیاں پر ہو جاتی ہیں۔ (آصف زرداری کی کابینہ میں ایک مرتبہ وزراء کی تعداد 60 تک پہنچ گئی تھی)۔ سرکاری لوگ پھر اثر و رسوخ اور

MashalBooks.org

وسائل تک رسائی کوخود اپنے اور اپنے مربیانہ روابط کے سلسلے سے منسلک حمایتیوں کوفائدہ پہنچانے کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

لیون اس ساری صورتحال کواچھی طرح واضح کرنے کے لئے دومثالیں دیتا ہے۔ایک مثال تو کسی اوسط سطح کے عہدے پر فائز سرکاری ملازم کی ہے جو اپنی تعیناتی اپنے آبائی ضلع کے قریب کسی مقام پر کروانا چاہتا ہے۔اس کے بھائی اور چچاوغیرہ موثر سیاسی روابط رکھتے ہیں اور وہ ان سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ وہ اس کی درخواست پی ایم ایل کے اس رکن اسمبلی تک پہنچانے پر رضامند ہو جاتے ہیں جو پنجاب میں ان کے ضلع کی نمائندگی کرتا ہے۔ وہ ان کی درخواست منظور کروانے پر پہلے سے ہی تیار ہوتا ہے کیونکہ وہ لوگ اس مربیانہ روابط کے سلسلے کی اہم کڑیوں کی طرح ہیں اور انہوں نے اس کی حالیہ انتخابی مہم میں بھی اہم کردار ادا کیا تھا۔اس کی مجبوری صرف یہ ہے کہ اسے اس معاملے میں براہ راست کوئی اختیار حاصل نہیں ہے کیونکہ سول ملازمتوں میں تبادلوں کا اختیار وفاقی حکومت کے پاس ہوتا ہے۔تاہم اس کو چوہدری شجاعت کے مربیانہ روابط کے سلسلوں میں ایک اہم کڑی کی حیثیت حاصل ہے جو کہ اس وقت نواز شریف کی حکومت میں وزیر داخلہ ہے۔قومی سطح کے قائد سے قریبی ربط کی بناء پر وہ اس سرکاری ملازم کا تبادلہ اس کے آبائی ضلع میں کروانے پر کامیاب ہو جاتا ہے اگرچہ اس مقصد کے لئے ایک اور انتہائی قابل اور باصلاحیت سرکاری ملازم کو وہاں سے کسی اور جگہ تعینات کرنا پڑ جاتا ہے۔

دوسری مثال ایک ایسے کامیاب کاروباری شخص کی ہے جو پیدا تو پاکستان میں ہوا مگر اس وقت امریکہ میں اقامت کا اجازت نامہ رکھتا ہے اور جو کسی نجی دورے پر پاکستان واپس آرہا ہے۔بہت سے اور پاکستانیوں کی طرح جو یہ ملک چھوڑ کر چلے گئے ہیں اور وہاں خوب پیسہ کمارہے ہیں، وہ اپنے ساتھ بہت سے سوٹ کیس لا رہا ہے جن میں سے ہر ایک اس کے دوستوں اور رشتہ داروں کے لئے قیمتی تحائف سے بھرا ہوا ہے۔ان میں سے ایک امکانی مستفید جو کہ اس کے لڑکپن کا شناسا ہے اس امر کو یقینی بنانے کے لئے سرگرداں ہے کہ اس کے کاروباری دوست کو پاکستانی کسٹم حکام کے ہاتھوں کسی قسم کی لوٹ مار کا سامنا نہ کرنا پڑے جو کہ رشوت کے طور پر بہت سے تحائف کوضبط کر لیتے ہیں۔وہ اپنے مقامی رکن صوبائی اسمبلی سے رابطہ کرتا ہے جو کہ شادی کے بعد اس کے رشتہ داروں میں شامل ہو چکا ہے اور اس سے مدد کی درخواست کرتا ہے۔ یہ رکن اسمبلی

مربیانہ روابط کے ایک ایسے سلسلے سے منسلک ہے جس کی سرپرستی کابینہ کے ایک وفاقی وزیر کے پاس ہے جو کہ اپنے ذاتی معاون یعنی پی۔اے کو اس کاروباری شخصیت کے استقبال کے لئے ہوائے اڈے روانہ کر دیتا ہے۔ ہوائی اڈے پر اپنے وزیر کے اثر ورسوخ کو استعمال میں لاتے ہوئے کسٹم حکام سے سارا سامان آرام سے نکلوا لینے کے بعد یہ پی۔اے اس کاروباری شخصیت کو اپنی معیت میں جہاز سے براہ راست وی آئی پی لاؤنج پہنچا دیتا ہے۔ اس کے بعد وہ اس کا پاسپورٹ لیتا ہے، اس پر متعلقہ حکام کی مہریں لگوا کر چند منٹوں کے بعد اس کاروباری شخصیت کے بغیر کھلے ہوئے سامان کے ساتھ واپس لوٹ آتا ہے اور پھر اس خوشی سے پھولے نہ سماتے ہوئے مہمان کو پارکنگ میں کھڑی اس کی گاڑی تک پہنچا کر ہی رخصت لیتا ہے۔

اس طرح کا رویہ پاکستان کی سیاسی روایات کا کس طرح جزولازم بن چکا ہے اس کا اندازہ آپ میرے ذاتی تجربے سے لگا سکتے ہیں۔ میں اسلام آباد کے امریکی سفارت خانے میں ایک سیاسی مشیر کے طور پر اپنی تعیناتی کے تین برس بعد واپس واشنگٹن جانے کی تیاریاں کر رہا تھا۔ بڑی بڑی سیاسی جماعتیں امریکہ کے رخصت ہو جانے والے اعلیٰ سطح کے سفارت کاروں کے لئے اکثر و بیشتر الوداعی تقریبات کا اہتمام کرتی رہتی ہیں اور اسی طرح کی ایک تقریب کا اہتمام چوہدری شجاعت نے اپنی اسلام آباد والی رہائش پر میرے لئے بھی کیا تھا۔ یہ پرویز مشرف کی جانب سے نواز شریف کی حکومت کی برطرفی کے واقعہ کے تقریباً دو برس بعد کی بات تھی جب چوہدری شجاعت پی ایم ایل قاف کا قائد بن جانے کے ساتھ ہی پرویز مشرف کے بہت قریب تھا، دوسرے معنوں میں پاکستان کی اس وقت کی سب سے بااثر سیاسی شخصیت۔ میں نے اسے باتوں باتوں میں یہ بیان کیا کہ میں اور میرے اہل خانہ امریکہ جانے سے قبل کچھ دن کے لئے ہانگ کانگ میں قیام کریں گے۔ اگرچہ مجھے شبہ ہے کہ چوہدری شجاعت مجھے اپنے مربیانہ روابط کے سلسلے کی کوئی کڑی سمجھ رہا تھا مگر اس نے فوراً ہی جواب دیا ہانگ کانگ میں اس کے چند ایک اچھے پاکستانی روابط ہیں جو مجھے ہوائی اڈے پر آ کر ملیں گے، ہمارا سامان بحفاظت اٹھا کر رکھیں گے اور ہمیں مطلوبہ ہوٹل تک پہنچا آئیں گے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کرنے کے ساتھ ہی بڑے نرم الفاظ میں معذرت کرتے ہوئے بتایا کہ چونکہ میں نے اس حوالے سے پہلے ہی انتظامات کر رکھے ہیں اس لئے میں اسے زحمت دینا ضروری نہیں سمجھتا۔ استقبالئے کے بعد میں نے پاکستانی پولیٹکل

اسسٹنٹ سے کہا کہ وہ شجاعت سے مل کر اسے یہ نکتہ دوبارہ وضاحت سے سمجھا دے۔ اس نے رضامندی تو ظاہر کر دی مگر ساتھ ہی ذرا دلچسپ حیرت کے ساتھ بتا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اس کی بات درست نکلی میں اور میرے اہل خانہ امیگریشن کی رسمی کاروائیوں کے بعد جیسے ہی باہر نکلے، تو تین خوش پوشاک پاکستانی ہوائی اڈے پر ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا تعارف کروایا، ہمیں اپنے جلو میں آرام دہ انتظار گاہ تک لے گئے اور بڑی نرمی مگر اصرار کے ساتھ ہمارے سامان کا پوچھا اور کافی منٹ گزرنے کے بعد ہمارے سامان کے ساتھ واپس آئے اور ہمیں پارکنگ تک چھوڑ کر آئے۔

اگر چہ پاکستان سیاست دان سرپرستی یا گماشتہ گیری کے کام میں تو بہت مہارت رکھتے ہیں مگر ایک موثر قسم کی انتظامی صلاحیتوں سے عاری نظر آتے ہیں۔ چونکہ ان کی توجہ کا مرکز یا محور اپنے مربیانہ روابط کا استحکام ہوتا ہے اس لئے وہ قومی اہمیت کے معاملات میں بہت کم دلچسپی لیتے ہیں۔ عوامی فلاح کے حوالے سے بنائی جانے والی پالیسیاں زیادہ تر ذاتی مقبولیت حاصل کرنے کے نقطہ نظر سے بنائی جاتی ہیں، مثلاً حکومت کی طرف سے درآمدی اجناس بشمول غذائی اجناس، پٹرول وغیرہ پر زرتلافی کی فراہمی یا پھر نواز شریف کی نام نہاد پیلی ٹیکسی اسکیم جس کے ذریعے کم لاگت کے چھوٹے قرضے ایسے لوگوں کو فراہم کئے گئے تھے جو انہیں واپس ادا کرنے سے بھی قاصر تھے۔ سیاست دان اس طرح کے منصوبے اس لئے پیش کرتے ہیں کیونکہ یہ نہ صرف واضح طور پر عوام کو نظر آرہے ہوتے ہیں بلکہ ان کے فوری سیاسی فوائد بھی حاصل ہو جاتے ہیں۔ جبکہ اہم نوعیت کے قومی مسائل کے حوالے سے باضابطہ قسم کے طویل المیعاد حل نہ صرف خفیہ جاگیردارانہ مفادات کو خطرے میں ڈال دیتے ہیں، جیسا کہ انکم ٹیکس کی مثال سے ثابت ہوتا ہے بلکہ اتنی طویل مدت پر محیط ہوتے ہیں کہ ان کے اندر سیاست دانوں کو فوری طور پر کوئی کشش نظر نہیں آتی کیونکہ ان کا اصل مقصد قلیل مدت کی سیاسی سرپرستی فراہم کرنا ہوتا ہے۔

یہ دیکھنے کے لئے کہ اس طرح کی پالیسیوں کا انجام کیا ہوتا ہے ذرا ذہن پر تھوڑا سا زور ڈالنا پڑے گا۔ ان کے نتیجے میں ملک ایک طرح سے یتیم خانہ بن کر رہ جاتا ہے۔ وہ قومیں جن کی معیشتیں عالمی منڈی میں ناقص استعداد کا مظاہرہ کرتی ہیں اور اس کے باوجود درآمدی تیل اور دوسری ضروری اجناس پر انحصار کرتی ہیں، اور جن کی حکومتیں جتنا وصول کرتی ہیں اس سے زیادہ

خرچ کر دیتی ہیں اور بری طرح ٹوٹ پھوٹ کر رہ جاتی ہیں۔ پاکستانی حکومتوں کو بار بار آئی ایم ایف اور دوسرے اداروں سے قرضہ لینے کی مجبوری پیش آ جاتی ہے۔ اس نے یہ کام اتنی مرتبہ کیا ہے کہ اور اتنے طویل عرصے سے کرتی چلی آ رہی ہے کہ اب ملک کے وفاقی بجٹ کا تیسرا حصہ بین الاقوامی قرضوں کی ادائیگی میں چلا جاتا ہے جو کہ بجٹ کی دوسری بڑی ترجیح کے، جو کہ ظاہر ہے کہ قومی دفاع کے مصارف ہیں، دوگنا سے بھی زیادہ ہے۔ افسوسناک حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستانی حکومتیں عوامی تعلیم اور دیگر سماجی خدمات کے لئے بہت کم وسائل مختص کرنے کے باوجود بجٹ کا خسارہ پورا کرنے میں کسی طرح بھی کامیاب نظر نہیں آتیں۔

بجائے اس کے کہ خودغرضی اور تنگ نظری پر مبنی ان رویوں کو تبدیل کریں جن کے نتیجے میں حالات اس افسوسناک سطح تک پہنچ چکے ہیں پاکستانی حکومتیں الٹا آئی ایم ایف اور دوسرے بین الاقوامی قرضہ دار اداروں کو چکمہ دینے کے فن میں طاق ہو چکی ہیں۔ بحران کو وقتی طور پر ٹالنے کے لئے انہیں جو رقم درکار ہوتی ہے اس کے حصول کے لئے وہ اکثر اوقات سخت شرائط تسلیم کرنے پر بھی آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ان شرائط میں روایتی طور پر زرعی آمدنی پر ٹیکس لگانے اور بنیادی اجناس یا ضروریات پر دی جانے والی اعانتوں یا زرتلافی کے خاتمے کے مطالبات شامل ہوتے ہیں۔ تاہم اکثر اوقات قرضے کی پہلی قسط موصول ہوتے ہی وہ ان معاہدوں سے منحرف ہو کر دوبارہ اپنی پرانی ڈگر پر آ جاتی ہیں۔ لہٰذا وہ تسلیم کردہ اہداف کو پورا کرنے کی کوئی ٹھوس کوشش نہیں کرتیں اور اس کی بجائے زیادہ آسان شرائط کے لئے مذاکرات کرتی ہیں جس پر اکثر آئی ایم ایف تقریباً رضامند ہو جاتا ہے۔ ان ہتھکنڈوں کی بدولت پے درپے آنے والی حکومتوں کو قرضوں کی عدم ادائیگی کی صورت میں متوقع دیوالیہ پن سے بچنے کے لئے ضروری وسائل بغیر کوئی سنجیدہ اصلاحی پروگرام نافذ کئے ملتے رہے ہیں۔ پاکستانی اس طرح کے طرز عمل کے باوجود فرار کی راہ پانے میں اس لئے ناکام ہو جاتے ہیں کیونکہ آئی ایم ایف اور قرض دینے والے دوسرے ادارے پاکستان کے مالیاتی دیوالیہ پن کے خطرناک نتائج سے منہ موڑنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ پاکستانی حکومت نہ صرف اس سے اچھی طرح باخبر ہے بلکہ وہ اس پر انحصار بھی کرتی ہے۔

چنانچہ سنجیدہ نوعیت کے مسائل سے صرف نظر کرنا یا ان کے وقتی حل نکالنے کا رجحان پاکستان میں جاگیردارانہ سیاست کی نمایاں خصوصیت بن چکا ہے۔ یہ محض سیاسی سرپرستی کی بنیاد پر

چلنے والے سیاسی نظام کے اندر ایک فطری بدعہدی کے ماحول کا مسئلہ نہیں ہے؛ اس کو پاکستان کی سویلین حکومتوں کے مسلسل عدم استحکام کی بنا پر بھی تقویت حاصل ہوئی ہے۔1988 میں جنرل ضیاء کی وفات کے بعد انتخابی سیاست کی بحالی کے وقت سے کسی بھی سویلین حکومت کو اپنی مدت پوری کرنے کا موقع نہیں ملا۔ اس حقیقت کے پیش نظر سیاست دان اپنی سیاسی سرپرستی کے روابط کو مستحکم بنانے کا کوئی بھی موقع ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ یہ انداز یا طریقہ عمل اب آزمودہ بن چکا ہے۔ ایک نئی حکومت منتخب ہوتی ہے اور ان بے پناہ توقعات کے ساتھ اقتدار سنبھالتی ہے کہ اس مرتبہ صورتحال مختلف ہوگی۔ مگر ہر نئی حکومت اپنے پیشتروں کی طرح جاگیردارانہ طرزعمل کا مظاہرہ کرتے ہوئے پوری توجہ اپنے مربیانہ روابط کی تسکین یا استحکام پر ہی مرکوز کر کے رکھ دیتی ہے۔ معیشت بہتر ہونے میں ناکام رہتی ہے اور ایک عدد اور معاشی بحران ناگزیر ہو جاتا ہے۔ حکومت کی مقبولیت میں تیزی سے کمی واقع ہونے لگتی ہے تاہم یہ ایک مربیانہ نظام کے مضمرات سے اتنی تنگ آئی ہوئی ہوتی ہے کہ اپنے طور طریقوں میں تبدیلی کے حوالے سے سوچنے پر مجبور ہو جاتی ہے۔ اس کے مربیانہ روابط کے نظام کا شیرازہ بکھرنے لگتا ہے۔ حزب مخالف اس کے خون کی پیاسی ہو جاتی ہے۔ واضح طور پر نظر آنے والی نااہلیت پر صحافت حیران وششدر رہ جاتی ہے، اور عام پاکستانی بھڑاس نکالنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ ایک عدد اور فوجی مداخلت کی راہ ہموار کرنے کی صورت میں نکلتا ہے۔

پہلے تاثر میں فوج اور جاگیردار سیاست دانوں میں بظاہر کوئی قدر مشترک نظر نہیں آتی۔ اس کے چند ایک افسروں کا تعلق جاگیردار یا دولت مند گھرانوں سے ہوتا ہے، اگرچہ بعض ان میں شادی کر لیتے ہیں۔ ان کی اکثریت کا تعلق شہری متوسط طبقے سے ہوتا ہے جن کے لئے فوج بلند سماجی مرتبے اور معاشی خوشحالی کی ضامن ہوتی ہے۔ پرویز مشرف ایک متوسط درجے کے سرکاری افسر کا بیٹا تھا جس طرح کہ ضیاء الحق تھا۔ بہت سے افسروں کے باپ بھی فوجی افسر ہوتے ہیں، جیسے کہ اشفاق پرویز کیانی جو کہ مشرف کے بعد فوج کا سربراہ بنا تھا۔ نچلے درجے کے فوجیوں یا جوانوں کا تعلق زیادہ دیہاتوں سے ہوتا ہے۔ ان کی اکثریت شمالی پنجاب کے ضلعوں، یعنی اٹک، راولپنڈی اور جہلم کی اس نام نہاد تکون سے آتی ہے جہاں سے فوج کو بڑی تعداد تک کئی پشتوں سے سپاہی فراہم کئے جاتے رہے ہیں، پہلے برطانوی راج کے تحت اور اب حکومت پاکستان کو۔ اس

فوجی تکون سے فوج کو غیر متناسب تعداد میں افسر فراہم کئے جاتے رہے ہیں مگر اب حالیہ برسوں میں فوج نے بڑی محنت سے بھرتی کا دائرہ وسیع کرنے میں کچھ کامیابی حاصل کر لی ہے تاکہ فوج کے مجموعی طور پر ایک قومی ادارہ ہونے کا تاثر قائم کیا جاسکے۔

ایک جاگیردار سیاسی طبقے کے برعکس جو کہ اپنے مربیانہ روابط کی تسکین، واستحکام جیسے محدود مقصد پر توجہ مرکوز کئے ہوئے ہے، فوج کی توجہ کا مرکز واضح طور پر قوم کی عمومی فلاح و بہبود ہے۔ یہ خود اپنی نظر میں اور پاکستانی عوام کی نظر میں بھی قومی خود مختاری کے دفاع اور جمہوریت کے استحکام کی حتمی ضامن ہے۔ اس کے جوان اور افسر اپنے مفروضہ پیشہ ورانہ طرزِ عمل پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ فوج خود اپنے طور پر اور بہت سے پاکستانیوں کی نظر میں بھی ملک کا حقیقی معنوں میں واحد پیشہ ورانہ ادارہ سمجھی جاتی ہے۔ ایک سابقہ اعلیٰ فوجی افسر نے اس کی پیشہ ورانہ صلاحیت کو میرے سامنے واضح کرنے کے لئے اس امر پر زور دیا کہ فوج کی قیادت کے خلاف اندورنی طور پر کی جانے والی ہر بغاوت کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا، جبکہ فوج کی قیادت کی طرف سے سویلین حکومت کے خلاف کی جانے والی ہر بغاوت کامیاب رہی ہے۔ اگرچہ ایک مغربی ملک کے اس باشندے کے لئے یہ امر حیرت کا باعث ہوسکتا ہے جس کے نزدیک فوج کا سویلین نظم ونسق کے تحت ہونا ایک معمول کی بات ہوتی ہے کہ فوجیوں کی بے دلی سے تعریف کی جائے، تاہم تیسری دنیا کے کسی ایسے ملک میں جہاں جمہوریت نے ابھی تک جڑیں نہیں پکڑیں، اس بات میں کچھ وزن موجود ہے۔

فوج کے افسروں کی کھیپ معیار پر منتخب کئے گئے مخصوص قسم کے فوجیوں پر مشتمل ہوتی ہے اور اس کے اندر داخل ہونا آسان نہیں ہوتا۔ نمونے کے کسی بھی برس میں 15000 امیدواروں میں صرف چند سو افراد ہی ایسے ہوتے ہیں جو سخت قسم کے امتحانی مراحل میں کامیابی حاصل کر لیتے ہیں۔ میرے جاننے والے اعلیٰ فوجی افسروں میں سے اکثر ذہین مرد تھے جو کہ اپنے جاگیردار ہم منصب سیاستدانوں کے مقابلے میں زیادہ شائستہ اور سوجھ بوجھ رکھنے والے تھے۔ تاہم وہ انڈیا کے خلاف ایک مخصوص قسم کے ایسے عدم اعتماد اور تنفر کا اظہار بھی کرتے تھے جو انہیں ایک منفرد اور نمایاں مقام عطا کرتا ہے۔ ان کا اصرار ہے کہ انڈیا نے کشمیر پر غاصبانہ قبضہ کیا ہوا ہے۔ انڈیا نے پاکستانی ریاست کے وجود کو تسلیم نہیں کیا۔ اگر ہم اپنے دفاع سے ذرا بھی غافل ہو جائیں تو انڈیا

ہمیں نقصان پہنچانے سے گریز نہیں کرے گا۔اس طرح کا رویہ نوجوان فوجی افسروں کی شخصیت کا حصہ بن چکا ہے اور پورے کے پورے ادارے کے اندر مسلسل سرایت کر چکا ہے۔

بہت سے پاکستانیوں، خاص طور پر صحافی طبقے اور آزاد خیال دانشوروں کا یقین ہے کہ یہ انڈیا مخالف راگ صرف اور صرف ذاتی مفاد کی بنیاد پر الاپا جاتا ہے کیونکہ اس طرح فوج کے ادارے کی معاشرے میں ایک خصوصی اور ممتاز حیثیت برقرار رکھنے کی ضمانت حاصل ہو جاتی ہے۔ تاہم میرے نزدیک اس طرح کی وضاحت ایک طرح سے یاسیت پر مبنی ہے۔فوج میں میری قریبی شناسائی ایک ایسے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل سے تھی جو اسلام آباد میں ایک معروف فکری ادارے (Think Tank) کا سربراہ تھا۔ وہ ایک ایسا نرم گفتار، سوچ وبچار کرنے والا اور کتابوں کا شیدائی آدمی تھا جو کہ اس طرح کے فوجی عہدے پر فائز ہو جانے والی شخصیات کے مقابلے میں انتہائی شائستہ انداز اطوار رکھنے والا انسان تھا۔ ہم کشمیر کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے اس نے مجھے بتایا کہ وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس نتیجے پر پہنچ چکا ہے کہ انڈیا کشمیر سے کبھی دستبردار نہیں ہوگا اور پاکستانیوں کو اس حقیقت سے سمجھوتہ کرنا ہوگا۔مگر جب میں نے موضوع بدلتے ہوئے یہ سوال کیا کہ اگر کشمیر کے مسئلے پر ایک اور جنگ ہوگئی اور انڈیا اپنے اسلحے کے زور پر پاکستان کے دفاعی حصار کو توڑنے میں کامیاب ہو کر ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کے خطرے کا باعث بن جاتا ہے تو ایسی صورت کیا ہوگا تو اس کے جواب نے مجھے ورطہء حیرت میں ڈال دیا۔اس نے مجھ پر ایک تفکر آمیز نگاہ ڈالی جبکہ آواز میں جذبات کی وجہ سے ایک لرزش سی تھی۔اس نے کہا کہ ایسی صورت حال میں پاکستان کے پاس سوائے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے کے اور کوئی چارہ نہ ہوگا۔

پاکستانی فوج کے افسروں کی آواز بعض اوقات اس وقت بھی جذبات سے لرز کر رہ جاتی ہے جب ان جاگیردار سیاستدانوں کا موضوع زیر بحث آجائے جن سے وہ حقارت کی حد تک نفرت کرتے ہیں۔نظر یہی آتا ہے کہ فوجی افسروں کے رویّے میں ایوب خان کے زمانے سے کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ تاہم اس حوالے سے وہ علمی حلقوں، سول سوسائٹی اور ذرائع ابلاغ سے وابستہ ان شخصیات سے کسی طرح بھی مختلف نظر نہیں آتے جو سب کے سب اسی طرز عمل کا مظاہرہ کرتے ہیں۔اور یہ خیال کرنا بھی قرین انصاف نہیں ہوگا کہ پاکستانی فوج جمہوریت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتی اور ذرا ذرا سے بہانے سویلین حکومت کا تختہ الٹنے پر تیار رہتی ہے۔2009 کی خزاں

میں پرویز مشرف کے پیشرو آرمی چیف جنرل جہانگیر کرامت کا نواز شریف کے ساتھ اس تقریر کے حوالے سے تنازعہ کھڑا ہو گیا جس میں حکومت پر شدید سنگ باری کرتے ہوئے ایک عدد قومی سلامتی کونسل کے قیام کا مطالبہ کیا گیا تھا جس کے تحت فوج کو کابینہ میں رسمی نمائندگی دی جانی تھی۔ اس وقت اقتصادی بدنظمی اور اس کے ساتھ ہی ایک آمرانہ طرز حکومت کی بنا پر نواز شریف کی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے آرہا تھا۔ ہر طرف فوجی بغاوت کی افواہیں گردش کر رہی تھیں۔ چنانچہ اس صورتحال کے پیش نظر میں اپنے پڑھا کو لیفٹیننٹ جنرل سے ملنے چلا گیا جو کہ جہانگیر کرامت سے گہری شناسائی رکھتا تھا۔ تاکہ اس کے خیالات معلوم کر سکوں۔ میرا اندازہ تھا کہ وہ کسی حد تک ان افواہوں کو درست قرار دے دے گا مگر اس کے جواب نے مجھے ایک بار پھر ورطہء حیرت میں ڈال دیا۔ اس نے کہا کہ اسے سو فیصد یقین ہے کہ یہ بغاوت نہیں ہوگی۔ جب میں نے اس سے اس یقین کی وجہ دریافت کی تو اس نے کہا کہ آرمی چیف جمہوریت پر یقین رکھتا ہے۔ اس سے اگلے روز جہانگیر کرامت نے استعفیٰ دے دیا۔

پاکستانی فوج میں اسلام کے کردار کو بھی بعض اوقات غلط نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ بہت سے افسر پکے مسلمان ہیں جبکہ بعض شدّت پسند نظریات کے حامی ہیں، اور اکثر اوقات اس کے سیاسی مضمرات سامنے آجاتے ہیں۔ جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، یہ صورتحال جنرل ضیاء کے دور میں انتہائی بدنام زمانہ رخ اختیار کر گئی تھی۔ 1995ء میں عباسی نام کے ایک میجر جنرل نے جو کہ انتہاء پسند اسلامی نظریات کیلئے نرم گوشہ رکھتا تھا، آرمی ہیڈکوارٹر میں بغاوت کی کوشش کی مگر اسے بری طرح ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ ان واقعات میں سے ایک تھا جن کی طرف وہ فوجی افسر اشارہ کر رہا تھا جس کا میں نے اوپر پہلے حوالہ دیا ہے، جب اس نے یہ بتایا تھا کہ پاکستانی فوج کے اندر سے آج تک کوئی بغاوت کامیاب نہیں ہوئی۔ تاہم اس واقعہ کے ردّعمل کے طور پر فوج میں افسروں کے مذہبی عقائد کی چھان بین کے ساتھ ہی شدّت پسند نظریات رکھنے والوں کو ایسے عہدوں پر تعینات کرنا شروع کر دیا گیا جہاں ترقی کے کوئی امکانات نہیں ہوتے تھے۔ البتہ عام طور پر مذہب نے پاکستانی فوج کی ترجیحات کے تعین کے حوالے سے نہ تو کبھی کوئی اہم کردار ادا کیا ہے اور نہ ہی ایسا ہوتا ہے۔ افسروں کی اہم کارکردگی کی تشخیص ہمیشہ ان کی پیشہ ورانہ اور جنگی صلاحیتوں کی بنیاد پر کی جاتی ہے نہ کہ ان کے مذہبی عقائد کی بناء پر۔ فوج کے اعلیٰ افسروں کے حلقوں میں غیر

معمولی طور پر پارسا نظر آنے والے فوجی جن کی شناخت اکثر ان کی داڑھیوں سے کی جاتی ہے۔ اورانہیں ساتھی افسروں کی جانب سے ''داڑھے'' کا خطاب ہی دیا جاتا ہے یہ ایک واضح اقلیت کی طرح ہیں۔

اسلام آباد میں اپنی تعیناتی کے عرصے کے دوران میری ملاقات نیشنل وار کالج میں جو کہ نئے تقرر کردہ اعلیٰ افسروں کی تربیت کا ایک ممتاز فوجی ادارہ ہے، باہمی تبادلے کے طور پر آنے والے طالب علم سے ہوئی۔ میں نے اس کے ذمے یہ کام لگایا کہ وہ اپنے پاکستانی رفقاء میں داڑھی والوں کی تعداد گنے۔ اس باوقار جنگی شعبے میں 50 عدد بہترین اور انتہائی ذہین ون سٹار جرنیلوں میں صرف چار کی داڑھی تھی۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ایسے افسر اعلیٰ عہدوں تک بہت کم پہنچتے ہیں۔ 1999 میں نواز شریف حکومت کے خلاف بغاوت میں حصہ لینے والے دو اعلیٰ افسر یعنی محمود احمد اور محمد عزیز خان مبیّنہ طور پر مذہبی شدّت پسند تصور کئے جاتے تھے مگر ان میں سے صرف ایک کی داڑھی تھی۔ جس آرمی چیف، پرویز مشرف کے ایماء پر وہ یہ کاروائی کر رہے تھے، وہ اس کے برعکس، فوجی حلقوں میں ایک نمایاں سماجی و مذہبی روشن خیال شخصیت سمجھی جاتی تھی، یعنی ایک اور ایوب نہ کہ ضیاء۔ پاکستانی فوج میں منظّم اور پیشہ ورانہ صلاحیتوں کے حامل افسروں کا خون شدّت پسند مذہبی افسروں کے پانی سے زیادہ گاڑھا ہے۔

یقیناً، پاکستانی فوج ایک مضبوط پیشہ ورانہ ساکھ کے حوالے سے فوجی اداروں میں بمشکل ہی کوئی منفرد مقام رکھتی ہے۔ جو چیز اسے انفرادیت، حتیٰ کہ غیر معمولی حیثیت، عطا کرتی ہے وہ خود اپنے معیار کے حوالے سے اس کی حد سے زیادہ سخت کوشی اور نظم وضبط کا اطلاق ہے۔ صنعتی وزرعی اداروں کا اس کا ایک اپنا وسیع وعریض سلسلہ ہے جس کا اہم مقصد ریٹائرڈ فوجیوں کی فلاح وبہبود کو یقینی بنانا ہے۔ فوج کے ملکیتی فوجی فاؤنڈیشن اور آرمی ویلفیر ٹرسٹ کا شمار ملک کے سب سے بڑے کثیر المقاصد کاروباری اداروں میں ہوتا ہے۔ فوجی فاؤنڈیشن کے زیرنگرانی کھاد، سیمنٹ اور دلیہ بنانے والے ادارے کام کر رہے ؛ ان کے علاوہ کچھ ادارے قدرتی گیس کے کنویں کھودنے اور تیل کے ذخائر کے انتظام میں مصروف ہیں۔ اس کے علاوہ یہ ادارہ سرمایہ کار بینکاری اور حصص کی خرید وفروخت کا کام بھی کرتا ہے۔ جبکہ آرمی ویلفیئر ٹرسٹ بھی اپنے ''عسکری'' تجارتی نشان کے ساتھ اسی طرح کی کاروباری سرگرمیوں میں مصروف ہے۔ اس کے زیر انتظام

چینی کے کارخانے چلائے جاتے ہیں، ریٹائر جوانوں کو بطور مسلح محافظ بھرتی کیا جاتا ہے، اور سیروسیاحت کے لئے ہیلی کاپٹر اور پائلٹ فراہم کرنے کا کام کیا جاتا ہے۔عسکری لیزنگ کمپنی پاکستان کی سب سے بڑی اجارہ کمپنی ہے۔اس کے علاوہ فوج کے پاس بڑے بڑے زمینی رقبے بھی ہیں، زیادہ تر زرعی زمینوں کی صورت میں۔اگرچہ ریٹائرڈ اعلیٰ افسر اپنے جاگیردار بھائیوں کی نسبت بہت کم شان وشوکت کی زندگی گزارتے ہیں مگر میرے تجربے کے مطابق وہ اپنی پنشنوں کی سطح سے بہت بہتر معیار کی زندگی گزارتے ہیں۔

صنعت وزراعت کے شعبوں میں اس قدر سرمایہ کاری، جس کا مقصد خاص طور پر اپنے ملازمین کی فلاو بہبود ہے، مربیانہ روابط کی بہت سے خصوصیات کی عکاس ہے اگرچہ بہت ہی زیادہ منظّم انداز میں۔اس امر پر زیادہ حیرت اس لئے نہیں ہونی چاہئے کیونکہ فوج بھی اسی سماجی ماحول کی پیداوار ہے جس نے پاکستان میں جاگیردارانہ سیاسی نظام کو فروغ دیا۔چنانچہ اس طرح یہ امر واضح ہوجاتا ہے کہ اقتدار میں آنے کے بعد فوج بھی اپنے سویلین ہم منصبوں کی طرح حکومت کیوں کرتی ہے۔ جب پرویز مشرف نے نواز شریف کا تختہ الٹا تو جاگیردارانہ طور طریقوں سے تنگ آئے ہوئے عوام کو بہت زیادہ توقع تھی کہ فوج ان اصلاحات کو نافذ کرنا شروع کردے گی جو کہ سیاست دان نافذ کرنے سے انکاری تھے۔شروع شروع میں مشرف بڑے خوبصورت دعوے کررہا تھا مگر انجام کار بہت مایوس کن تھا۔تاہم اس کے دور کا ایک مثبت پہلو آزادی صحافت کے فروغ کے علاوہ نواز شریف کی نسبت اداروں کے مابین محاذ آرائی میں کمی کرنا بھی تھا۔تاہم اگرچہ اس نے شروع میں جاگیرداروں کی طرف سے انکم ٹیکس کی مزاحمت کے عمل کی شدید مذمت کی، مگر اس حوالے سے کسی قسم کے سنجیدہ کوشش نہیں کی۔وہ جاگیرداروں کی خود میں مست رہنے کی عادت اور قومی وسائل کی بے دریغ لوٹ مار پر تو بہت شدید تنقید کرتا تھا مگر ایوب کے بنیادی جمہوریتوں کے پرانے گھسے پٹے منصوبوں کو اپنے ہی انداز میں بڑی بے دلی سے نافذ کرکے اس صورتحال کا کوئی واضح توڑ کرنے میں ناکام رہا۔

حقیقت تو یہ ہے کہ جب صورتحال فیصلہ کن ہوجاتی ہے تو فوج کا مفاد بھی اسی میں ہوتا ہے کہ حالات کو جوں کا توں رہنے دیا جائے۔ یہ نہ صرف کسی بھی اور جاگیردار کی طرح اپنے زرعی اور صنعتی اثاثوں کے تحفظ کی خواہش مند ہوتی ہے، بلکہ اسے یہ خطرہ بھی ہوتا ہے کہ کسی قسم کی

بنیادی تبدیلی کی کوششوں کے دوران ملک سیاسی انتشار کی لپیٹ میں بھی آسکتا ہے۔ پاکستان جیسے ملک میں جہاں جاگیردارانہ تعلقات معاشرے میں اس قدر مستحکم ہو چکے ہیں یہ ایک بہت عظیم الشان اور غالباً خونی قسم کا معرکہ ثابت ہوگا۔فوج کا قدامت پسندانہ طرزِعمل اوراس کے ساتھ ہی نظم وضبط کا فلسفہ آئینی طور پراس طرح کی سرگرمی کے منافی نظر آتا ہے۔ بنیادی تبدیلی کا خطرہ مول لینے سے فوج کی چوکسی اور استعداد کمزور پڑجائے گی اور ملک کو مفروضہ بھارتی خطرے سے بچانے کا فوج کا مفروضہ مرکزی کردار بھی خطرے کی نذر ہو جائے گا۔حتیٰ کہ ضیاء نے بھی، جو کہ ملک میں اسلامی نظام کے نفاذ کے لئے کی جانے والی کوششوں کے حوالے سے اس اصول سے سب زیادہ انحراف کرتا نظر آتا تھا، ملک کے بنیادی جاگیردارانہ ڈھانچے کو تبدیل کرنے کی کوئی حقیقی کوشش نہیں کی تھی۔ چنانچہ فوجی حکومتیں ضروری طور پر اس طرح کی کاروائی نہیں ہونے دیتیں۔حتیٰ کہ جب فوج اقتدار میں ہوتی ہے تو پھر بھی اس کا رجحان اپنے بڑے بڑے کاروباری اداروں کے تحفظ کے ذاتی مفاد پر توجہ دینے کی طرف ہوتا ہے اور سنجیدہ مسائل کے حل کو تاخیر کا شکار کردیا جاتا ہے۔

ایوب اور ضیاء کی طرح مشرف کو بھی آخر کار ایک سویلین حکومت کو واپس لے آنے کی ضرورت کا احساس ہوا اوراس حوالے سے اس نے اپنے پیشتروں سے بھی زیادہ تیزی کا مظاہرہ کیا۔اقتدار میں آنے کے ایک برس کے اندراندر فوج پی ایم ایل کے ان بڑے بڑے رہنماؤں کو جن کے نوازشریف کے تعلقات اس کے آمرانہ طرزِحکومت کی بناء پر فوجی بغاوت سے پہلے بھی بگڑ چکے تھے، قائل کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ نوازشریف کو چھوڑ کر خود اپنی فوج نواز قسم کی جماعت بنالیں۔جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کے نتیجے میں چوہدری شجاعت کی قیادت پر مبنی پی ایم ایل ق وجود میں آگئی۔مشرف کو ایسا کرنے کی ضرورت اس لئے پیش آئی کیونکہ فوج ایک بہت بڑے نظم و ضبط سے تحت اپنے فرائض انجام دے رہی ہوتی ہے۔اگر چہ یہ مادی طاقت پر اجارہ داری رکھتی ہے اور جب بھی چاہے اقتدار پر قبضہ کرسکتی ہے۔تاہم یہ جمہوری حکومت کو حاصل آئینی جواز سے محروم ہوتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ ہر فوجی سربراہ جو اقتدار میں آتا ہے اسے خواہ نمود ونمائش کے لئے ہی کیوں نہ ہو، ایک عدد آئینی جواز کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ یہ محض سیاسی علوم کے نظریئے کی پیروی کا مسئلہ نہیں ہے۔فوجی افسر اندر سے اس عقیدے کے قائل ہوتے ہیں کہ جمہوریت

MashalBooks.org

آمریت پر فوقیت رکھتی ہے۔ میرے رابطے میں رہنے والے بہت سے اعلیٰ فوجی افسروں نے مجھے بتایا کہ وہ اس حقیقت سے نظریں نہیں چرا سکتے کہ پاکستان میں جمہوری نظام کی ناکامی ان کے ملک پر کالے دھبے کی طرح ہے اگرچہ اس حوالے سے وہ خود کوئی ذمہ داری قبول کرنے کے زیادہ قائل نظر نہیں آتے تھے۔

یہ صورت حال ایوب اور ضیاء کے زمانے کے بعد رویّوں میں ایک عظیم تبدیلی کی عکاسی کرتی ہے اور اس امر کی بھی وضاحت کرتی نظر آتی ہے کہ پس منظر میں رہ کر دباؤ ڈالنے کی پالیسی فوج کے لئے حکومتی امور میں شرکت یا مداخلت کے خودکار نظام کی صورت کیوں اختیار کر گئی ہے۔ یہ ضیاء کی موت کے بعد سویلین اقتدار کی طرف واپسی کے دوران واضح طور پر محسوس ہو رہا تھا۔ پاکستان کے آئین میں آٹھویں ترمیم نے جو کہ ضیاء کے دور صدارت میں 1985 میں نافذ کی گئی تھی، پارلیمنٹ تحلیل کرنے کا اختیار وزیراعظم کی بجائے صدر کو دے دیا۔ ضیاء کے جانشین نسبتاً بے اختیار قسم کے برائے نام سربراہ ہی تھے، اور ضیاء اور مشرف کے درمیانی عشرے میں فوج ان کے ساتھ مل کر تین حکومتوں کو بشمول دو بے نظیر حکومتوں اور ایک نواز شریف حکومت برطرف کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ یہ کارروائیاں محض کسی کے ذاتی جذبات کی تسکین کے لئے نہیں کی گئی تھیں بلکہ حکومت کی طرف سے ایسی خوفناک غلطیوں کے بعد کی گئیں جن کا نتیجہ سیاسی واقتصادی بحران اور حکومت کی مقبولیت میں بے پناہ کمی کی صورت میں نکلا۔ ہر ایک صورت میں نتیجہ فوجی اقتدار کی صورت میں نہیں بلکہ نئے قومی انتخابات کی صورت میں برآمد ہوا جن سب میں فتح ہمیشہ حزب مخالف کی جماعتوں کو ہوتی تھی کیونکہ برطرف کردہ حکومت کی مقبولیت زوال پذیر ہو چکی ہوتی تھی۔

ان بے در پے مداخلتوں کے باعث یہ عقیدہ کافی حد تک پاکستانیوں اور پاکستان پر نگاہ رکھنے والے مبصرین میں بھی سرایت کر گیا کہ فوج کے پاس رسمی اقتدار ہو یا نہ ہو مگر اصل طاقت اسی کے پاس ہے کیونکہ سب کچھ اس کے ایماء پر ہو رہا ہے۔ تاہم اگر حقیقت یہی ہوتی تو پھر اس امر کا اتنا امکان نظر نہیں آتا کہ فوج کو حکومتوں کے خلاف اتنی زیادہ کارروائیاں کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی جتنی کہ اس نے 1990 کی دہائی میں کی تھیں۔ حقیقت تو یہی لگتی ہے کہ ان حکومتوں کی کارکردگی پر عوام میں پھیلنے والی مایوسی کا فوج کو بھی پوری طرح احساس تھا۔ اور اسی طرح اگر فوج کو واقعی سلامتی کونسل جیسے ادارے کی تخلیق کا مطالبہ کرنے کی ضرورت پیش نہ آتی اور نواز شریف اسے

عہدے سے برطرف کر دینے کے حوالے سے سوچنے کے قابل ہی نہ ہوتا۔

تاہم اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فوج سویلین حکومتوں پر کسی طرا اثر انداز نہیں ہوتی۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ قومی دفاع اور سلامتی کے امور کے حوالے سے اس کا اثر بہت ہی زیادہ ہے اور اگر کوئی سویلین حکومت اس کی مرضی کے خلاف کوئی کام کرتی ہے تو یہ اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیے بنا نہیں رہتی۔ اس کی ایک بہترین مثال 1999 کے شروع میں لاہور میں ہونے والی وہ سربراہی ملاقات ہے جس میں نواز شریف نے اٹل بہاری واجپائی کو دعوت دی تھی تاکہ دو طرفہ تعلقات میں بہتری لائی جا سکے۔ فوج اس سے خوش نہیں تھی اور اس ملاقات کا بائیکاٹ کر کے اس نے اس کا اظہار بھی کر دیا تھا۔ کئی ماہ بعد وہ انڈیا کے ساتھ اس وقت جنگ کی سی حالت میں پہنچ گئی تھی جب کشمیر کے متنازعہ علاقے میں لائن آف کنٹرول کے ساتھ کارگل کے علاقے میں سردیوں کے دوران خالی چھوڑ دی جانے والی بھارتی سرحدی چوکیوں پر قبضہ کر لیا گیا تھا اور جس پر انڈیا نے شدید اشتعال کا مظاہرہ کیا تھا۔ اس وقت یہ تاثر عام تھا کہ فوج نے یہ سب کچھ لاہور سربراہی ملاقات کے نتیجے میں تعلقات میں بہتری کے عمل کو سبوتاژ کرنے کے لیے کیا تھا۔ اور پھر امریکی دباؤ اور وسیع پیمانے پر جوابی بھارتی کاروائیوں کے نتیجے میں کارگل سے پاکستانی فوجوں کے انخلاء کے بعد شروع ہونے والے باہمی الزام تراشیوں کے سلسلے کے دوران پرویز مشرف جو کہ اس وقت نیا آرمی چیف بنا تھا اور نواز شریف دونوں نے ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہوئے اس واقعے کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالتے ہوئے شدید تنقید شروع کر دی جو ایک لحاظ سے فوجی شکست اور عوامی تعلقات میں بہتری کے عمل کی بہت بڑی ناکامی تھی۔ یہ تھا وہ پس منظر جو کئی ماہ بعد پرویز مشرف کی طرف سے کی جانے والی بغاوت کو اجاگر کر رہا تھا۔

اگرچہ اس بغاوت سے پہلے کے عشرے کی ایک نمایاں خصوصیت ایک دوسرے کے بعد آنے اور برطرف ہو جانے والی نااہل سویلین حکومتیں تھیں مگر اس عرصے میں جو سیاسی نظام ابھر کر سامنے آیا وہ نہ صرف لچک دار تھا بلکہ نسبتاً مستحکم بھی تھا۔ فوج نے آٹھویں ترمیم کو غیر معمولی دباؤ کو کم کرنے والے ایک ایسے حفاظتی آلے (safety valve) کے طور پر استعمال کیا جس کے ذریعے سیاسی نظام کا غبارہ پھٹ جانے سے قبل ہی ہوا کو اخراج کا راستہ مل جاتا اور اس امر کی یقین دہانی بھی حاصل ہو جاتی کہ ہر بڑی سیاسی جماعت کو باری باری اپنے مربیانہ روابط کی تسکین کا موقع مل

جائے۔ جب نواز شریف نے 1997 میں آٹھویں ترمیم کی منسوخی کے ذریعے اس طریق عمل کو ناکارہ بنا کر رکھ دیا تو اس طرح سے دباؤ کم کرنے والے خودکار آلے کو ہٹا دیا گیا اور یوں فوج کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہ رہا کہ وہ اس نااہل اور مسلسل آمرانہ طرز عمل اختیار کرتی ہوئی حکومت کو یا تو برداشت کرے یا پھر اس کے خلاف کاروائی کا کوئی اور طریقہ تلاش کرے۔ آزمائش کا وہ لمحہ کارگل واقعے کے کئی ماہ بعد اکتوبر 1999 میں اس وقت آیا جب نواز شریف نے مشرف کو اس کے عہدے سے سبکدوش کرنے کی کوشش کی جسے وہ اپنے لئے ایک ناقابل برداشت خطرہ تصور کرنے لگا تھا۔ ایک برس کے اندر اندر دوسرے آرمی چیف کی قبل از وقت برطرفی جیسی سنجیدہ صورت حال کے مدنظر فوج کو فیصلہ کرنا پڑا کہ یا تو اسے کوئی کاروائی کرنے پڑے گی یا پھر ادارے کی خودمختاری کھو دینے کا خطرہ مول لینا ہوگا۔ کیا فوج نواز شریف کے خلاف آخر کار ہر حال میں کاروائی کرنے پر مجبور ہوگئی ہوگی؟ میرا اندازہ یہ ہے کہ غالباً ایسا ہی ہوگا، اس لئے نہیں کہ اسے اقتدار کا لالچ تھا بلکہ اس لئے کہ نواز بھی بھٹو کی طرح اس بات پر تل چکا تھا کہ پاکستان میں طاقت کے تمام مراکز کو اپنی ذات کے اندر ہی مرتکز کر کے رکھ دے اور فوج کو یہ منظور نہیں تھا۔

فوج کی طرح سے کسی قسم کے خطرے سے بے نیاز مشرف اپنے سویلین پیشروؤں سے زیادہ عرصہ حکومت کرنے میں کامیاب ہوگیا تھا۔ مگر آخر کار اسے اپنی حکومت کی کارکردگی کے حوالے سے لوگوں کی بڑھتی ہوئی اس ناخوشی کے باعث اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑے جس کا سب سے اہم ماخذ اس کا نائن الیون کے بعد امریکہ سے کیا جانے والا فوجی اتحاد اور اس کے ردعمل میں پاکستان کے اندر ہونے والے دہشت گرد واقعات تھے۔ تاہم اس کے زوال کی سب سے اہم وجہ ایک ملکی سیاسی تنازعہ تھا، خاص طور پر سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کی برطرفی جس کی طرف سے خطرہ تھا کہ وہ اسے دوسری مرتبہ عہدہ صدارت کے لئے انتخاب لڑنے کے حوالے سے نااہل قرار دے دے گا۔ تاہم خطرے کا قبل از وقت تدارک کرنے کی اس کوشش کا نتیجہ وکیلوں کی طرف سے شدید ردعمل کی صورت میں نکلا جن کے جلسے جلوسوں کے ذرائع ابلاغ میں بہت نمایاں طور پر اجاگر کئے جانے کے ساتھ ہی عوام کی طرف سے بھی کافی پذیرائی ملی۔ اس وقت حزب مخالف کی دو بڑی جماعتوں، پی پی پی اور مسلم لیگ (ن) نے بھی وکلا کی تحریک کی بھرپور حمایت کردی اور یوں فوج اور اس کے ساتھ ہی مشرف کی مقبولیت میں تیزی سے آنے

والے زوال کو دیکھتے ہوئے اس کے فوج کے ساتھیوں نے اسے اقتدار سے دستبردار ہونے کا مشورہ دے دیا۔

وکلاء تحریک پاکستان میں سول سوسائٹی کے متحرک وفعال ہونے کی اولین علامت تھی۔ اس کے ظہور میں آنے کے باعث آزاد خیال دانشوروں کو یہ امید پیدا ہوگئی کہ اب اقتدار پر جاگیرداروں اور جرنیلوں کی گرفت بتدریج کمزور ہوتی چلی جائے گی۔ تاہم احتجاج کرتے ہوئے وکلاء کی کامیابی کا راز دراصل مشرف کی روز بروز گرتی ہوئی مقبولیت میں مضمر تھا۔ نتیجہ یقیناً مختلف ہوتا اگر یہی ڈرامہ چند برس قبل مشرف کے عروج کے زمانے میں ہوجاتا۔ جب مشرف ایک مرتبہ منظر عام سے غائب ہوگیا تو احتجاج کرتی ہوئی وکلاء برادری بھی اپنی سیاست کے تاریک بادلوں میں گم ہوکر رہ گئی۔ اس کی اقتدار سے برخواستگی کے بعد جاگیردار سویلین حکومت کی مکمل واپسی کی راہ بحال ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی فوج نے بھی بڑے باعزت اور محتاط انداز میں خود کو فاصلے پر کر لیا۔ پی پی پی اور مسلم لیگ ن سیاست کے خارزار میں طویل عرصے تک صعوبتیں اٹھاتے رہنے کے بعد آخر کار ملک کی مقبول ترین سیاسی جماعتوں کے طور پر سیاست کا افق پر ایک بار پھر یوں چمکنے لگیں جیسے مشرف کا کبھی کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ پہلے کی طرح ان کی توجہ کا مرکز پھر سے اپنے مربیانہ روابط کا استحکام اور پاکستان کو درپیش سنجیدہ مسائل کے حل کو ہر ممکن حد تک التواء میں ڈالے رکھنے کی پالیسی تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ایک ایسی حکومت کی صورت میں سامنے آیا جس کا انجام اتنا ہی واضح تھا جتنی کہ اس کی اہلیت۔ سیاسی جماعتیں، اور ان کے رہنما بھی آتے جاتے رہیں گے، فوج بھی آتی جاتی رہے گی مگر پاکستان کا طرز حکومت نہ بدلا ہے نہ بدلے گا۔

تاہم اس حقیقت کے باوجود کہ جاگیردارانہ سیاست ایک بہت ہی بُرے نظم ونسق کی ذمہ دار ہے، کسی کو بھی نظام میں حقیقی طور پر بنیادی تبدیلی لانے سے کوئی دلچسپی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ وکلاء تحریک کا بنیادی مقصد بھی محض اپنے شعبے کے مفادات کا تحفظ تھا نہ کہ معاشرے میں کوئی مجموعی تبدیلی لانا۔ اقتدار پر طبقہء امراء کی اجارہ دار کو للکارنے جیسی آزمائشوں میں پورا اتری ہیں، پاکستان اس طرح کی تبدیلی کے کوئی آثار نظر نہیں آتے۔ یہاں کوئی لینن یا فیڈل یا ماؤ نہیں پایا جاتا۔ پاکستانی عوام مسائل کی فراوانی کا رونا روتے رہتے ہیں مگر وہ امراء کی حکومت کا تختہ الٹ کر اس پر خود قابض ہوجانے کے لئے کسی قسم کا انقلاب لانے کی سنجیدہ اور منظم کوشش نہیں کرتے۔

جیسے ہی انتخابات کا دن قریب آتا ہے وہ جاگیرداروں کی کسی ایک جماعت کی حمایت میں اپنا حق رائے دہی استعمال کرنے کے لئے گھروں سے نکل کر پولنگ اسٹیشنوں کی طرف چل پڑے ہیں۔ اور جب فوج کسی حکومت کا تختہ الٹ کر آجاتی ہے یا کوئی نئی سویلین حکومت منتخب ہو کر آجاتی ہے تو ان کی امیدیں پھر سے جاگ اٹھتی ہیں۔اور جب دونوں قسم کی حکومتیں مسائل کے حل میں ناکام ہو کر رہ جاتی ہیں تو وہ بھی اپنے کندھے اچکا کر رہ جاتے ہیں۔وہ یہ سب کچھ کرتے ہیں اور مشکلات کا سامنا بھی کرتے ہیں کیونکہ پاکستان کا سیاسی نظام محض ان جاگیردارانہ روایات کی عکاسی کرتا ہے جن کی وہ صدیوں سے پیروی کرتے چلے آرہے ہیں۔

اگر حالات کو جوں کا توں رہنے دیا گیا اور انہیں تبدیل کرنے کی کوئی سنجیدہ کوشش نہ کی گئی تو پھر عین ممکن ہے کہ اپاہج نظام اسی طرح گھسٹتا رہے۔مگر پاکستان اس عیاشی کا زیادہ عرصہ تک متحمل نہیں ہوسکتا۔نظام کو لاحق خطرات اب سامنے آچکے ہیں اور یہ بہت سنجیدہ خطرات ہیں۔ بالشویک اور ماؤ کے برعکس جو کہ روس اور چین کی اشرافیہ حکومتوں کے خلاف برپا کئے گئے تھے، پاکستان میں ان خطرات کی پرورش پہلے ہی اس سیاسی نظام کی گود میں کی جاتی رہی ہے جس کی قیادت کو اب یہ جڑ سے ہی اکھاڑ دینا چاہتے ہیں۔یہ خطرہ انتہا پسند اسلامی نظریات کی صورت میں منڈلا رہا ہے۔ پاکستان کو شمال مغرب میں واقع اپنے قبائلی علاقوں کے اندر ایک ایسے اندرونی دشمن یعنی پاکستانی طالبان سے لاحق ہے جس کی اس نے کسی زمانے میں پشت پناہی کی تھی اور جس کے افغان ساتھیوں کی وہ ابھی تک حمایت جاری رکھے ہوئے ہے۔یہ دشمن جو کہ القاعدہ کے ساتھ الحاق کئے ہوئے ہے اور جسے پنجابی جہادیوں اور ان فرقہ وارانہ تنظیموں کی حمایت وتعاون بھی حاصل رہا ہے جن میں سے ہر ایک کو کسی زمانے میں ریاست نے بھی اپنے تعاون یا التفات سے نوازا تھا، پاکستان کے شمال مغرب میں ایک وسیع وعریض علاقے پر اپنا تسلط قائم کرنے کے ساتھ ہی ملک کے شہری علاقوں میں ایک موثر دہشت گرد مہم بھی چلا رہا ہے۔

زخموں پر نمک چھڑکنے کے لئے ،لشکر طیبہ نامی ایک جہادی تنظیم نے جسے ریاست نے پروان چڑھایا اور جس کے ساتھ وہ ابھی تک وفاداری کرتی آرہی ہے، بھارت کے خلاف نجی سطح پر انتقامی کاروائیوں کا سلسلہ جاری رکھا ہوا ہے جس کے نتیجے میں پاکستان ایک سے زیادہ مرتبہ غیر مطلوبہ قسم کی جنگ کے دہانے تک پہنچ گیا تھا۔شدت پسند نظریات کی آماجگاہ مسجدوں اور

مدرسوں کی تعداد میں مسلسل اضافہ جو کہ بہت سی تنظیموں کے لئے نرسری کا کام کرتی ہیں، جنوبی پنجاب میں سرائیکی بیلٹ جیسے علاقوں میں بڑھتی ہوئی مذہبی شدت پسندی کا منہ بولتا ثبوت ہیں۔ یہ علاقے طویل عرصے سے فرقہ ورانہ فسادات کی لپیٹ میں آئے ہوئے ہیں۔ ان جاگیردار سیاستدانوں اور فوجی افسروں کے غیر فطری اتحاد پر مبنی حکومتوں کے زیر سایہ، جن میں سے ہر ایک پر خود اپنے ہی مفادات کے حصول کا جنون طاری ہوتا ہے اور جو ملک کو درپیش سنجیدہ مسائل سے صرف نظر کرنے کی طرف مائل رہتے ہیں، پاکستان مذہبی انتہاء پسندی کے زور بروز بڑھتے ہوئے خطرے سے نمٹنے کی کسی بھی صلاحیت سے محروم نظر آتا ہے۔ ملکی نظم ونسق کے ذمہ دار لوگوں نے خود اس خطرناک دلدل میں کسی طرح دھنسا لیا؟ چونکہ انہیں جس نوعیت کی شدت پسندی کا سامنا ہے اس کی جڑیں مذہبی عقیدے میں پیوست ہیں، اس لئے اب ہم پاکستانی معاشرے اور سیاست میں مذہب کے کردار کا قریبی جائزہ لیتے ہیں۔

MashalBooks.org

3

مذہب، ضیاء اور افغانستان میں روس مخالف جہاد

اگر فرقہ ورانہ فسادات، خودکش حملوں، سر کاٹنے کے دل دہلا دینے والے واقعات اور لاہور میں واقع اپنے دفاتر سے کام کرنے والی تنظیم لشکر طیبہ کی طرف سے ممبئی میں خوفناک دہشت گرد حملوں کی خبروں پر مبنی اخباری شہ سرخیوں پر ہی اکتفا کیا جائے تو یہی تاثر ملے گا کہ پاکستان مذہبی جنونیوں کی قوم ہے۔

تاہم سچائی کبھی بھی چھپی نہیں رہ سکتی۔ پاکستانی سیاست کی طرح، پاکستانی مذہبی روایات پر بھی جاگیردارانہ ثقافت کے گہرے اثرات پائے جاتے ہیں۔ سیاسی طبقے کی بہت سی شخصیات کی طرح، اکثر پاکستانی ایک ایسے اسلام کی پیروی کرتے ہیں جو جنوبی ایشیاء کی ایک اپنی منفرد طرز کی صوفیانہ روایات سے مشابہت رکھتا ہے اور جس میں مقدس ہستیوں کی، جنہیں پیر کہا جاتا ہے، تعظیم و تکریم کی جاتی ہے۔ کئی صدیوں سے معروف چلے آنے والے پیروں کو صوفیاء کا لقب دے دیا جاتا ہے۔ ان کے مزارات جو پورے پاکستان کے اندر بکھرے نظر آتے ہیں، نہ صرف زیارت اور عبارت کے مراکز ہیں بلکہ وہاں سالانہ عرس کی تقریبات بھی ہوتی ہیں جو ان کی اموات اور ابدی زندگی کے سفر کی یاد میں منعقد کی جاتی ہیں۔ ان تقریبات کو میلوں ٹھیلوں کے ماحول اور دیگر دلکش تفریحی پروگراموں کی بدولت جن میں نہ صرف پاکستانی طرز کے تفریحی جھولے بلکہ جنہیں مخالف کے ملبوسات پہن کر دیوانہ وار رقص کرنے والوں کے مظاہرے بھی ہوتے ہیں، بہت شہرت اور مقبولیت حاصل ہوتی ہے۔ یہ یقیناً اسامہ بن لادن یا طالبان لیڈر ملا عمر کا اسلام نہیں ہے۔ یہ ایک خوبصورت منظر کا حامل ایسا مذہب ہے جو رواداری اور امن کا درس

دیتا ہے۔

پاکستانی پیر بھی زیادہ تر جاگیرداروں کا طرز زندگی اپنائے ہوئے ہیں۔ ان میں سے اکثر کے پاس خود اپنی زمینیں ہیں اور بعض سیاست میں بھی قدم جما چکے ہیں۔ پاکستان کی جاگیردارانہ ثقافت میں ان کی سرگرمیوں کو اس مربی۔طفیلی رشتے کا متبادل یا مماثل سمجھا جا سکتا ہے جو پاکستان کے سیکولر معاشرے کو باہم متحد رکھے ہوئے ہے۔ مزارعین اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل اور مشکل کے وقت مدد کے حصول کے لئے زمینداروں پر انحصار کرتے ہیں، جبکہ سیاستدان انتخابات میں کامیابی کے لئے اپنے مربیانہ روابط پر انحصار کرتے ہیں۔ تاہم مربی اور طفیلی دونوں اللہ سے رابطے کے لئے پیر کو ایک وسیلے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ دو فریقوں کے درمیان ثالثی کا وہ کردار ہے جو جنوبی ایشیائی خصوصیت کے حامل صوفیانہ اسلام کو ان دوسری اصناف سے منفرد بناتا ہے جن کے مطابق خدا اور بندے کے درمیان تعلق براہ راست ہوتا ہے۔

لہذا کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ یہ صوفیانہ طرز کا اسلام ایک ایسی ثقافت کی پیداوار ہے جس کی بنیاد باہمی احسانات پر رکھی گئی ہے۔ مذہبی عقائد رکھنے والے اپنے پیروں کو بالکل اسی طرح محبت اور عقیدت سے نوازتے ہیں جس طرح مزارع اپنے زمیندار کے لئے فصلیں اگاتا ہے۔ دونوں یہ سب کچھ اس توقع پر کرتے ہیں کہ انہیں جوابی طور پر مدد اور سرپرستی سے نوازا جائے گا۔ ایک کو دینی امور میں اور دوسرے کو دنیوی امور میں۔ جاگیردار دیہاتوں میں مذہبی عقیدت مند اور فصلیں اگانے والا اکثر اوقات ایک ہی شخصیت ہوتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ محض مزارعین نہیں ہوتے جو جو پیر سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ ان کے ایماء پر اللہ سے رابطہ کرے گا بلکہ وہ زمیندار بھی جن کے لئے وہ کام کرتے ہیں۔ تقریباً یہی کچھ دیہی معاشرے کے تمام باشندوں کے لئے کہا جا سکتا ہے۔ جس طرح کہ جاگیردارانہ سیاست میں ہوتا ہے، صوفیانہ اسلام کی یہ شکل محض دیہاتوں کی امتیازی خصوصیت کے طور پر کافی عرصے سے اپنا مقام کھو چکی ہے۔ جیسا کہ دیہاتوں سے نقل مکانی کر کے اکثر لوگ شہروں اور قصبوں میں جا بسے ہیں، لہذا وہ اپنے مذہبی عقائد بھی اپنے ساتھ لے گئے ہیں۔ ایک پیر نے اسلام آباد کے مرکزی علاقے میں میری رہائش سے تھوڑے ہی فاصلے پر اپنا گھر بنایا ہوا تھا۔ وہ جب کبھی اپنے ڈیرے پر ہوتا تو وہاں دن میں اس کے مریدوں کا جمگھٹا لگا ہوتا اور رات کو پورا گھر وہاں پر نصب سفید بلبوں کے جمگھٹے میں جگمگاتا نظر آتا۔

اس طرز کے اسلام کی پیروی کرنے والوں کو عموماً بریلوی کہا جاتا ہے۔ یہ نام شمالی ہندوستان کے شہر بریلی سے منسوب ہے، جہاں 1880 کے لگ بھگ خطے کے روایتی دیہی مذہب کے تحفظ و تلقین کے لئے ایک مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ جنوبی ایشیا میں مقبولیت حاصل کرنے والے اس مخصوص طرز کے اسلام کی ایک خصوصیت جو کہ خاص طور پر قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ اس میں ہندومت کی بہت سی رسومات، مثلاً موسیقی وغیرہ سرایت کر گئے ہیں اور اس کی ایک شکل قوالی ہے جو کہ عقیدت کے طور پر مزاروں پر کی جاتی ہے اور جو اسلام کے کسی اور فرقے میں موجود نہیں ہیں۔ ان رسومات کا اپنانے کا مقصد برصغیر میں آنے والے مسلمان مبلغین کے نزدیک یہ تھا کہ عملیت پسندی سے کام لیتے ہوئے ہندوؤں کی بعض رسومات کو اپنی تعلیمات میں شامل کر لیا جائے تا کہ اسلام میں کچھ ایسی کشش پیدا ہو جائے کہ زیادہ سے زیادہ لوگ اس کی طرف راغب ہو سکیں۔ اسلام کی اس نمایاں اور غیر قدامت پسند شکل کو دیکھتے ہوئے یہ امر باعث حیرت نہیں ہے کہ اس کا بہت شدید ردعمل ہوا۔ اس کا اظہار دیوبندی فرقے کی تشکیل کی صورت میں سامنے آیا جس کا نام شمالی ہندوستان کے شہر دیوبند سے اخذ کیا گیا تھا جہاں اس نام کا پہلا مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ اگرچہ دیوبندی صوفیا کو مسلسل عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھتے آرہے ہیں مگر ان کا مقصد یہ تھا کہ جنوبی ایشیاء کے صوفی اسلام کو ان در انداز روایات یا بدعتوں سے پاک صاف کر دیا جائے اور اسلام کو واپس وہ کھویا ہوا مقام عطا کر دیا جائے جس کی بنیاد اس کے اصل ماخذ یعنی قرآن اور حدیث میں تھی۔ اس کا نتیجہ ایک ایسے کٹر قسم کے اسلام کی صورت میں برآمد ہوا جس میں بنیادی تعلیمات کی طرف رجوع کرنے کے ساتھ ہی نہ صرف جنوبی ایشیاء کے صوفی اسلام کو بلکہ دوسرے فرقوں بشمول شیعہ اسلام کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا کیونکہ شیعہ اسلام بھی ان کے نزدیک ملحدانہ عقیدے کا حامل تھا۔ اس نظریئے کے مبلغین نے اپنے عقیدے کا پورے برطانوی ہندوستان میں پرچار شروع کر دیا جسے خاص طور پر صوبہ سرحد کے پشتونوں میں بہت مقبولیت ملی جن کا اپنا قبائلی ضابطہ یعنی پشتون ولی اس بنیاد پرستانہ قسم کے نظریئے کے لئے زرخیز زمین ثابت ہوا۔ تاہم وہاں بھی یہ صوفیانہ روایات کو جڑ سے اکھاڑنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔

آج دیوبندی نظریات نہ صرف پشتونوں کے اندر گہری جڑیں پکڑ چکے ہیں، بلکہ اس کے علاوہ پورے پاکستان میں خاص طور پر پنجاب کے شہری نچلے متوسط طبقے سمیت بے شمار مساجد

اور مدارس کے قیام کے ذریعے، خصوصاً جنوبی پنجاب کی سرائیکی پٹی کے اندر، لوگوں کی بڑی تعداد میں سرایت کر چکے ہیں، اگرچہ زیادہ تر دیوبندی تشدد کی طرف اس قدر مائل نہیں رہے جتنا کہ مغرب میں ان کے عیسائی بنیاد پرست ہم منصب، تاہم پاکستان میں قائم کردہ ماسوائے ایک کے تمام جہادی تنظیمیں دیوبندی فرقے سے تعلق رکھتی ہیں اور یہی صورتحال افغان طالبان کی ہے۔ جہاں بریلوی جیو اور جینے دو کے اصول پر مبنی عقیدے کے حامل ہیں۔ان کی تبلیغی جماعت کے ارکان پوری دنیا میں سفر کر کے مختلف ملکوں کی مقامی مسلمان آبادی میں اپنے کٹر دیوبندی نظریات کا پرچار کرتے ہیں۔ دیوبندی اپنے مخصوص اسلامی نظریات کی تعلیم کے فروغ کے حوالے سے بھی خاصے متحرک ہیں۔ پاکستان کے نصف سے زائد مدرسے دیوبندی فرقے کے زیرانتظام ہیں۔ یہ تیزی سے پھیلتا ہوا مذہب ہے۔

اس کے علاوہ پاکستان میں کسی بھی حجم کا دوسرا واحد سنی فرقہ اہل حدیث ہے جس کے پیروکار تعداد میں بہت کم ہیں۔ دیوبندی فرقے کی طرح یہ بھی بنیاد پرست قسم کے اسلامی نظریات کا پیروکار ہے جو کہ سعودی عرب کے وہابی فرقے سے مماثلت رکھتا ہے، وہ فرقہ جس کے پیروکاروں میں اسامہ بن لادن اور سعودی عرب کا شاہی خاندان شامل ہیں۔ اہل حدیث اور دیوبندیوں کے بنیاد پرست نظریات میں زیادہ اختلافات قرآن اور حدیث کی تشریحات میں فرق کے حوالے سے ہیں جو کہ اہل حدیث کی مثال اور بھی زیادہ لفظی نوعیت کے ہیں۔ اہل حدیث کو سب سے زیادہ شہرت اسلئے ملی ہے کہ یہ پاکستان کے ایک جہادی گروپ لشکر طیبہ کو جنم دینے والا وہ فرقہ ہے جو دیوبندی نہیں ہے۔

اس وقت تین سنی فرقے ایسے ہیں جو ایک دوسرے کے تکلیف دہ حد تک مخالف ہیں۔ بریلوی اور دیوبندی فرقے کے درمیان مخاصمت ایک سو برس سے زیادہ پرانی ہے۔ اگرچہ دیوبندی اسکول جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے نمایاں طرز کے صوفیانہ اسلام کے ردعمل میں قائم کیا گیا تھا، تاہم یہ اصل میں بریلوی مدرسے کے قیام سے ایک عشرہ سے بھی زائد عرصہ پہلے قائم ہو چکا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بریلویوں کی جانب سے اپنا مدرسہ قائم کرنے کی ایک اہم وجہ برصغیر کے روایتی مذہب کو نئے وجود میں آنے والے دیوبندی نظریات کی یلغار سے بچانا تھا۔ تاہم پاکستان میں بنیادی فرقہ ورانہ تقسیم دیوبندی۔ بریلوی تقسیم نہیں ہے بلکہ سنّی۔ شیعہ تقسیم ہے جو کہ اسلامی دنیا

میں پائے جانے والے ایک اجتماعی نقص یا اختلاف کی عکاسی کرتی ہے۔ کسی کو بھی یقینی طور پر معلوم نہیں ہے کہ پاکستان میں شیعہ آبادی کا تناسب کیا ہے کیونکہ آبادی کا سروے کرنے والوں کو یہ سوال پوچھنے کی اجازت نہیں ہے۔ خام اندازوں کے مطابق یہ تناسب 15 تا 25 فی صد ہے۔ بریلویوں کی طرح پاکستانی شیعہ بھی اس سرزمین میں اپنی جڑیں پھیلا چکے ہیں اور ان کی اپنی صوفی روایات ہیں۔ بڑے بڑے جاگیرداروں میں بھی شیعہ اچھی خاصی نمائندگی رکھتے ہیں اور اقتدار ایوانوں تک ان کو آسانی سے رسائی حاصل ہوگئی ہے۔ محمد علی جناح اور ذوالفقار ہی بھٹو دونوں شیعہ تھے۔ چنانچہ اس پس منظر میں یہ حقیقت سمجھنے میں مدد ملتی ہے کہ جناح کے تصور میں پاکستان ایک نظریاتی ریاست کی نسبت صرف جنوبی ایشیائی مسلمانوں کا وطن ہی کیوں تھا؟ حتیٰ کہ آج بھی پی پی پی اور دونوں مسلم لیگوں (ن اور ق) میں شیعہ سیاستدانوں کی اچھی خاصی تعداد موجود ہے۔ یہ ان کے بریلوی رفقائے کار کی رواداری کا منہ بولتا ثبوت ہے جن کی سیاست تو محاذ آرائی کی سیاست ہو سکتی ہے مگر تہذیب نہیں۔ پاکستان مین دو بڑی مذہبی سیاسی جماعتیں پائی جاتی ہیں۔ جمعیت علمائے اسلام جو کہ جے یو آئی کے منفرد مخفف کے ساتھ مشہور ہے، صوبہ سرحد اور شمالی بلوچستان میں اثر و رسوخ رکھنے والی ایک علاقائی جماعت ہے۔ اس کے ارکان دیوبندی نظریات رکھنے والے پشتون نسل کے لوگ ہیں۔ اس کی بنیاد تقسیم سے ذرا ہی پہلے اس وقت رکھی گئی تھی جب اس کے بانی کا اپنی ہندوستانی بانی تنظیم (دارالعلوم دیوبند) سے پاکستان کی ایک الگ ریاست کے طور پر حمایت کے مسئلے پر اختلاف ہو گیا تھا۔ اس کے بڑے دھڑے کی سربراہی طویل عرصے سے مولانا فضل الرحمٰن کے پاس چلی آ رہی ہے جو کہ مولانا ڈیزل کے لقب سے معروف ہیں۔ انہیں یہ لقب بے نظیر بھٹو کے دوسرے دور حکومت میں ڈیزل کی فروخت کے بعض مشکوک سودوں میں ملوث ہونے کی بنا پر عطا کیا گیا تھا۔ صوبہ سرحد میں یہ پشتونوں کی سیکولر جماعت عوامی نیشنل پارٹی (اے این پی) کا مذہبی متبادل ہے۔

تاہم پاکستان کی سب سے بڑی اور بااثر سیاسی جماعت، جماعت اسلامی ہے۔ اس کی بنیاد مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے رکھی تھی جو کہ پیشے کے لحاظ سے ایک صحافی تھے مگر بعد ازاں ایک مذہبی مصلح بن گئے اور تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو گئے۔ جماعت خود کو ایک ایسے پر امن اسلامی انقلاب کا ہراول دستہ سمجھتی ہے جو ملک میں شریعت کی حکمرانی قائم کرے گی اور لادینی

ضوابط کی جگہ ایسے اخلاقی اور قانونی ضوابط نافذ کرے گی جن کی بنیاد وہ نمونے یا مثالیں ہوں گی جو قرآن میں دی گئی ہیں یا پیغمبرؐ اسلام کی عملی زندگی کے ان واقعات سے اخذ کی جائیں گی جو حدیث کی صورت میں محفوظ کر لئے گئے ہیں۔ شریعت کے نفاذ کا یہ مطالبہ سیاسی اسلام کا وہ جزو لازم ہے جس پر جہادی تنظیموں مثلاً القاعدہ اور طالبان کے علاوہ ان جماعتوں کا بھی اتفاق ہے جو نظام کے اندر رہ کر کام کرنے پر آمادہ نظر آتی ہیں، مثلاً جماعت اسلامی۔ اگر چہ یہ بلاشرکت غیرے جنوبی ایشیائی ماحول کی پیداوار ہے مگر جماعت ایک لحاظ سے اسلامی سیاسی جماعتوں کی جانب سے چلائی جانے والی وسیع تر تحریک کا حصہ ہے۔ جیسا کہ طویل عرصہ تک اس کی رہنمائی کرنے والے قاضی حسین احمد نے مجھ سے وضاحت کرتے ہوئے کہا کہ یہ نظریات کی رو سے مصر کی اخوان المسلمین اور ترکی کی رفاہ پارٹی کے قریب تر ہے جو اگر چہ 1998 میں حکومتی پابندیوں کی زد میں آ گئی تھی، تاہم ترکی میں اس وقت برسر اقتدار جماعت سے دوسرے نمبر پر تھی ایک بنیاد پرست اسلامی تنظیم کے لئے غیر معمولی نظر آنے والی اس کی ایک خصوصیت اس کا غیر فرقہ ورانہ رنگ ہے۔ اس کی رکنیت اگر چہ تمام بڑے سنّی فرقوں پر مشتمل ہے، تاہم اس کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے میرے سامنے اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ تقریباً دو تہائی ارکان دیوبندی نظریات رکھتے ہیں یہ ایک طرح سے خاص کی جماعت بھی ہے جو کہ اپنی مرکزی رکنیت جان بوجھ کر نچلی سطح پر رکھتی ہے۔ اگر چہ یہ دس لاکھ سے زائد ہمدردارکان کی حمایت پر انحصار کر سکتی ہے مگر 12000 ارکان کے مختصر دستے کو ہی مکمل رکنیت حاصل ہے۔ یہ غریب اور محروم طبقے کی جماعت نہیں ہے بلکہ نسبتاً خوشحال طبقے کی نمائندہ ہے۔ اس کو زیادہ حمایت مذہبی رجحان کے حامل مگر پیشہ ور صلاحیتیں رکھنے والے تعلیم یافتہ متوسط طبقے سے ملتی ہے۔ اس مفہوم میں جماعت کو ایک لحاظ سے اس جاگیردارانہ سیاسی نظام کے ردعمل کے طور پر ابھرنے والی متوسط طبقے کی جماعت کہا جا سکتا ہے جسے یہ ضمیر فروشی اور ڈھٹائی کی حد تک بدعنوانی پر مبنی نظام قرار دیتی ہے۔

جماعت نے شروع میں قیام پاکستان کی مخالفت کی تھی کیونکہ اسے خدشہ تھا کہ جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کو متحد کرنے کی بجائے تقسیم کر کے رکھ دے گی، تاہم اس کے بعد سے یہ کافی حد تک قوم پرست جماعت بن کر رہ گئی ہے۔ مودودی ہندوؤں کو پسند نہیں کرتے تھے اس لئے نتیجے کے طور پر جماعت بھی بنیادی طور پر تقریباً ہندو مخالف اور یوں بھارت مخالف تنظیم بن کر رہ گئی ہے

اور اس مزاج کی بنیاد پر اس کا اکثر و بیشتر فوج سمیت دیگر سیکولر قوم پرستوں سے بھی اتحاد ہوتا رہا ہے۔ یہ کشمیر کو بھارتی تسلط سے چھڑانے کے نظریے پر بھی کار بند رہتی ہے۔

اگر چہ جماعت اسلامی اور جے یو آئی واضح طور پر دو مختلف الخیال رائے دہندگان کی نمائندہ جماعتیں ہیں، تاہم یہ طویل عرصے سے خود کو ایک دوسرے کا حریف تصور کرتی آ رہی ہیں۔ مگر انتخابات میں کسی نے بھی کبھی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ انتخابی میدان میں ان کی واضح شناخت اس وقت سامنے آئی جب 1970 کے اولین قومی انتخابات میں انہوں نے دس فیصد نشستیں حاصل کر لی تھیں۔ جے یو آئی نے بھی 2002 میں صوبہ سرحد کے صوبائی انتخابات میں اس وقت اچھی کارکردگی دکھائی تھی جب افغانستان پر امریکی حملے کے شدید ردعمل کے طور پر اسے بھاری اکثریت کے ساتھ اقتدار کے ایوانوں تک پہنچا دیا گیا۔ معمول سے ہٹ کر دکھائے گئے ان مظاہروں کے علاوہ جماعت اور جے یو آئی قومی اور صوبائی اسمبلیوں میں عام طور پر بہت کم نشستیں ہی حاصل کرتی ہیں۔ تاہم ان کے سیکولر قومی جماعتوں کی سربراہی میں بننے والی کثیر فریقی حکومت میں شمولیت کے لئے بعض اوقات اتنا ہی کافی ہوتا ہے کیونکہ اس طرح کی صورتحال میں جب کسی ایک جماعت کے پاس بھی واضح اکثریت نہ ہو تھوڑی سی تعداد بھی زیادہ سے زیادہ فوائد دلوا سکتی ہے۔ انتخابی میدان میں ان کی ناقص کارکردگی کو سمجھنا مشکل نہیں ہے۔ چونکہ وہ جاگیردارانہ نظام سے باہر ہیں اس لئے وہ مربیانہ روابط کے اس سلسلے سے منسلک نہیں ہیں جو سیاست کے بڑے دھارے کا رخ متعین کرتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان کے ماہر سیاسی امور محمد وسیم نے مجھے بتایا مذہبی جماعتیں جاگیردارانہ سیاست کے گر نہیں جانتیں جہاں رائے دہندگان ایسے امیدواروں کو ووٹ دیتے ہیں جو انہیں یہ یقین دلانے میں کامیاب ہو جائیں کہ وہ ان کا بجلی کا کافی عرصے سے واجب الادا بل بھرنے میں ان کی مدد کر کے صحیح معنوں میں ان کے کام آئیں گے۔

مذہبی جماعتوں کے پاس، مبینہ طور پر جو کچھ ہے، وہ گلی کوچوں میں عوام کو متحرک کرنے کی طاقت ہے: یعنی نچلی سطح پر لوگوں کو اس طرح سے متحرک کرنے کا رجحان یا صلاحیت جس سے روزمرہ زندگی کے معمولات میں خلل واقع ہو جائے اور مطالبات تسلیم نہ ہونے کی صورت میں تشدد کی ڈھکی چھپی دھمکی۔ اگر چہ یہ ساکھ تو مبنی بر حقیقت ہے مگر اصل حقیقت کچھ اور ہے۔ جماعت نے 1953 کے ان مظاہروں میں بھرپور حصہ لیا تھا جن کا مقصد احمدیوں کے تعداد میں کم مگر سماجی

طور پر اس موثر فرقے کو کافر قرار دلوانا تھا جن کا دعویٰ تھا کہ ان کا بانی مرزا غلام احمد رسول اللہ ا کا جانشین تھا۔ یعنی ایک ایسا دعویٰ جو اعتدال پسند مسلمانوں کے نزدیک بھی ملحدانہ قسم کا تھا۔ یہ ذوالفقار علی بھٹو کے خلاف عوامی سطح کی اس تحریک میں بھی پیش پیش تھی جس کے نتیجے میں اسے اقتدار سے ہاتھ دھونے پڑے تھے۔ اس کی طلباء تنظیم کافی عرصے تک اعلیٰ تعلیمی اداروں کے اندر خوف اور دہشت کی علامت بنی رہی۔ تاہم حالیہ تاریخ میں ایسی کوئی مثال بمشکل ہی نظر آتی ہے کہ مذہبی جماعتوں نے واقعی کوئی عوامی تحریک چلائی ہو یا ریاست کو کسی طرح کے سنجیدہ نقصان سے دو چار کیا ہو۔ یہ نکتہ میرے سامنے پی پی پی کی ایک اہم شخصیت نے اس واقعہ کو یاد کرتے ہوئے اجاگر کیا تھا جب جماعت اسلامی نے بے نظیر بھٹو کی پہلی حکومت کے دوران اسلام آباد میں قومی اسمبلی کی طرف ایک جلوس کی صورت میں پیش قدمی شروع کر دی تھی۔ پولیس کو جلوس روکنے کے احکامات جاری کر دیئے گئے تھے۔ اگرچہ جلوس کے شرکاء دو مرتبہ کئے جانے والا لاٹھی چارج تو برداشت کر گئے تھے مگر جب پولیس نے ہوائی فائرنگ کا سلسلہ شروع کر دیا تو اس کے بعد انہوں نے نظم وضبط کی پرواہ کئے بغیر دوڑیں لگا دیں۔ ہماری گفتگو کا آغاز گزشتہ صفحات میں بیان کردہ 1999 میں لاہور میں منعقدہ اس سربراہی ملاقات کے فوری بعد ہوا جس میں نواز شریف نے اٹل بہاری وجپائی کو مدعو کیا تھا۔ پی پی پی کے عہدیدار نے اس امر پر کافی اطمینان کا اظہار کیا کہ جماعت نے اس ملاقات کو بھی ناکام بنا کر رکھ دینے کا دعویٰ کیا تھا مگر لاہور پولیس نے انہیں لتاڑ کر رکھ دیا تھا۔ مشرف حکومت نے بھی نائن الیون کے بعد افغانستان پر ہونے والے امریکی حملے کے نتیجے میں جماعت کی طرف سے کئے جانے والے مظاہروں کا بڑی کامیابی سے سامنا کیا تھا۔ اس کے باوجود ایک ایسے ملک میں جہاں کے حکمران معمولات میں تعطل سے اجتناب کے حوالے سے سنجیدہ ہوں تو تشدد کی دھمکی اکثر اوقات اتنی ہی موثر ثابت ہوتی ہے جیسا کہ تشدد کی حقیقی لہر۔ جنرل ضیاء کے دور سے ہی مذہبی جماعتیں اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتی چلی آ رہی ہیں تاکہ اپنے ہم پلہ سیکولر سیاستدانوں پر جو جلد ہی خوفزدہ ہو جاتے ہیں زیادہ سے زیادہ دباؤ ڈال سکیں۔

ضیاء پاکستانی فوج کا ایک ایسا افسر اعلیٰ تھا جو کہ ایک پارسا دیوبندی خاندان سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کا اقتدار کے ایوانوں تک غیر متوقع عروج تاریخ کے ان حادثات میں سے ایک تھا جو اکثر و بیشتر قوموں کی منزل کا تعین کرتے ہیں۔ وہ آرمی چیف کے عہدے پر اس وقت فائز ہوا

جب ذوالفقار علی بھٹو نے بہت سے سینئر جرنیلوں کو نظر انداز کر کے صرف اس لئے اسے ترجیح دی تھی کیونکہ وزیر اعظم کے ساتھ اس کا روّیہ انتہائی خوشامدانہ تھا۔ اگر کچھ تھا تو وہ اس کا تسلیم کردہ مذہبی رجحان ہی تھا جس کی بناء پر بھٹو کے سامنے اس کی یہ کہہ کر سفارش کی گئی تھی کہ ایک پارسا جرنیل اس کے سویلین اقتدار کو نہیں للکارے گا۔ خوشامدی تھا یا نہیں مگر ضیاء کے اندر اتنی جرأت ضرور پیدا ہو گئی تھی کہ 1977 کے قومی انتخابات کے ناقابل یقین حد تک بہترین نتائج کے ردعمل کے طور پر شروع کی جانے والی ملک گیر بھٹو مخالف تحریک کے نتیجے میں اپنے خیر خواہ کے خلاف کاروائی کرے۔ بھٹو کو اقتدار سے برطرف کرنے پر بھی اسے چین نہ آیا تو اس نے اس پر قتل کے الزامات میں مقدمہ چلوانے کی سازش تیار کی اور پوری دنیا سے بڑی بڑی شخصیات کی طرف سے اس کی جان بخشی کے لئے کی جانے والی التجاؤں کو بھی سختی سے نظر انداز کر دیا۔ ضیاء کو یہ خوف تھا کہ جب تک بھٹو زندہ رہے گا اس وقت تک اس کی جان اور اقتدار دونوں کو خطرہ لاحق رہے گا۔

بھٹو سے مستقل طور پر نجات حاصل کرنے کے بعد ضیاء کے سامنے بھی اقتدار کے قانونی جواز کا وہی مسئلہ آ گیا جو تمام فوج حکمرانوں کو درپیش آتا ہے۔ اس کا ترپ کا پتہ ''مذہب'' تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں جناح نے پاکستان کا تصور جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے ملک کے طور پر کیا تھا نہ کہ ایک نظریاتی اسلامی ریاست کے طور پر۔ جماعت اسلامی نے اس تصور سے اختلاف کیا تھا مگر اس کو روادار بریلوی اکثریت کی حامل اس ریاست میں زیادہ پذیرائی نہ ملی جس کے باشندے ریاستی معاملات کو جاگیردارانہ سیاسی نظام کے سپرد کرنے پر تیار تھے۔ تاہم ضیاء کی شکل میں آخر انہیں اپنے خوابوں کی تعبیر مل گئی۔ اس نے جماعت کی خدمات کو سراہا اور ملک کو سختی سے اس کی تجاویز کے مطابق چلانے کا فیصلہ کرتے ہوئے خاص طور پر ایسے اقدامات کرنے شروع کر دیئے جن کا مقصد ملک میں سنی طرز کے اسلام کا نفاذ کرنا تھا۔ شریعت دوبارہ کاروبار حکومت بن گئی۔

سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے ایک عدد وفاقی شرعی عدالت قائم کر ڈالی جس کو اسلامی نظریات سے متصادم قوانین کی تنسیخ کا اختیار مل گیا تھا۔ اس نے تعزیرات پاکستان کے کچھ حصوں میں ترمیم کر کے ان کی جگہ حدود آرڈیننس کے قوانین نافذ کر دیئے۔ ان رجعت پسندانہ قوانین کے تحت ان سزاؤں کا اطلاق کر دیا گیا جو قرآن اور حدیث سے اخذ کی گئی تھیں۔ ان میں چند ایک

مخصوص قسم کے جرائم، مثلاً عصمت دری، بدکاری، مذہب کی بے حرمتی اور چوری وغیرہ کے لئے سنگساری، کوڑے مارنا، اور ہاتھ پاؤں وغیرہ کاٹ دینے کی سزائیں شامل تھیں جن پر عملدرآمد کی ذمہ داری روایتی اسلامی قوانین کے مطابق ریاست پر عائد ہوتی ہے۔ تاہم خوش قسمتی سے مساویانہ طور پر سخت گیر قوانین شہادت کی بناء پر جو کہ جرم کے ثبوت کے طور پر ضروری تھے، مثلاً دو یا دو سے زائد اشخاص کی شہادت وغیرہ ان سخت گیر قسم کی سزاؤں کا یا تو بہت کم صورتوں میں اطلاق ہوا یا پھر ان پر سے سے عملدرآمد ہی نہ ہوا۔ حدود آرڈیننس میں سب سے بدنام زمانہ آرڈیننس وہ تھا جس میں عصمت دری کے حوالے سے قوانین کا احاطہ کیا گیا تھا۔ ایک عورت اگر کسی پر عصمت دری کا الزام عائد کرتی تھی تو اس کے لئے ثبوت کے طور پر چار مردوں کی گواہی پیش کرنی ضروری تھی، جو کہ عملی طور پر تقریباً ناممکن کام تھا۔ عصمت دری کے ملزم پر الزام ثابت کرنے میں ناکامی کا نتیجہ تاہم عورت پر بدکاری کے الزام کی صورت میں نکل سکتا تھا کیونکہ عصمت دری کے الزام کے اندر یہ اعتراف مضمر ہوتا تھا کہ عورت نے اس کے ساتھ جنسی فعل کیا ہے۔ دوسری طرف مذہبی جذبات کی بے حرمتی کا قانون مقامی حکام کی طرف سے عیسائی اور دوسری مذہبی اقلیتوں کو ہراساں کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔

ضیاء نے فرقہ ورانہ آگ کو ہوا دینے کے لئے زکوٰۃ کی کٹوتی بھی لازمی قرار دے دی۔ اگرچہ سُنیوں کے لئے تو یہ قابل قبول تھا مگر شیعہ اس سے ناخوش تھے جنھوں نے اس کے خلاف آواز بلند کرنی شروع کر دی۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے اقدامات جو کہ شیعہ فقہ کے خلاف اور خاص طور پر اس کے لئے بھی موجب فساد تھے کہ ان کا نفاذ ایک ایسے وقت میں عمل میں آیا جب کہ ہمسایہ ملک ایران میں تازہ تازہ اسلامی انقلاب نے پاکستان کے اندر شیعہ فرقے کی مذہبی حس کو تیز کر دیا تھا۔ شیعہ تنظیم تحریک نفاذ فقہ جعفریہ (TNFJ) کا قیام عمل میں لایا گیا تا کہ ملک میں شیعہ فرقے کے مفادات کے تحفظ و فروغ کا مقصد حاصل کیا جائے اور یہ تحریک ضیاء کے زکوٰۃ وعشرہ آرڈیننس اور اس طرح کے دوسرے اقدامات کی مخالفت میں بھی پیش پیش تھی۔ اگرچہ ضیاء نے اپنی غلطی تسلیم کر لی اور شیعوں کو زکوٰۃ کی لازمی کٹوتی سے مستثنیٰ قرار دے ڈالا، تاہم شیعہ۔ سُنی فساد کے اولین بیج بو دیئے گئے تھے۔ ضیاء نے بریلوی آبادی کو بھی پریشان کر کے رکھ دیا تھا جو حکومت کی طرف سے مساجد اور مزارات کو ضوابط کے تحت لانے کی کوششوں پر سخت نالاں تھی جو ان کے

خیال میں دیوبندیوں کو خوش کرنے کی پالیسی تھی۔ یوں ان دو فرقوں کے درمیان کشمکش شروع ہوگئی اور اس کا نتیجہ 1984 میں بادشاہی مسجد لاہور میں بڑے تصادم کی صورت میں نکلا۔ ضیاء کی غلطی یہ تھی کہ وہ ایک ایسے معاشرے میں اسلامی شریعت نافذ کرنے کی کوشش کر رہا تھا جس میں مختلف فرقوں کے درمیان اسلام کی کسی ایک شکل پر اتفاق رائے کا حصول انتہائی مشکل بلکہ تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ یوں جہاں پہلے چھوٹے چھوٹے مسائل پائے جاتے تھے وہاں اب ایک بڑا مسئلہ پیدا ہوگیا تھا۔

اپنے پیشروؤں اور پھر اپنے جانشینوں کی طرح ضیاء نے سرکاری شعبے میں تعلیم کی اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی۔ تاہم ایک منفرد کام یہ کیا کہ سرکاری اسکولوں کے اخراجات میں کمی کردی اور دینی مدرسوں کے فروغ کے لئے رقوم مختص کردیں اور حتیٰ کہ اس مقصد کے لئے زکوٰۃ کی رقم بھی استعمال کرنے سے دریغ نہ کیا۔ ان مدرسوں میں جو کہ مذہبی فرقوں کے زیرانتظام تھے اور جن میں زیادہ تر دیوبندی تھے، طلباء کو بہت تنگ نظرانہ، تقریباً صرف مذہبی نظریات کی تعلیم دی جاتی تھی۔ چونکہ اکثر مدرسوں میں رہائش اور کھانے کی سہولیات مفت تھیں اس لئے غریب گھرانوں میں ان کی مقبولیت تیزی سے بڑھنے لگی جہاں بیک وقت بہت سے بچوں کو پالنا ماں باپ کے لئے مشکل ہوتا تھا۔ یہاں پر تعلیم کی اسناد کی شکل میں کوئی ایسی دستاویز نہیں دی جاتی تھی جس کے ذریعے انہیں اقتصادی یا کاروباری شعبے میں کسی قسم کی ملازمت کے حصول میں مدد ملتی۔ زیادہ باصلاحیت اور ذہین طالب علم اسلامی مدرسوں یا مساجد میں مذہبی خدمات انجام دینے کا کام کرنے یعنی مولوی یا پیش امام بن جانے تک ہی قناعت کرلیتے۔ جن میں سے بعض تو خود اپنی ہی مساجد قائم کرلیتے۔ اس ساری صورتحال کا نتیجہ مذہبی نظریات کے پھیلاؤ میں تسلسل سے تیزی آنے کی صورت میں نکلا اور مدرسوں کی تعداد میں غیرمعمولی اضافہ ہونا شروع ہوگیا اور یہ عمل ابھی تک جاری ہے۔

ضیاء کی طرف سے ملک کو اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کے پروگرام کے نتیجے میں مذہبی بنیاد پرستی پر مبنی نظریات ایسے حقائق کی صورت میں سامنے آئے کہ اس کے سیکولر جانشینوں کے لئے ان سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں تھا۔ مذہبی جماعتیں تسلسل سے اس امر کے لئے کوشاں ہیں کہ ضیاء دور میں حاصل کردہ فوائد کو ہر حال میں برقرار رکھا جائے اور اس حوالے سے

کسی بھی قسم کی مخالفانہ کوشش کے ردعمل کے طور پر وہ عوام کو سڑکوں پر لانے کی دھمکی دینے سے بھی گریز نہیں کرتیں۔ مشرف دور میں مذہبی جذبات کی پامالی کے حوالے سے بنائے گئے قوانین میں مجوزہ ترامیم کرنے کو کوششوں کا بھی یہی انجام ہوا، اگرچہ مشرف عصمت دری کے قانون کو حدود آرڈیننس سے خارج کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ تاہم ملک کو اسلامی نظریات کے سانچے میں ڈھالنے کے حوالے سے چلائی جانے والی مہم کے مسلسل اثرات محض عوام کو سڑکوں پر لانے کی دھمکی تک محدود نہیں رہتے۔ ضیاء سے قبل اس امر پر کوئی اتفاق رائے نہیں پایا جاتا تھا کہ آیا پاکستان کو جنوبی ایشیاء کے مسلمانوں کے وطن کے علاوہ ایک نظریاتی اسلامی ریاست بھی ہونا چاہیئے یا نہیں۔ البتہ ضیاء کے دور میں ابھر کر سامنے آنے والے ملک میں یہ یقین سرایت کر گیا تھا کہ پاکستان کو ایک لحاظ سے اسلامی نظریات کی عکاسی کرنے والا معاشرہ بھی ہونا چاہیئے اگرچہ اس کا اصل مفہوم پوری طرح کسی پر بھی واضح نہیں تھا۔ اس نظریئے یا فرمان پر کاربند رہنے کی ضرورت پاکستانی طرز کی سیاسی راستبازی بن کر رہ گئی ہے جس کا نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اکثر سیاستدان ضیاء دور کی اصلاحات پر اس خوف سے تنقید نہیں کرتے کہ ان کو اسلام دشمن ہونے کا لقب عطا کر دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ ابھی تک سیکولر اور قوم پرست نظریات کی حامل فوج میں بھی اگر کوئی سپاہی لڑائی کے دوران مارا جائے تو اسے شہید کا خطاب دے دیا جاتا ہے۔

اگرچہ ضیاء نے اسلامی نظام نافذ کرنے کا پروگرام 1977 میں اقتدار پر قبضے کے تقریباً فوراً بعد ہی شروع کر دیا تھا، تاہم 24 دسمبر 1979 تک پاکستان میں کوئی بھی جہادی یا تشدد پسند فرقہ ورانہ تنظیم موجود نہیں تھی۔ یہ وہ دن تھا جب سوویت یونین نے افغانستان پر حملہ کیا تھا۔ اس کے بعد آنے والے جنگ وجدل سے بھرپور عشرے نے پاکستان کو ہمیشہ کے لئے تبدیل کر کے رکھ دیا۔ سوویت یونین کے حملے کے وقت پاکستان اور افغانستان کے تعلقات پہلے سے ہی تاریخ کا ایک طویل اور تلخ باب بن چکے تھے۔ بنیادی اختلافات پشتونوں کے مستقبل کے حوالے سے تھا جو دونوں ملکوں کی مشترکہ سرحد کے دونوں طرف آباد تھے۔ یہ مسئلہ برطانوی دور حکومت سے ہی چلا آ رہا تھا۔ برطانیہ کی طرف سے افغانستان کو برصغیر میں روسی مداخلت کے خطرے کے خلاف ایک روک کے طور پر استعمال کرنے کی کوششوں کا آغاز 1842 میں اس وقت شروع ہو گیا تھا جب اس کا افغانستان میں تعینات پورا کا پورا فوجی دستہ ہی کابل سے خوفناک پسپائی کے دوران پشتون قبائل

MashalBooks.org

کے ہاتھوں مارا گیا تھا۔ تاہم اس وقت بھی پشتونوں کی اکثریت افغانستان کی بجائے اس سکھ سلطنت کے دور دراز مغربی علاقوں میں رہائش پذیر تھی جس کا دارالحکومت لاہور کے مشرق کی طرف بہت دور واقع تھا۔ جب برطانیہ نے 1849 میں سکھوں پر فتح حاصل کی تو انہیں علم ہوا کہ وادی پشاور کے اندر مرتکز پشتونوں کی وہ وسیع آبادی بھی ان کے زیر حکومت آ چکی ہے جو کہ اپنی افغان شاخ سے سیاسی طور پر پہلے سے ہی علیحدہ ہو چکی تھی۔ یہ اس وقت کوئی اتنا بڑا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ سرحدی علاقے نہ تو اتنے واضح طور پر الگ الگ تھے نہ ہی ان پر نگران تعینات کئے گئے تھے، اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔

تاہم، تیس برس کے اندر اندر صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی۔ روسی افغانستان کی شمالی سرحدوں تک پہنچ چکے تھے، اس لئے برطانیہ نے یہی نتیجہ نکالا کہ دانشمندی اسی میں ہے کہ افغانستان کے ساتھ خود اپنی سرحد کا تعین کر دیا جائے تا کہ روسیوں کی مزید مداخلت کے خلاف روک کے طور پر کام آ سکے۔ 1893 میں انہوں نے انڈین سیکرٹری خارجہ سر ہنری مور ٹمر ڈیورنڈ کو افغان بادشاہ کے ساتھ اس حوالے سے گفت و شنید کے لئے کابل روانہ کر دیا۔ ان مذاکرات کے نتیجے میں آخر کار جس سرحد پر اتفاق رائے ہوا، جو بعد میں بھی ڈیورنڈ کے نام سے ڈیورنڈ لائن کہی جانے لگی، اس کے نتیجے میں برطانیہ کے قبضے میں وہ علاقے آ گئے جنہیں بعد میں صوبہ سرحد اور قبائلی علاقہ جات کے نام سے پکارا جانے لگا، جن دونوں کو بعد ازاں انتظامی لحاظ سے پہلے پنجاب سے اور پھر ایک دوسرے سے علیحدہ کر دیا گیا تا کہ پاکستانی پشتونوں اور ان کے افغان بھائیوں کے درمیان ایک رسمی آڑ قائم کی جا سکے۔

افغانستان کے بادشاہ نے معاہدے پر نہ صرف اپنی رضامندی ظاہر کر دی بلکہ جب معاہدے پر ایک مرتبہ دستخط ہو گئے تو ڈیورنڈ کی شاندار ضیافت بھی کر ڈالی۔ تاہم افغان پشتون جو افغانستان کے سب سے بڑے نسلی گروہ میں شمار ہوتے تھے اور جو حکومت میں بھی سب سے زیادہ تعداد میں تھے پشتون عوام کی اس سیاسی تقسیم پر کبھی بھی خوش نہیں ہوئے۔ تاہم یہ صورتحال نصف صدی سے زیادہ عرصہ تک برقرار رہی جب تک کہ برطانیہ کی اس خطے سے روانگی اور پاکستانی ریاست کے وجود میں آنے کے بعد انہیں اس معاملے پر از سر نو غور کرنے کا موقع نہیں مل گیا۔ اس وقت تک پاکستان کی طرف رہنے والے پشتونوں کی آبادی افغان پشتونوں کے مقابلے میں دوگنی

ہو چکی تھی۔اس کے باوجود افغانستان نے نہ صرف پاکستان کو اقوام متحدہ کی رکنیت ملنے کی مخالفت کی بلکہ افغان نمائندوں نے یہ دلیل بھی پیش کی کہ ڈیورنڈ لائن کا کوئی قانونی جواز نہیں ہے کیونکہ اس کا معاہدہ برطانوی راج کے نمائندوں سے کیا گیا تھا نہ کہ حکومت پاکستان کے ساتھ۔اس کی بجائے افغانستان نے برطانوی راج کے پشتونوں علاقوں کو عظیم تر افغانستان میں شامل کرنے کا مطالبہ کرتے ہوئے اس کی سرحدوں کو دریائے سندھ کے کناروں تک وسعت دینے کی تجویز کا اعلان کر دیا۔تقسیم سے قبل،تاہم برطانیہ کی طرف سے کرائے جانے والے ایک استصواب رائے کے مطابق صوبہ سرحد کے پشتونوں نے کثرت رائے سے پاکستان کے اندر شامل رہنے کے حق میں فیصلہ دے دیا۔تاہم یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ان سمتوں میں پیشرفت کے باوجود دونوں ممالک کے درمیان تعلقات میں کوئی قابل ذکر بہتری نہ آسکی۔

افغانستان کی طرف سے اپنے مقبوضہ علاقوں کی بازیابی کی اس کی پالیسی کے پس پردہ اصل میں محمد داؤ جیسی شخصیت متحرک تھی جو افغانستان کے بادشاہ ظاہر شاہ کا رشتہ دار اور بذات خود بھی پشتون نسل سے تھا۔وہ 1953 میں وزیر خارجہ بنا تھا اور پاکستان علاقے پر افغانستان کے دعویٰ پر نہ صرف اپنا اصرار جاری رکھا، بلکہ 1960 میں اپنے دعوؤں کو معاہدے کے دوسرے فریق کی طرف معاہدے کی شقوں کو خفیہ رکھنے کے اصول کی پابندی کی شرط کا حوالہ دیتے ہوئے، درست ثابت کرنے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے قبائلی علاقوں میں اپنی افواج بھی روانہ کر دیں۔تاہم اس مہم کے دوران داؤ نے ڈیورنڈ لائن سے بھی بہت آگے تک پیش قدمی کر دی تھی اور بعد میں اسے بادشاہ نے وہاں سے نکلوایا۔اس کے باوجود اس نے بعد میں آنے والے برسوں میں اپنا مقدر دوبارہ جگا لیا اور آخر کار 1973 میں اپنے شاہی رشتہ دار کے خلاف بغاوت کرنے میں کامیاب ہو گیا۔مقامی قبائل کی مدد سے اس نے ملک کو سوویت یونین کے قریب لانا شروع کر دیا جو کہ افغانستان کا سب سے بڑا خیر خواہ بن گیا۔یوں افغانستان کے اس وحشتناک رہنما کے دوبارہ برسراقتدار آنے اور سوویت یونین جیسی دوسری عالمی طاقت کے ساتھ اس کے بڑھتے ہوئے تعلقات نے پاکستان کے اندر خطرے کی گھنٹیاں بجانی شروع کر دیں۔اس کے جواب میں ذوالفقار علی بھٹو کی حکومت نے داؤد حکومت کو پریشان کرنے کے نت نئے طریقے دریافت کرنے شروع کر دیئے۔اس مقصد کے لئے داؤد کی طرف سے جلاوطن کئے گئے ان افغانیوں کا انتخاب کیا

گیا جنہوں نے داؤد کی طرف سے ملک بدری کے بعد صوبہ سرحد کے دارلحکومت پشاور میں ایک دوکان لی تھی۔ یہ لوگ جمعیت اسلامی کے کارکن تھے جو کہ پاکستانی جماعت اسلامی کی ہم نام افغان رشتہ دار جماعت تھی۔فوج کو بھی 1965 کی جنگ کے دوران انڈیا میں اپنی بری طرح ناکام ہوجانے والی گوریلا جنگ کی حکمت عملی کو دوبارہ آزمانے کے موقع ہاتھ آرہا تھا۔

جمعیت، جو کہ دینیات کی تعلیم دینے والے تاجک نسل کے پروفیسر برہان الدین ربانی کی سربراہی میں کام کررہی تھی، کوئی نظریاتی مقصد نہیں رکھتی تھی۔ پاکستانی جماعت اسلامی کی افغان مشابہت کو نہ صرف پشاور میں اپنے صدر دفاتر کے قیام کی سہولت حاصل تھی بلکہ وہ داؤد حکومت کی جڑیں کھوکھلی کرنے کے لئے پاکستان کی مدد کرنے پر بھی آمادہ تھی۔ جمعیت اسلامی اپنے اندر نسلی بنیادوں پر پھوٹ پڑنے والی سیاسی محاذ آرائی کی بنیاد پر جلد ہی دو دھڑوں میں تقسیم ہوگئی، جن میں سے ایک نسلی تاجک دھڑا جس کی سربراہی ربانی اور اس کے اہم ترین رفیق کار احمد شاہ مسعود کے پاس تھی اور دوسرا نسلی پشتون دھڑا جس کی سربراہی گلبدین حکمت یار کے پاس تھی جس نے اس کا نام حزب اسلامی رکھا۔ تاہم شروع شروع میں یہ دونوں دھڑ کے باوجود پاکستانی حمایت کے افغانستان کے اندر کسی خاص قسم کی پیشرفت کرنے میں ناکام رہے۔ ان کی سب سے نمایاں کوشش جو کہ 1975 میں وادی پنج شیر کے اندر مسعود کی طرف سے کی جانے والی بغاوت کی صورت میں سامنے آئی، بہت آسانی سے ذلت آمیز ناکامی سے دوچار کردی گئی۔

تاہم خود داؤد حکومت کے اندر بھی بہت سی تبدیلیاں پرورش پارہی تھیں۔ داؤد اپنے ارد گرد کمیونسٹوں کی موجودگی سے دن بدن پریشانی کا شکار ہوتا جارہا تھا اور اس نے انہیں اپنی صفوں سے نکالنے کی کوششوں کا آغاز کردیا تھا۔ اس نے روسی امداد پر اپنا انحصار کم کر کے شاہ ایران اور انڈیا کی طرف ہاتھ بڑھانا شروع کردیا تھا۔ حتیٰ کہ اس نے پاکستان کے ساتھ مذاکرات پر بھی آمادگی ظاہر کردی تھی۔ پالیسی میں اس تبدیلی نے نہ صرف سوویت یونین بلکہ اس کے افغان کمیونسٹ رفقاء کے اندر بھی خطرے کا احساس پیدا کردیا۔ آخرکار 1978 میں افغان آرمی کے اندر کمیونسٹ نواز طاقتوں نے داؤد کے خلاف کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے اس کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور اس کی جگہ ایک کمیونسٹ حکومت قائم کردی جس نے تیزی سے سوویت کیمپ کے ساتھ تعلقات بحال کر لئے۔ روسی افغانستان کو دوبارہ اپنی گود میں پا کر بہت خوش ہوئے مگر ان کی خوشی

اس وقت پریشانی میں تبدیل ہوگئی جب ایک برس کے بعد دو متحارب دھڑوں میں اقتدار کے لئے ہونے والی کشمکش کے نتیجے میں ایک آزاد خیال / غیر جانبدار کمیونسٹ حفیظ اللہ امین منظر عام پر آ گیا۔ حفیظ کو دھمکا کر اپنے تابع کرنے میں ناکامی کے ساتھ ہی افغانستان کو اپنے ہاتھوں سے ایک مرتبہ پھر نہ نکلنے دینے کی جھنجلاہٹ میں انہوں نے اس ملک پر حملہ کرنے کا فیصلہ کرتے ہوئے حفیظ کو ہلاک کر دیا اور اس کی جگہ ایک قابل اعتماد شخصیت کو اقتدار دے دیا۔

افغانستان پر سوویت حملے کے وقت پاکستان اور امریکہ کے مابین تعلقات انتہائی سرد مہری کا شکار تھے۔ صرف ایک ماہ قبل ہی جماعت اسلامی کی طلباء تنظیم اسلامی جمعیت طلباء کی سربراہی میں ایک جلوس نے اسلام آباد میں امریکی سفارت خانے پر حملہ کر کے اسے آگ لگا دی تھی جس کے نتیجے میں عمارت جل کر راکھ ہوگئی تھی۔ وہ اس افواہ پر اشتعال کا مظاہرہ کر رہے تھے کہ اسلام کی سب سے مقدس عبادت گاہ، یعنی مکّہ معظّمہ پر مسلمانوں کے ایک شدت پسند مگر تا حال نامعلوم گروہ کی طرف سے قبضے کے پس پردہ، جس کے مقاصد فوری طور پر سامنے نہیں آئے تھے، امریکہ کا ہاتھ ہے۔ سفارت خانے پر حملے کے دوران دو امریکی اور دو پاکستانی ملازم ہلاک ہو گئے تھے۔ امریکی سفارت خانے کی نئی عمارت میں راکھ کے ڈھیر کے اندر پرانی عمارت کے آثار کی فوٹو البم ابھی تک رکھی ہوئی ہے۔ اس پرانی عمارت کے جانے پہچانے مگر بری طرح جلے ہوئے دفاتر اور راہداریوں کے نقوش پر مشتمل البم کے اوراق پلٹتے ہوئے جسم میں خوف و اضطراب کی ایک لہر سی دوڑ جاتی ہے کیونکہ نئی عمارت بھی بالکل پرانی عمارت کے نمونے پر تیار کی گئی ہے۔ واحد فرق صرف یہ ہے کہ زنجیروں کے ملاپ سے بنائے گئے اس جنگلے کی جگہ جسے آسانی سے عبور کیا جا سکتا تھا اور جو سفارت خانے کے صحن کا احاطہ کیے ہوئے تھا، سرخ اینٹوں کی ایک موٹی اور بارہ فٹ اونچی دیوار تعمیر کر دی گئی ہے جس کے اوپر خاردار تاریں لگا دی گئی ہیں۔ اس دن سے اسلام آباد کا سفارت خانہ ایک سفارتی طرز تعمیر کی عمارت کی بجائے انتہائی حفاظتی / دفاعی طرز کی جیل کی طرح لگتا ہے۔

سفارت خانے پر حملہ کرنے والے طالب علم رہنما ان ایرانی طلباء کے نقشِ قدم پر چل رہے تھے جنہوں نے دس ماہ قبل تہران میں امریکی سفارت خانے پر دھاوا بول دیا تھا اور ہوسکتا ہے وہ ان کی ہو بہو نقل کرنے کی کوشش کر رہے ہوں۔ پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو 1979 کا سال انتہاء

پسندی کے عروج کے حوالے سے ایک فیصلہ کن سال لگتا ہے، جس میں ایرانی انقلاب اور مکہ معظّمہ پر قبضے کے واقعات نے ان مغربی اثرات کو مسترد کر کے رکھ دینے کے حوالے سے ابتدائی جنگی یلغار کا کام کیا جو اپنی فطری روش پر ابھی تک رواں دواں ہیں۔ اس کے علمی اسباب کا سرا کسی حد تک ماضی میں مصر میں دینیات کے ماہر اور اخوان المسلمین کے رکن سید قطب کی تحریروں سے جا ملتا ہے۔ اگرچہ سیکولر ذہن رکھنے والے جمال عبدالناصر نے قطب کو 1966 میں پھانسی دے دی تھی، تاہم مغربی اقدار پر اس کی تنقید، سیکولر مسلمان حکمرانوں کے لئے حقارت اور متشدد جہادی کارروائیوں کی حمایت پر مشتمل اس کے نظریات کی بدولت شدت پسندوں کی پے در پے جہادی تنظیمیں وجود میں آ گئیں۔ 1979 کے ڈرامائی واقعات کو اس تبدیلی کا مظہر گردانا جا سکتا ہے جس کے تحت نظریات کی مشعل سیکولر، اکثر اوقات بائیں بازو کے رجحانات کی حامل ایسی قوم پرست تحریکوں، مثلاً پی ایل او کے ہاتھوں سے نکل کر جو کہ مغرب کی اسلامی مخالفت میں پیش پیش تھیں، شدت پسند عقائد کی حامل اور جہاد کے جذبے سے سرشار تنظیموں کے ہاتھوں میں چلی گئی ہے۔

تاہم اسلام آباد کے امریکن سفارت خانے کے اندر محصور ان امریکی ملازمین کے ذہن میں یہ سوچ دور دور تک موجود نہیں تھی جنہوں نے حملہ آوروں سے بچنے کے لئے خود کو سفارت خانے کی فولادی چادروں کے ذریعے مضبوط بنائی گئی دیواروں والے کمروں میں بند کر لیا تھا۔ وہاں وہ گھنٹوں انتظار کرتے رہتے جبکہ ان کے پاؤں تلے فرش نیچے لگی ہوئی آگ کے شعلوں سے مسلسل تپنا شروع ہو گئے تھے۔ وہ اوپر چھت سے نیچے کی جانب چلائی جانے والی گولیوں کی آواز سن سکتے تھے اگرچہ فوج کا ہیڈکوارٹر وہاں سے صرف نصف گھنٹے کی مسافت پر تھا مگر پاکستان کے حفاظتی اداروں کے عملے کا کوئی رکن بھی ارد گرد دکھائی نہیں دے رہا تھا اور جو آخر کار دن ڈھلنے کے بعد تاخیر سے وہاں پہنچتے دکھائی دیئے۔ اس وقوعے سے کچھ ہی دیر پہلے، خوفزدہ امریکیوں نے جو کہ بند کمروں کے اندر تپش سے بھن رہے تھے آخر کار خود کو اس امر پر قائل کر لیا تھا کہ بھن کر مر جانے سے بہتر ہے کہ وہاں گولیاں کھا کر مر جائیں اور یوں وہ باہر نکل آئے۔ خوش قسمتی سے ان کے لئے اس وقت تک سفارت خانے کا احاطہ یا صحن جل کر راکھ ہو چکا تھا اور موت کا پیاسا ہجوم اپنی پیاس بجھا کر منتشر ہو چکا تھا۔ جس وقت یہ ڈرامائی واقعات وقوع پذیر ہو رہے تھے اس وقت ضیاء الحق ساتھ والے شہر راولپنڈی میں سائیکل کی پر لطف سیر کرنے میں مصروف تھا جس کا مقصد

ایک صحت مند زندگی کے فوائد ظاہر کرنا تھا۔ اسے شاید یہ محسوس ہوا ہوگا کہ امریکہ کو اس المناک صورتحال میں اس کے حال پر چھوڑ دینا ہی مناسب رہے گا۔ سفارت خانے کے جلنے سے سات ماہ قبل اپریل کے مہینے میں کارٹر انتظامیہ نے سمنگٹن ترمیم کے تحت پاکستان کی اقتصادی اور فوجی امداد معطل کر کے رکھ دی تھی۔ اس کا مقصد پاکستان کی طرف سے ایٹمی ہتھیار بنانے کے پروگرام پر ناراضگی کے اظہار کے ساتھ ہی ضیاء کی طوالت پکڑتی ہوئی اس آمریت پر بھی ناگواری کا احساس ظاہر کرنا تھا جو بغاوت کے دو برس بعد ہر لحاظ سے مستقل ہوتی نظر آ رہی تھی۔

وہ واقعات جن کا اختتام اسلام آباد میں سفارت خانے پر ہونے والے حملے کی صورت میں ہوتا نظر آ رہا تھا، امریکہ۔ پاکستان کے زیادہ تر زوال پذیر تعلقات کی طویل تاریخ میں تازہ ترین اضافہ تھے۔ اپنے وجود میں آنے کے پہلے عشرے کے دوران امریکہ کے دو عدد دفاعی اتحادوں میں شمولیت اختیار کر کے پاکستان امریکہ کا قریبی فوجی حلیف رہا تھا۔ تعلقات کے افق پر پہلا سیاہ بادل 1962 میں اس وقت نمودار ہوا تھا جب امریکہ نے کمیونسٹ چین کے خلاف ہارتی ہوئی جنگ میں پاکستان کے دشمن بھارت کا ساتھ دیا تھا۔ بعد ازاں، جیسا کہ ہم نے باب اول میں دیکھا 1965 میں کشمیر پر ہونے والی جنگ میں امریکہ نے جنگ جاری رکھنے کے لئے درکار فوجی اسلحے کے فالتو پرزوں کے فراہمی روک کر امریکہ نے ایوب حکومت کے قدموں تلے سے زمین کھینچ لی تھی۔ ان واقعات نے ذوالفقار علی بھٹو کو بالکل ہی متنفر کر کے رکھ دیا تھا، جو کہ اس وقت وزیر خارجہ تھا اور جس نے پالیسی ترجیحات تبدیل کر کے چین کے ساتھ دوستی کا آغاز کرنے کے ساتھ ہی غیر جانبدار تحریک (NAM) میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اگرچہ بعد ازاں امریکہ نے بنگلہ دیش کے مسئلے پر پاک بھارت تصادم میں پاکستان کو سفارتی تعاون سے نوازا تھا، مگر پاکستان کے نزدیک اب تاخیر ہو چکی تھی۔ تاہم یہ ساری صورتحال اس دن یکسر تبدیل ہو کر رہ گئی تھی جس دن روس نے افغانستان پر حملہ کر دیا تھا۔

امریکہ افغانستان پر ہونے والے روسی حملے کو بلا شرکت غیرے سرد جنگ کے عدسے سے دیکھ رہا تھا۔ اگرچہ نے روس نے دنیا کے مختلف حصوں میں اپنے حامی ممالک کے ذریعے جنگیں لڑنے (proxy wars) کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا، مگر دوسری جنگ عظیم کے بعد ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ سوویت یونین نے ایک ایسے ملک پر حملہ کر دیا تھا جو وارسا پیکٹ میں شامل نہیں تھا۔

امریکہ کو خدشہ تھا کہ روس نہ صرف افغانستان کے حوالے سے مقاصد رکھتا تھا بلکہ اس کا حتمی ہدف یا نشانہ پاکستان تھا جس کے ذریعے وہ بحیرہ عرب کے گرم پانیوں تک رسائی حاصل کرنا اور مشرق وسطیٰ میں اپنی طاقت کا مظاہرہ کرنا چاہتا تھا۔ پاکستانیوں کے پاس ان جغرافیائی حکمت عملیوں پر غور کرنے کا کوئی وقت نہیں تھا۔ وہ تو اپنے مغرب کی طرف ایک ایسی عظیم دشمن طاقت کو نمودار ہوتا دیکھ کر چوکنے ہو گئے تھے جو کہ ایک ایسی کمیونسٹ حکومت کی حمایت کر رہی تھی جو ڈیورنڈ لائن کو اپنے پیشرو داؤد سے کم اہم گردانتی تھی۔ اس کے بعد پاکستان اور امریکہ کے درمیان جس باہمی تعاون کا آغاز ہوا وہ ایک طرح سے مصلحت یا مفاد کی شادی تھی۔ اگرچہ اس کے جل کر تباہ ہو جانے والے سفارت خانے کی راکھ ابھی پوری طرح صاف نہیں ہوئی تھی، امریکہ کا ذہن پہلے سے زیادہ اہم معاملات میں الجھ کر رہ گیا تھا۔ اس نے ضیاء حکومت کی طرف امن کا سندیسہ بھجوایا اور اپنی مدد کی پیشکش کر دی۔

اس کے بعد بتدریج سامنے آنے والے معاہدے کے تحت ذمہ داریاں تقسیم کر دی گئیں۔ پاکستان کے ذمے یہ طے پایا کہ وہ افغانستان میں سرایت کر کے روس کے خلاف گوریلا جنگ کی کاروائیاں کرنے کے لئے باغیوں کو منظم کرنے، تربیت دینے اور انہیں مسلح کرنے کا فریضہ سرانجام دے گا۔ اس کے مصارف امریکہ ادا کرے گا۔ ضیاء نے اس حوالے سے درکار وسائل کا تعین کر لیا تھا۔ اقتدار میں آنے کے بعد اس نے عمل کا آغاز وہیں سے کرتے ہوئے جہاں بھٹو نے چھوڑا تھا، حکمت یار اور ربانی کے مجاہدین کی ان کے پشاور والے جلاوطنی کے ٹھکانے پر مالی امداد جاری رکھی۔ ضیاء کی حلیف پاکستانی جماعت اسلامی کے ساتھ ان کے مضبوط تعلقات کی بناء پر اس کا انہیں استعمال کا مقصد صرف عملی صورتحال کے تقاضے پورے کرنا ہی نہیں تھا بلکہ نظریاتی مفاد پورا کرنا بھی تھا۔ اور اب اس نظریاتی مفاد کے لئے اسے پیسہ ملنے کی توقع بھی تھی۔ ضیاء نے کارٹر انتظامیہ کی طرف سے 40 کروڑ ڈالر کی بتدائی پیش کش ٹھکرا دی تھی، مگر بعد میں آنے والی ریگن انتظامیہ کافی حد تک زیادہ فراخ دل تھی جس نے پیش کش بڑھا کر 3.2 ارب ڈالر کر دی تھی۔ سعودی عرب نے بھی جسے خطے میں روس کے سرایت کر جانے کا اتنا ہی خوف تھا جتنا کہ امریکی ڈالر کے مساوی ایک ڈالر۔ چین اور مصر نے بھی امداد کی پیش کش کر دی۔

ضیاء نے افغانستان میں بغاوت کی کاروائی کی نگرانی کے لئے فوج کے خفیہ ادارے

انٹر سروسز انٹیلی جنس ڈائریکٹوریٹ المعروف آئی ایس آئی کی مدد حاصل کرنے کا فیصلہ کیا۔ آئی ایس آئی کے عملے میں زیادہ تر عارضی طور پر تعینات فوجی افسر شامل تھے اور یہ 1948 میں پاکستان بننے کے ایک برس بعد قائم کی گئی تھی۔ تاہم افغانستان میں روس مخالف بغاوت برپا کرنے میں اس کے کردار کی بدولت اسے پاکستانی ریاست کے معاملات کے حوالے سے جو نمایاں ترین مقام حاصل ہوا جس سے وہ کبھی بھی مکمل طور پر دستبردار نہیں ہوئی۔ بعد ازاں اس کا کردار ایک ایسے بنیادی وسیلے کے طور پر سامنے آیا جس کی وساطت سے پاکستانی حکومت انتہاء پسندی اسلامی تنظیموں سے لین دین کرتی رہی اور فوج نے پس منظر میں رہتے ہوئے ملکی سیاست کا رخ متعین کرنے کی کوشش کی۔ گزشتہ کئی برسوں سے یہ اسرار سامنے آرہا ہے کہ آئی ایس آئی ایک بدقماش تنظیم یا ادارہ ہے جس کا مقصد صرف اپنے بیرونی اور داخلی اہداف کا حصول ہے۔ تاہم یہ امر واضح نہیں ہوسکا کہ اس طرح کا فرسودہ نظریہ کہاں سے تراش کے پیش کیا گیا ہے۔ اس کی سب سے زیادہ امکانی وضاحت یہ ہے کہ اس ادارے کا اتنے نمایاں انداز میں سرگرم رہنا جس کے کارکنوں کے بارے میں یہ شبہ کیا جاتا ہے کہ وہ ہر درخت کے پیچھے چھپے ہوتے ہیں، اس نظریئے کو تقویت دیتا ہے۔ اس طرح کی افواہوں کے ذریعے خود کو آئی ایس آئی کی بعض متنازعہ کاروائیوں سے دور رکھنے کی حکمت عملی کے باعث خود فوج پر بھی اس صورتحال کی کچھ نہ کچھ ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔

میں نے فوج کے بہت سے اعلیٰ افسروں سے اس موضوع پر گزشتہ برسوں کے دوران کافی تبادلہ خیال کیا ہے اور ان سب نے اس فرسودہ نظریئے کو بالکل واضح طور پر مسترد کر کے رکھ دیا ہے۔ ان سب کا اصرار ہے اور بڑی شد و مد کے ساتھ کہ آئی ایس آئی صرف فوج کی قیادت کی طرف سے واضح کردہ پالیسیوں کے تحت یا پھر آرمی ہیڈ کوارٹر سے جاری کردہ براہ راست امکانات کے جواب میں کاروائی کرتی ہے۔ اپنے اس موقف کے دفاع میں وہ یہ نکتہ اجاگر کرتے ہیں کہ آئی ایس آئی کے بہت سے افسروں کو فوج کے اندر سے عارضی طور پر تعینات کیا جاتا ہے اور وہ مزید ترقی کے لئے فوج پر انحصار کرتے ہیں۔ وہ یہ دلیل بھی دیتے ہیں کہ آئی ایس آئی کے سربراہ کے آرمی چیف کے ساتھ ذاتی اور پیشہ ورانہ دونوں سطحوں پر قریبی تعلقات ہوتے ہیں۔ فوج کا سربراہ اشفاق کیانی بھی اس سے قبل مشرف کی ماتحتی میں آئی ایس آئی کا سربراہ رہ چکا ہے۔ میرے جاننے والے ان افسروں کا یہ بھی اصرار ہے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا ہے، کہ پاکستانی فوج ایک پیشہ ورانہ

قسم کا منظم ادارہ ہے جس کے افسروں حکم عدولی کا رجحان نہیں رکھتے۔ بعض تو یہ تسلیم کرنے پر بھی تیار ہیں کہ اگرچہ آئی ایس آئی تکنیکی نقطہء نظر سے سویلین کنٹرول میں آتی ہے مگر جب جاگیرداروں کی حکومت آتی ہے تو اس کی بنیادی وفاداری اپنے بانی ادارے کے ساتھ ہی ہوتی ہے۔

جیسے ہی آئی ایس آئی کے ہدایات کے مطابق کی جانے والی بغاوت نے زور پکڑنا شروع تو پاکستانیوں نے باغیوں کو مجاہدین اور بغاوت کو جہاد کہنا شروع کر دیا۔ چنانچہ اس صورتحال کے باعث اس افسانوی نظریئے کو تقویت ملی کہ باغی قوتیں مذہبی جذبے سے سرشار ہیں اور خود اپنے طور پر کاروائی کر رہی ہیں نہ کہ پاکستانی حکام کی شہہ پر۔ اس کے علاوہ اس لڑائی کو مذہبی رنگ دینے کے باعث عوام کی نظروں میں بھی ان کا وقار بلند ہوگیا۔ یہ بالکل وہی ہتھکنڈہ یا حکمت عملی تھی جو کہ 1965 کی پاک۔ بھارت جنگ میں ایوب حکومت نے استعمال کی تھی اور کشمیر میں لڑنے کے لئے بھیجی جانے والی غیر رسمی فوجوں کو بھی مجاہدین کا خطاب دے دیا گیا تھا۔ اور افغان تناظر میں تو یہ اور بھی ضروری تھا کیونکہ پاکستانی اس امر کا سرعام اعتراف کر کے کہ وہ مجاہدین کی حمایت کر رہے تھے سوویت یونین کو اپنے ملک پر حملے کا جواز نہیں دینا چاہتے تھے۔ 1965 کی مثال اور افغانستان کی مثال میں بنیادی فرق یہ ہے کہ افغانستان کی صورتحال میں سب سے اہم باغی گروہ دارصل مذہبی گھرانوں سے تعلق رکھتے تھے۔ تاہم اس کے علاوہ ایک اہم مماثلت بھی پائی جاتی تھی اور وہ یہ کہ 1965 میں اپنے پیشروؤں کی طرح افغان مجاہدین قوم پرستی کے جذبات سے بھی سرشار تھے۔ وہ روسیوں کو اپنی سرزمین سے نکال کر ریاست کا کنٹرول اپنے ملک کے کٹھ پتلی کمیونسٹ حکمرانوں سے چھین لینا چاہتے تھے۔ اس جہاد میں حب الوطنی کے جذبات کا عنصر بھی شامل تھا۔ روسیوں سے برسرپیکار جہادی تنظیموں میں گلبدین حکمت یار کی حزب اسلامی اور احمد شاہ مسعود کی سربراہی میں لڑنے والی جمعیت اسلامی پیش پیش تھیں۔ انہوں نے افغانستان کے اندر سے جو جنگجو بھرتی کیے ان میں سے اکثر ان کے جھنڈے تلے صرف اس لئے جمع ہو گئے تھے کیونکہ وہ سوویت یونین کے خلاف جذبہ حب ولوطنی سے لبریز تھے۔ اپنے جماعتی پس منظر کے باعث ان کے پاس بھرتی ہو کر آنے والے صرف دیوبندی مکتب فکر کے لوگ نہیں تھے۔ بھرتی کردہ بہت سے افراد صوفیانہ اسلام کے پیروکار تھے جس پر افغان پشتونوں کی اکثریت باوجود دیوبندی نظریات سرایت کر جانے کے آج بھی عمل پیرا ہے۔ حتیٰ کہ اہل تشیع کو بھی مجاہدین کی صفوں میں خوش آمدید کہا گیا تھا۔

مقامی حالات سے آگاہی کے اضافی فائدے کے باعث ان باغیوں نے روسی قافلوں پر حملے کر دیئے اور افغان شہروں اور قصبوں میں تعینات روسی فوجی دستوں اور دور دراز واقع فوجی چوکیوں پر تابڑتوڑ قسم کے تباہ کن حملے کر دیئے۔ جیسے جیسے لڑائی شدت اختیار کرتی گئی افغان شہریوں نے وہاں سے فرار ہو کر پاکستان پہنچنا شروع کر دیا اور صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں واقع مہاجر کیمپوں میں پناہ کیلئے آنے والے افغان مہاجرین کی تعداد تیس لاکھ تک پہنچ گئی۔ اور یوں مجاہدین کی بھرتی کے لئے اضافی ذخیرہ پیدا ہو گیا۔

مسعود کے مقابلے میں زیادہ شدت پسندانہ حکمت عملی اور مذہبی رجحان رکھنے کے باعث حکمت یار آہستہ آہستہ آئی ایس آئی کی پسندیدہ شخصیت بن گئی۔ وہ نہ صرف ایک اچھا کمانڈر تھا بلکہ ایک ایسا افغان پشتون بھی تھا جو پاکستان کے ساتھ تعاون کرنے کے لئے ہر دم تیار تھا اور یہ پاکستانیوں کی نظر میں جو اپنی سرزمین پر بسنے والے پشتونوں کے خلاف افغان منصوبوں سے کافی عرصہ سے تنگ آئے ہوئے تھے، ایک بہت ہی پسندیدہ وصف تھا۔ وہ ایک ایسا مجاہدین لیڈر بھی تھا جس کے پاکستانی کی جماعت اسلامی سے بہت قریبی تعلقات تھے۔ یہ آئی ایس آئی کی توقعات کے مطابق ایک ایسی افغان قیادت تھی جو سوویت افواج کی روانگی کے بعد خطّے میں نمایاں طور پر ابھر کر سامنے آ سکتی تھی۔ مسعود اور اس کا سیاسی مرشد برہان الدین ربانی، اس کے برعکس، نسلی طور پر تاجک تھے جن کے اندر وسطی ایشیائی ثقافت کی جھلک نمایاں تھی جبکہ پاکستان کے ساتھ ان کے کوئی خاص مراسم نہیں تھے۔ ابتداء سے ہی زیادہ مضبوط نہ ہونے کے باعث حکمت یار اور مسعود کے درمیان تعلقات وقت کے ساتھ ساتھ مزید کمزور ہوتے گئے۔

اگرچہ سوویت مخالف جنگ میں یہ افغان تنظیمیں مسلسل نمایاں کردار ادا کرتی رہیں، تاہم عالمی سطح پر زیادہ وسیع اسلامی نظریات و اہداف رکھنے والے بیرونی عناصر کو اس جنگ میں شامل ہو جانے میں زیادہ وقت نہیں لگا۔ ان میں سب سے نمایاں عبداللہ یوسف اعظم نامی وہ سعودی نژاد فلسطینی ماہر دینیات تھا جو سید قطب کی تحریروں سے متاثر تھا۔ روسی حملے کے ہی عرصہ بعد اس نے ''ڈیفنس آف مسلم لینڈز'' کے عنوان سے ایک مقالہ تحریر کیا تھا جس میں اس نے مسلمانوں سے التجا کی تھی کہ وہ فلسطین اور افغانستان کو کافروں کے پنجے سے آزاد کرانے کے لئے جہاد کریں۔ اس طرح کی التجا کسی قوم پرستانہ جذبے کی بنیاد پر نہیں کی گئی تھی۔ اس میں صرف ایک

ایسا جہادی لائحہ عمل پیش کیا گیا تھا جس کا مقصد مسلمانوں کو مغربی اثرات کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنا تھا۔ بعدازاں اعظم صوبہ سرحد کے دارلحکومت پشاور آ گیا جہاں اس نے ہم خیال جہادیوں کو بشمول اپنے سابقہ شاگرد اسامہ بن لادن کے جو کہ سعودی شاہی خاندان سے قریبی تعلقات رکھنے والے ایک بہت ہی دولت منداور بارسوخ ماہر تعمیرات کا بیٹا تھا، اپنی طرف راغب کرنا شروع کر دیا۔اس کا ایک اور جہادی ساتھی ایمن الظواہری بھی جو 1981 میں مصر کے صدرانور سادات کے قتل کے بعد اپنی مشکوک سرگرمیوں کی بناء پر قید کر دیا گیا تھا، ایک مقامی خیراتی ہسپتال میں کام کرنے کے لئے پشاور آ گیا تھااور بعدازاں اس نے یہیں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔

قطب اوراعظم کے برعکس بن لادن اور الظواہری نہ تو دینی علوم کے ماہر تھےاور نہ ہی مُلّا۔وہ سیکولر خیالات کے حامل طبقے سے تعلق رکھنے والی تعلیم یافتہ شخصیت تھیں، جو کہ قطب اور اعظم کی تحریروں سے متاثر ہونے کے علاوہ مغرب کے ہاتھوں مسلمانوں کی تباہی و بربادی پر پریشان اور دکھی نظر آتی تھیں۔ان کا موازنہ کئی لحاظ سے نیولیفٹ کی طرف رجحان رکھنے والے بالائی متوسط طبقے کے ان نظریاتی کارکنوں سے بھی کہا جا سکتا ہے جو ساٹھ کی دہائی کے اواخر میں منظر عام پر آنے والی تنظیموں، مثلاً ویدر انڈر گراؤنڈ (Weather Underground)اور بدر منہاف (Baader-Meinhof) کی طرف مائل تھے۔ذاتی طور پر دولت مند مگر اپنے اردگرد بظاہر کئی طرح کی ناانصافیوں سے دلبرداشتہ ہو کر وہ اس برسراقتدار طبقے کی مذمت میں پیش پیش تھے جسے وہ ان ساری انصافیوں کا ذمہ دار سمجھتے تھےاور اپنے رومان پسندانہ انقلابی مقاصد کی تکمیل میں ان کے خلاف ظالمانہ حد تک کاروائی کرنے کے لئے تیار رہتے تھے۔بن لادن اور سعودی عرب کے بہت سے اور خیراتی اداروں کے فراہم کردہ وسائل کی بدولت مشرق وسطیٰ اورحتیٰ کہ دور دراز کے دیگر علاقوں سے بھی انتہاء پسند نوجوان مسلمان ان کی صفوں میں شامل ہونے کے لئے پاکستان پہنچ گئے۔ مستقبل بعید مین جھانک کر دیکھنے کی صلاحیت یاارادے کےفقدان کے باعث امریکہ خود بھی بیرونی علاقوں سے آنے والے ان جہادیوں کو بھرتی کرنے کے حق میں نظر آتا تھا۔اگرچہ ان بیرونی جہادیوں کا میدان جنگ میں لڑنے والے مجاہدین میں تناسب بہت کم تھا،مگر وہ ساری اسلامی دنیا سے آنے والے انقلابی مجاہدین کے اپنی نوعیت کے بہت اہم اولین اتحاد کا جزو لازم تھے،یعنی ایک ایسی صورتحال جس کا نتیجہ القاعدہ کی پیدائش کی صورت میں سامنے آنا تھا۔

اگرچہ باہر سے بھرتی کیئے جانے والے جہادیوں میں اکثریت وہابیوں کی تھی، مگر دیوبندی بھی وقت کی پکار پر لبیک کہہ رہے تھے۔ پاکستان کے اندر اولین جہادی تعلیم یافتہ بلائی طبقے سے نہیں آئے تھے بلکہ دیوبندی مدارس کی پیداوار تھے۔ پاکستان کی پہلی جہادی تنظیم کی بنیاد دیوبندیوں کے سب سے مصروف مدرستے جامع العلوم اسلامیہ، کراچی کے طلباء نے 1980 میں رکھی تھی۔ وہ روسی کمیونسٹوں کے خلاف جاری مزاحمت سے بہت متاثر نظر آتے تھے اور اس کے خلاف کچھ کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ مجاہدین کی صفوں میں شامل ہونے کی امید کے ساتھ پشاور کی طرف سفر کرتے ہوئے انہوں نے ہم خیال مقامی پشتونوں سے روابط استوار کرنے ہوئے ان کے ساتھ مل کر حرکت الجہاد اسلامی(HUJI) کی بنیاد رکھ ڈالی۔ ان کو سب سے زیادہ جہادی، درجنوں اور شاید سینکڑوں کی تعداد میں ان مدرسوں سے فراہم کیئے گئے جو جے یو آئی نے ضیاء حکومت کی شہ پر صوبہ سرحد میں قائم کرنے شروع کر دیئے تھے۔ ان مدارس کو نہ صرف زکوٰۃ کی صورت دستیاب وسائل فراہم کیئے گئے بلکہ سعودی عرب کی طرف سے فراہم کردہ اس امداد سے بھی نوازا گیا جو سوویت حملے کے بعد جے یو آئی کے صندوقوں میں بھرنی شروع کر دی گئی تھی اگر دہ یہ وہابی تنظیم نہیں تھی۔ ان ڈرامائی حالات میں سعودی عرب اسلامی قوانین کی تشریح کے حوالے سے معمولی سے اختلافات کو اس عظیم مقصد کی راہ میں حائل نہیں ہونے دینا چاہتا تھا۔

اگرچہ یہ بذات خود کبھی بھی۔ نہ اس وقت اور نہ اب۔ ایک جہادی تنظیم نہیں رہی، مگر جے یو آئی افغانستان میں ایک اہم کردار ادا کرنے کے لئے بیتاب نظر آتی تھی۔ یہ اپنی حریف جماعت اسلامی کے برابر، جس کی ہم خیال افغان تنظیمیں جہاد کا بہت بڑا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے ہوئے تھیں، بلکہ ممکنہ طور پر اس سے بھی زیادہ فوائد حاصل کرنا چاہتی تھی۔ الگ تھلگ کھڑے رہنے پر اسے جو شرمندگی یا ندامت محسوس ہو رہی تھی اس کا ایک اہم سبب یہ حقیقت تھی کہ یہ بذات خود بھی، اکثر مجاہدین تنظیموں کی طرح، ایک پشتون تنظیم تھی۔ عدم توازن کو دور کرنے کے لئے اس نے اپنے مدرسوں میں افغان مہاجرین کی بھرتی کا عمل تیز کر دیا جن کی صفوں سے بعد ازاں بہت سے طالبان برآمد ہوئے۔ تاہم یہ اس لئے بھی شاداں و فرحاں ہو رہی تھی کہ اس کے پاکستانی طلباء نئی وجود میں آنے والی یو جے آئی میں شامل ہو رہے تھے یا پھر براہ راست افغان مجاہدین کی صفوں میں شمولیت اختیار کر رہے تھے۔ سوویت حملہ آوروں کے خلاف کارروائی میں حصہ

لینے والے150,000 مجاہدین میں سے یو جے آئی کے تقریباً4000 کارکن مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑنے والوں میں شامل تھے جو اگرچہ معمولی مگر کم اہم تعداد نہیں ہے۔ جب فروری1989 میں آخری روسی سپاہی بھی افغانستان سے روانہ ہو گیا تو وہ ابھی تک وہیں موجود تھے، ایک منتظر جہادی طاقت کی طرح۔

تاہم سوویت مخالف جدو جہد نے پاکستان پر محض4000 مقامی جہادی کارکن پیدا کرنے کی نسبت زیادہ گہرے اثرات مرتب کئے۔ اس انتہا پسندانہ اسلامی جذبے کے ساتھ ہی جس کے نتیجے میں جے یو آئی کے مدرسوں میں زیر تعلیم طلباء ایچ یو جے آئی میں شامل ہوئے تھے، صوبہ سرحد اور قبائلی علاقوں میں اسلحے کی بھرمار بھی دیکھی جانے لگی کیونکہ افغان جنگ کے دوران چوری کئے گئے اسلحے کی کچھ مقدار اس علاقے کے اندر سرایت کر گئی تھی اور یوں کلاشنکوف کلچر عام ہو گیا۔ جب میں نے صوبہ سرحد کے ایک بہت بڑے زمیندار سے سوال کیا کہ اس کا کیا مطلب ہے تو اس نے کہا کہ جب وہ لڑکا تھا تو اس کے باپ اور دوسرے زمینداروں کے پاس بندوقیں ہوتی تھیں مگر اب یہ بندوقیں مُلّاؤں کے پاس بھی آ گئی ہیں۔ اسلحے کی اس قدر آسان رسائی جو آہستہ آہستہ صوبہ سرحد کے باہر بھی پھیلتا جا رہا تھا ملک میں تشدد پر مبنی فرقہ ورانہ فسادات میں اضافے کا ایک اہم سبب بن گئی۔ مگر فسادات کی یہ چنگاری صوبہ سرحد میں نہیں بھڑکتی تھی جس کی پشتون آبادی میں سنیوں کا تناسب بہت زیادہ تھا بلکہ جنوبی طور پر ایک سنی علاقہ تھا مگر جہاں طویل عرصہ سے دولت مند شیعہ جاگیرداروں کا راج چلا آ رہا تھا۔

یہ سرائیکی علاقہ ایٹی ہی تھی جہاں حق نواز جھنگوی نامی ایک مُلّا نے1985 میں سپاہ صحابہ پاکستان(ssp) کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ ایک جنگجو دیو بندی پریشر گروپ تھا جو ایک دہشت گرد تنظیم کے علاوہ ایک سیاسی جماعت کی آن بان بھی رکھتا تھا۔ اپنے زمانے کی مخصوص پیداوار یہ تنظیم ایران کے شیعہ انقلاب اور اس کے مقابلے میں ضیاء کی طرف سے پاکستان کی شیعہ آبادی کی سیاست میں بڑھتی ہوئی دلچسپی کے ردعمل کے طور پر منظر عام پر آئی ہے۔ ایک سطح پر اس نے اس سُنی پریشر گروپ(TNFJ) کے مقابلے میں سنی طاقت کے مظاہرے کا کام کیا، جس نے شیعہ فرقے کو زکوۃ سے مستثنیٰ قرار دینے کے حوالے سے کامیابی کے بعد بھی شیعہ مفادات کے لئے سرگرمیاں جاری رکھیں۔ تاہم اس تنظیم کا حتمی مقصد محض سُنی مفادات کا فروغ نہیں تھا۔ اس کا مقصد شیعہ فرقے کو

غیر مسلم قرار دلوا کر اس کی اسی طرح مذمت کرنا بھی تھا جس طرح اس سے گزشتہ عشرے میں احمدی فرقے کے ساتھ ہوا تھا۔ ایس ایس پی کو سرائیکی پٹی میں بنیادی طور پر اس لئے طاقت حاصل ہوئی تھی کیونکہ یہاں سنیوں کی اکثریت دولت مند شیعہ زمینداروں سے سخت مخاصمت رکھتی تھی جو کہ خطے کی سیاست اور معیشت پر طویل عرصے سے غالب چلے آ رہے تھے۔ اس کو سب سے زیادہ حمایت شہری متوسط طبقے سے حاصل ہوئی جو کہ مقامی کاروباری لوگوں پر مشتمل تھا۔ اس عرصہ کے دوران سرائیکی علاقے میں دیوبندی مساجد اور مدارس کی تعداد میں بھی شیعہ مخالف جذبہ کی بدولت اچھا خاصہ اضافہ دیکھنے میں آیا۔ مدارس میں جن کی اکثریت صوبہ سرحد میں جے یو آئی کے مقابلے کے اداروں سے منسلک تھی، زیادہ تر طلباء شیعہ زمینداروں کے لئے کام کرنے والے مقامی سُنی مزارعین کے خاندانوں سے آتے تھے۔

اس لئے یہ شاید کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے کہ افغانستان میں شدت پکڑتے ہوئے جہاد اور خطے میں اسلحے کی بھرمار کی بدولت ایس ایس پی اور ٹی این ایف جے کے درمیان مخاصمت تشدد کی صورت اختیار کر گئی۔ 1988 میں عارف حسین الحسینی کو جو ٹی این ایف جے کی قیادت کے درجے تک پہنچ گیا تھا اور بڑھتی ہوئی محاذ آرائی کے راستے پر گامزن ہو چکا تھا، غالباً ایس ایس پی کے بندوق برداروں نے موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ دو برس بعد شیعہ انتقام لینے میں کامیاب ہو گئے اور انہوں نے سپاہ صحابہ کے بانی حق نواز جھنگوی کو گولیاں مار کر ہلاک کر دیا۔ بعدازاں جھنگوی کی ہلاکت کے بعد چلنے والی باہمی انتقام پر مبنی ہلاکتوں کی لہر کا نتیجہ جس کی زد میں لاہور میں ایک ایرانی سفارت کار بھی آ گیا تھا، 1991 میں سپاہ محمد تشکیل کی صورت میں سامنے آیا جو کہ ٹی این ایف جے کی ایک چھوٹی مگر زیادہ متشدد شاخ تھی۔ اس کے بہت سے ارکان روس مخالف جہاد کے تجربہ کار جانباز تھے جنہیں ان کے شیعہ پس منظر کے باوجود مجاہدین کی غالب سنی اکثریت پر مشتمل صفوں میں خوش آمدید کہا گیا تھا۔ اس نکتے کو فرقہ ورانہ فسادات کی سیاست میں ان کی شمولیت کے موقع پر نظر انداز کر دیا گیا تھا۔ اس دوران بانی تنظیم ٹی ایم ایف جے نے بالکل ہی مخالف حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے اپنا نام تبدیل کرنے کے ساتھ ہی محاذ آرائی میں بھی کمی کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

اگرچہ سپاہ صحابہ نے اپنے جوش خطابت کو کم کرنے کے حوالے سے کوئی زیادہ پیشرفت

نہ دکھائی تاہم اس نے قومی سطح کی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کرتے ہوئے 1988 میں ہی قومی اسمبلی کی نشستوں پر اپنے امیدوار کھڑے کر دیئے تھے۔ حق نواز جھنگوی اس برس خود تو کوئی کامیابی حاصل نہ کر سکا مگر 1990 میں اس کے قتل کے بعد تنظیم کے نئے نائب رہنما مولانا اسرار الحق قاسمی کو کامیابی حاصل ہوگئی تھی جس سے یہ ثابت ہوتا تھا کہ اس وقت تک سرائیکی علاقوں میں شیعہ مخالف جذبات کس طرح پروان چڑھ چکے تھے۔ 1994 تک سپاہ صحابہ میں سپاہ محمد کا خود اپنا نمونہ وجود میں آ چکا تھا۔ لشکر جھنگوی جیسا کہ اس کو اس کے بانی کے اعزاز میں پکارا جاتا تھا، حجم اور عزائم کے لحاظ سے اپنی مخالف شیعہ تنظیم سے مماثلت رکھتی تھی، اور سپاہ محمد کی طرح زیادہ تر جنگی تجربہ رکھنے والے مجاہدین پر مشتمل تھی۔ اگلے کئی برسوں تک دونوں تنظیموں میں انتقامی ہلاکتوں کا سلسلہ جاری رہا جس میں انتہا پسندی دیوبندی تنظیم کا پلڑا بھاری رہا تھا۔ 1998 میں میرے پاکستان پہنچنے تک لشکر جھنگوی فرقہ ورانہ فسادات کی دلدل میں بری طرح دھنس چکا تھا اور ریاست کے خلاف فیصلہ کن انداز میں متحرک ہو جانے والی اولین تنظیم کی صورت میں منظر عام پر آ رہا تھا۔

اگرچہ 1989 میں روسیوں کی افغانستان سے روانگی کے وقت اس طرح کی بہت سی تبدیلیاں ابھی مستقبل کا حصہ تھیں، تاہم پاکستان کو مذہبی خطوط پر تقسیم کر کے رکھ دینے والے فرقہ ورانہ فسادات کی بنیاد اسی وقت رکھ دی گئی تھی۔ دیوبندی فرقے کے اندر پیدا ہونے والی یہ تحریک بتدریج ایچ یو جے آئی کی شکل میں اس جہادی جذبے کے ساتھ مدغم ہو جاتی ہے جس کی نمائندگی ہزاروی کے اختتام پر جیشِ محمد کی بنیاد رکھنے کی صورت میں ہوتی ہے۔ تاہم فروری کے اس دن یہ سب کچھ ممکنہ طور پر پاکستانی حکام کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔ نہ صرف یہ کہ روسی افغانستان چھوڑ کر جا رہے تھے بلکہ امریکہ بھی اپنی مالی امداد ختم کر کے، اپنی سفارتی سرگرمیوں میں ڈرامائی حد تک کمی کر کے اور پاکستان کو روس مخالف جہاد کے ناخوشگوار اثرات سے نمٹنے کے لئے اکیلا چھوڑ کر اپنی حمایت و تعاون کا سلسلہ ختم کر رہا تھا۔ روسی اپنے پیچھے جو افغان کمیونسٹ حکومت چھوڑ گئے تھے وہ ابھی تک زوال پذیر نہیں ہوئی تھی جیسا کہ سب توقع کر رہے تھے، بلکہ مجاہدین کے خلاف اپنی مدافعت برقرار رکھے ہوئے تھی۔ کابل میں فتح کا کوئی جلوس نہیں نکلا۔ لڑائیوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور جس صورتحال کو بعد میں افغان خانہ جنگی کا نام دیا گیا وہ شروع ہونے والی تھی۔

امریکہ، سوویت افواج کی واپسی اور مشرقی یورپ میں سوویت یونین کی شکست و

ریخنت جیسے واقعات کی الجھن کے ساتھ ایٹمی ہتھیاروں کے پھیلاؤ جیسے دیگر مسائل کی طرف متوجہ ہو رہا تھا۔ ڈیڑھ برس سے کچھ ہی زیادہ عرصے کے بعد اکتوبر 1990 میں امریکہ نے اپنے سابقہ حلیف پر تعزیری پابندیاں عائد کر دیں۔ یہ پابندیاں پریسلر ترمیم کے تحت عائد کی گئی تھیں، یعنی ایک ایسی قانونی کاروائی جس کا مقصد سمنگٹن ترمیم کی طرح پاکستان پر دباؤ ڈالنا تھا کہ وہ اپنے ایٹمی پروگرام سے دستبردار ہو جائے گا۔ تاہم اس امر کا کوئی امکان نہیں تھا کہ پاکستان ایسا کرے گا کیونکہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کو اس حقیقت کے پیش نظر اپنی قومی دفاعی حکمت عملی کا ایک اہم جزو گردانتے ہیں اور گردانتے رہیں گے کہ انڈیا کے پاس بھی ایٹمی ہتھیار ہیں۔ پریسلر ترمیم کا مقصد پاکستانیوں کو اس حقیقت کی یاددہانی کرانا تھا کہ امریکہ کی امداد میں نہ صرف عدم تسلسل پایا جاتا ہے بلکہ یہ ناقابل انحصار بھی ہے۔ پاکستان کے سول اور ملٹری حلقوں میں اکثریت کے نزدیک پریسلر ترمیم ان کی عزت اور وقار پر ایک طمانچہ ہونے کے ساتھ ہی امریکہ کی طرف سے بے وفائی کا ایک ایسا داغ تھا جو پاک۔ امریکہ تعلقات کو طویل عرصے کے لئے بدنما کر گیا۔

مگر اس کے ساتھ ہی پاکستان افغانستان میں اپنی کامیابیوں پر بوجوہ مطمئن نظر آتا تھا۔ یہ کامیابی، درحقیقت، اس نے اکیلے حاصل نہیں کی تھی۔ امریکہ اور سعودی عرب کی مالی امداد نے اس حوالے کوسے فیصلہ کن کردار ادا کیا تھا۔ طیارشکن سٹنگر میزائلوں نے، جو کہ مجاہدین کو 1986 کے شروع میں فراہم کئے گئے تھے، انہیں وہ حتمی برتری عطا کی تھی جس کی بدولت وہ سوویت یونین کو افغانستان سے نکل جانے پر مجبور کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ تاہم آئی ایس آئی کو یقین تھا کہ اسے بہرحال ایک اہم سبق حاصل ہو گیا ہے۔

اس نے دیکھا تھا کہ کس طرح دشمن کو شکست دینے کے جذبے سے سرشار باغیوں کا ایک مختصر سا گروہ اس کی رہنمائی اور اسلام کی عظمت و سربلندی قائم رکھنے کے محرک کے تحت کاروائی کرتے ہوئے اس وقت کی دنیا کی دوسری عظیم طاقت کو بھی گھٹنے ٹیکنے پر مجور کر سکتا تھا۔ یہ ایک ایسا سبق تھا جسے وہ بھولنا نہیں چاہتی تھی۔ اولین جہادی اور متشدد فرقہ ورانہ تنظیموں کی تشکیل کی جا چکی تھی۔ ان کی صفوں کو مجاہدین فراہم کرنے والے مدارس کی تعداد میں تیزی سے اضافہ ہوتا جا رہا تھا نہ صرف شمال مغرب میں پشتونوں کی سرزمین پر بلکہ جنوبی پنجاب کی سرائیکی پٹی میں بھی۔ اگرچہ انتہاپسند اسلامی قوتوں کا تناسب پاکستان کی مجموعی آبادی میں بہت ہی کم تھا مگر جہاد کیلئے ان

کا جوش وخروش ایک بہت ہی خطرناک ہتھیار بن جانے کے امکانات کا حامل تھا بشرطیکہ ان کی شدت پسندی پر پاکستانی حب الوطنی کا رنگ چڑھا دیا جاسکتا۔

افغانستان میں انکی کامیابی پر نازاں، آئی ایس آئی انہیں ایک اہم وسیلہ سمجھنے لگی تھی نہ کہ کوئی خطرہ۔ بس اگر ضرورت تھی تو ایک عظیم مقصد کی۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

4

کشمیر، انڈیا، اور جہاد کی سرکاری سرپرستی

یہ 1986 میں بھارتی مقبوضہ کشمیر کا ایک مسلمان دیہات ہے۔ پاکستان ار بھارت کے درمیان کرکٹ کے ایک سنسنی خیز بین الاقوامی مقابلے کے حتمی مرحلے پر ریڈیو سے نشر ہوئے تبصرے کو سننے کے لئے دو دو کانوں پر لوگوں کا ہجوم اکٹھا ہے۔ اس سارے مقابلے کے دوران پاکستانی ٹیم نے کسی اچھی کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا اور ان کی جیت کے امکانات بہت ہی کم ہیں۔ وہ اپنی آخری بال کھیلنے والے ہیں ابھی کئی رن بنانے باقی ہیں۔ ان کی جیت کا صرف ایک ہی طریقہ رہ گیا ہے اور وہ ہے ہوم رن (بیس بال میں وہ رن جس کے بعد کھلاڑی پورے میدان کا چکر لگا سکے) کی طرح کا کوئی موقع جو کہ امریکہ کے بیس بال کے کھیل کی نسبت کرکٹ میں بہت کم ملتا ہے۔ تاہم جاوید میانداد اس طرح کا نایاب مظاہر کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے اور بال کو پوری طاقت سے گھما کر سٹینڈ میں پھینکتے ہوئے ایک یقینی نظر آنے والی شکست کے جبڑے سے ڈرامائی فتح چھیننے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ میچ پر رواں تبصرہ سنتے ہوئے دیہاتیوں کو اپنی سماعت پر بمشکل ہی یقین آتا ہے۔ وہ اس اچانک معجزہ نما فتح پر خوشی سے جھوم اٹھتے ہیں۔ مگر ستم ظریفی تو یہ ہے کہ وہ بھارت کے شہری ہیں اور خود اپنی قومی ٹیم کے خلاف پاکستان کی حمایت کرتے رہے ہیں۔ اپنی کتاب ''کرفیو نائٹ'' میں بھارتی صحافی بشارت پیر نے اپنے بچپن کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے اس واقعے کی جس طرح منظر کشی کی ہے وہ اس حقیقت کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ کس طرح محض ایک واقعہ کشمیر میں مسلمانوں کی اس ملک سے اجنبیت کی بھرپور عکاسی کرتا ہے جس میں کہ وہ رہائش پذیر ہیں۔ ان کی زندگی میں اور جو بھی خواہش ہو مگر یہ ایک

ناگزیر حقیقت ہے کہ وہ انڈیا کے محکوم نہیں رہنا چاہتے۔ میانداد کی طرف سے ایک شاندار فتح کا باعث بننے والے اس چھکے کا واقعہ اب 25 برس پرانا ہو چکا ہے اور اس دوران بہت سے اور واقعات بھی رونما ہو چکے ہیں، تاہم وقت گزرنے اور بھارتی حکومت کے خلاف بغاوت کے دوران بیس ہزار سے زائد افراد کی ہلاکت کے باوجود بھی یہ بنیادی حقیقت اپنی جگہ برقرار ہے۔ کشمیری مسلمان محکومی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

وہ 1965 میں اس وقت بھی حکومت وقت کے خلاف نہ اٹھ سکے جب ایوب نے ایک بغاوت کو جنم دینے کی امید میں وادی کشمیر کے اندر اسی فوج کی قیادت میں غیر رسمی فوجیں اتار دی تھیں۔ تاہم وہ ربع صدی کی تاخیر سے، اس کرکٹ مقابلے کے محض تین برس بعد ایسا کرنے میں کامیاب ہو گئے جسے کشمیری اپنا انتفاضہ کہتے ہیں۔ ان دو واقعات کے درمیانی برسوں کے دوران پیش آنے والے واقعات سے یہ وضاحت ہو جاتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا۔ جیسا کہ ہم نے باب وال میں دیکھا ہے ایوب کی طرف سے کشمیر میں بری طرح ناکام ہو جانے والی کاروائی کے آغاز کے چھ برس بعد پاکستان انڈیا کے ساتھ ایک اور جنگ کی تباہ کن غلطی کر بیٹھا تھا جس کا نتیجہ بنگلہ دیش سے محرومی کی صورت میں برآمد ہوا۔ شورش برپا کر دینے والا یہ واقعہ نہ صرف پاکستان پر بہت گہرے اثرات مرتب کر گیا بلکہ تاوقت جیل میں مقید کشمیری رہنما شیخ عبداللہ کے لئے بھی اہم مضمرات کا حامل ثابت ہوا۔ انڈیا کی حکومت نے اسے 1968 میں اس وقت رہا کر دیا تھا جب سری نگر کی تقریباً ساری کی ساری آبادی اس کے استقبال کے لئے امڈ آئی تھی، مگر وہ اسی طرح باغی نظر آتا تھا جیسا کہ وہ ہمیشہ سے رہا تھا اور اسی لئے 1965 کی طرح اسے ایک مرتبہ پھر فوراً جیل میں ڈال دیا گیا۔ تاہم تین برس بعد 1971 کی جنگ میں پاکستان کو ہونے والی عبرتناک شکست کے بعد وہ اس تلخ نتیجے پر پہنچ گیا کہ ایک آزاد و خودمختار کشمیر کے لئے اس کی امیدیں کبھی نہیں پوری ہونے والی۔ خود آگہی و خود شناسی کے چار برس اور گزر جانے کے بعد اپنی زندگی کے اختتام پر پہنچتے ہوئے اس بوڑھے آدمی نے آخرکار تعاون پر آمادگی ظاہر کرتے ہوئے نیو دہلی کے ساتھ معاہدے کے تحت ایک خودمختار کشمیر کے مطالبے سے دستبردار ہونے کا اعلان کر دیا۔ اس کے بدلے اسے فروری 1975 میں وزیراعلیٰ کے طور پر سری نگر کے تخت پر بٹھا دیا گیا۔

عشرے کے زیادہ برسوں کے لئے نیو دھلی کے ساتھ کیا جانے والا معاہدہ نافذ العمل

رہا۔ شیخ عبداللہ کا آخر کار 1982 میں انتقال ہو گیا اور اس کی جگہ اس کے بیٹے فاروق عبداللہ نے لے لی جس کی شہرت ایک رنگین مزاج شخص کی تھی۔ سیاسی طور پر ناتجربہ کار فاروق نے ابتداء میں ہی غلط تخمینوں کی بنیاد پر 1984 میں انڈیا کے پارلیمانی انتخابات میں حکمران جماعت کانگرس کے خلاف بننے والے حزب مخالف کی جماعتوں کے اتحاد میں شمولیت پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ کانگرس کے نزدیک یہ 1975 میں اس کے باپ کے ساتھ ہونے والے سمجھوتے کی خلاف ورزی تھی اور ان نے پردے کے پیچھے رہتے ہوئے اسے اس کی اپنی ہی جماعت کے ہاتھوں اقتدار سے بالکل اس طرح محروم کروا دیا جس طرح 1953 میں شیخ عبداللہ کے خلاف شورش کروا کے اسے بھی اقتدار سے بے دخل کروا دیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں پورے کشمیر میں مظاہرے شروع ہو گئے جن پر قابو پانے کے لئے بھارتی حکومت نے بے دھڑک انداز میں بار بار کرفیو لگانے کے ساتھ ہی پیرا ملٹری فورسز بھی تعینات کر دیں۔ دو برس بعد بھارتی حکومت نے ہندوؤں کی اقلیتی آبادیوں پر کشمیری مسلمانوں کے حملوں کے ردعمل کے طور پر انتظامی امور براہ راست نیو دھلی سے نمٹانے کا فیصلہ کر لیا۔ 1986 کے اختتام پر فاروق عبداللہ نے، جو کہ اقتدار میں واپسی کے لئے بے تاب تھا، آخر کار بھارتی حکومت کے ساتھ اپنے طور پر نیا معاہدہ کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اپنے پیشرو اور والد شیخ عبداللہ کی طرح اس نے اقتدار میں واپسی کے لئے نئی دھلی کے تابع فرمان رہنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔

تاہم اپنے مشہور و مقبول والد کی طرح فاروق کو کشمیری عوام کی حمایت حاصل نہ ہو سکی۔ انہوں نے اس کی طرف سے اطاعت شعارانہ سمجھوتے کو مایوس کن جذبات کے ساتھ تسلیم کرنے کی بجائے حقارت کے ساتھ مسترد کر دیا۔ اس مرتبہ پر وہ مزاحمت کرنے پر تُل چکے تھے۔ آنے والے موسم بہار میں کشمیر کے اندر مقامی سطح پر ہونے والے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے جلدی میں حزب مخالف کی جماعتوں پر مشتمل ایک اتحاد تشکیل دے دیا گیا۔ اس اتحاد نے اچھی کارگردگی کا مظاہرہ کیا مگر اس کا کوئی خاص فائدہ نہ ہوا؛ عبداللہ نے نئی دھلی میں اپنے آقاؤں کی ملی بھگت سے انتخابات میں زبردست دھاندلی کر ڈالی۔ ایک مثال میں تو عبداللہ کے ایک شکست خوردہ امیدوار کو ووٹوں کی گنتی والے مرکز پر بلا کر اسے فتح کی خوشخبری سنانے کے ساتھ ہی اصل میں جیتنے والے امیدوار کو جیل بھجوا دیا گیا۔ ووٹوں کی گنتی میں اس طرح کی کھلم کھلا بددیانتی کا نتیجہ کشمیری عوامی کے

اندر مزید اشتعال کی صورت میں برآمد ہوا۔ عبداللہ نے انتخابات تو جیت لئے تھے مگر کشمیری عوام کی حمایت سے محروم ہو گیا۔ اس سے بھی اہم بات یہ ہوئی کہ ایک ایسی آگ بھڑکا دی گئی جو آج تک ٹھنڈی نہیں ہو سکی۔

اگلے دو برسوں کے دوران جب کہ افغانستان سے آخری روسی فوجی بھی روانہ ہو رہا تھا، کشمیر کے اندر سول نافرمانی اور تشدد کی ایک بڑھتی ہوئی آگ نے پوری وادی کو اپنی لپیٹ میں لینا شروع کر دیا۔ وقتاً فوقتاً کی جانے والی ہڑتالوں کے ساتھ ہی بڑے بڑے جلوس اور مظاہرے بھی ایک معمول بن گئے۔ سرکاری تنصیبات پر بم پھینکے جانے لگے۔ 1989 کے اواخر میں حکومتی عہدیداروں اور مشکوک مخبروں کو قتل کرنے کے واقعات پہلی مرتبہ منظر عام آئے۔ اگلے برس جنوری تک وادی میں بڑھتے ہوئے انتشار کی بدولت نیو دھلی کو ایک مرتبہ پھر وادی کا انتظام براہ راست اپنے ہاتھ میں لینا پڑا۔ اسی ماہ ہونے والے تین عدد احتجاجی مظاہروں کے دوران امن و امان کے لئے بھیجی گئی پیرا ملٹری فورسز کے ہاتھوں 300 سے زائد نہتے کشمیری مظاہرین کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ انتفاضہ کے ابتدائی دنوں کی ایک علامتی خصوصیت یہ تھی کہ بہت سے کشمیری مرد اپنے گھروں سے اچانک غائب پائے جانے لگے۔ ان میں سے زیادہ تر جموں کشمیر لبریشن فرنٹ (JKLF) میں شمولیت کے تمنائی طالب علم تھے، جو کہ علیحدگی پسندوں کی ایک ایسی تنظیم تھی جو 1977 میں شیخ عبداللہ کی طرف سے دو برس قبل ترک کی گئی جدوجہد آزادی کو دوبارہ شروع کرنے کی غرض سے تشکیل دی گئی تھی۔ مگر توقعات کے برعکس انہیں بھارتی حکومت کی طرف سے گرفتار نہیں کیا گیا تھا بلکہ وہ خود ہی مختلف راستوں سے ہوتے ہوئے گھومتے گھماتے اس لائن آف کنٹرول تک پہنچ گئے تھے جو بھارتی کشمیر کو پاکستانی آزاد کشمیر سے علیحدہ کرتی ہے۔ وہاں سے وہ سرحد پار کر کے پاکستانی علاقے میں داخل ہو گئے تھے۔

سرحد کے دوسری طرف پاکستانی فوج ان کے لئے چشم براہ تھی۔ سوویت قبضے کے دوران افغانستان میں بری طرح مصروف عمل رہنے کے باوجود پاکستان کشمیر سے کبھی بھی پوری طرح غافل نہیں ہوا۔ جے کے ایل ایف سے ان کے روابط 1984 کے زمانے سے ہی اس امید پر استوار ہو گئے تھے کہ بھارتی حکومت کے خلاف مل کر کوئی منصوبہ تیار کیا جائے گا مگر نیو دھلی کی طرح ان کو بھی انتفاضہ کے تیزی سے عروج و استحکام کی طرف گامزن ہو جانے پر شدید حیرت ہوئی۔

افغانستان سے وہ چونکہ پہلے ہی مراجعت کر رہے تھے، لہذاء انہیں اب کشمیر میں انڈیا کے ساتھ وہی سلوک کرنے کا موقع نظر آرہا تھا جو انہوں نے افغانستان میں روس کے ساتھ کیا تھا بالکل ویسے ہی وسائل اور تکنیکوں کے ذریعے جو انہوں نے افغانستان میں استعمال کی تھیں۔ یہاں بھی افغانستان کی طرح گوریلا جنگ کے کامیاب اصول و تکنیکیں استعمال کرنے کا ایک سنہرا موقع ہاتھ آرہا تھا۔ انہوں نے جے کے ایل ایف سے بھرتی کردہ نوجوانوں کو، جو کہ لائن آف کنٹرول سے جوق در جوق اس طرف آرہے تھے، تربیت اور اسلحہ دے کر دوبارہ وادی کے اندر سرایت ہو جانے میں بھی مدد فراہم کر دی جہاں بھارت کی ان پیراملٹری فورسز اور فوجیوں پر حملے کرتے جنہیں وادی میں بغاوت کچلنے کیلئے بھیجا گیا تھا۔ تاہم جے کے ایل ایف کو ایک اہم مسئلہ درپیش تھا۔ یہ ایک سیکولر تنظیم تھی اور بہت جرات اور ہمت سے لڑی جو کہ پاکستان کے حساب سے بالکل مناسب تھا۔ تاہم مسئلہ یہ تھا کہ یہ ایک علیحدگی پسند تحریک تھی۔ اس کے رہنماؤں کو اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ وہ بھارتی تسلط سے رہائی صرف اس لئے حاصل کریں کہ بعد میں ایک ایسی مفلوک الحال ریاست میں شامل ہونا پڑے جو فوجی آمریت کا رجحان رکھتی تھی۔ ان کا مقصد، جو کسی زمانے میں شیخ عبداللہ کا مقصد بھی رہا تھا ایک آزاد و خودمختار کشمیر تھا۔

پاکستان جے کے ایل ایف کو بغاوت کے ابتدائی مراحل میں تعاون و امداد سے نواز کر بہت خوش نظر آتا تھا۔ تاہم یہ بنیادی طور پر پہلے ہی سے انتفاضہ کے ساتھ محاذ آرائی میں الجھی ہوئی بھارتی حکومت پر دباؤ بڑھانے کا ایک حربہ تھا۔ انہیں اس امر سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ بعد ازاں ایک آزاد و خودمختار ملک کی حکومت انہیں ان کوششوں کا صلہ عطا کرے گی۔ انہوں نے جے کے ایل ایف سے زیادہ قابل قبول متبادل کی تلاش شروع کر دی تھی جو کہ کشمیر میں ان کے سیاسی اہداف کی حمایت کر سکے۔ انہیں اس سے کوئی خاص فرق نہیں پڑتا تھا کہ آیا اس کے مقاصد مذہبی ہیں یا سیکولر، قوم پرستانہ ہیں یا جہادی جب تک کہ وہ کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کی جدوجہد میں حصہ لینے کو تیار ہے۔ انہیں اس تلاش میں زیادہ عرصہ نہیں لگا۔ انتفاضہ کے اولین دو برسوں کے اندر اندر تین امکانات ان کے سامنے آئے اور پاکستان نے ان میں سے ہر ایک سے فائدہ اٹھایا۔

پہلا امکان حزب المجاہدین کی صورت میں سامنے آیا جس کی تشکیل 1989 میں جماعت اسلامی کی کشمیر شاخ کے مسلح دھڑے کی صورت میں عمل میں آئی۔ کشمیری جماعت بھی جمعیت

اسلامی اور حزب اسلامی کی طرح جو کہ سوویت مخالف جہاد کے دوران افغانستان کے کچھ علاقے پر اثر ورسوخ رکھتی تھیں، متنازعہ علاقے کے اندر تھوڑے سے علاقے میں اپنا حلقہء اثر رکھتی تھی۔ بنیادی فرق صرف یہ تھا کہ یہ اپنی پاکستانی بانی جماعت سے اور بھی قریبی ربط رکھتی تھی۔ یہ وادی کے اندر بہت گہری جڑیں رکھتی تھی۔ اور 1987 کے انتخابات میں حزب مخالف کی جماعتوں کے اتحاد کی رکن کے طور پر حصہ لے چکنے کے باعث اگر کشمیر کی مقامی سیاست میں بہت زیادہ کامیاب نہیں تو کافی متحرک ضرور تھی۔ جب انتفاضہ منظر عام پر آنا شروع ہوئی تو یہ امر اتنا حیران کن نہیں تھا کہ اس کے کچھ ارکان نے بھی لائن آف کنٹرول کا راستہ اختیار کر لیا جہاں آئی ایس آئی کھلے دل سے ان کے استعمال کے لئے تیار تھی۔ ان میں سے ایک یوسف شاہ حزب مخالف کا وہ امیدوار تھا جس کو اوپر ذکر کئے گئے واقعہ کے مطابق جیت سے محروم کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ اس نے جلد ہی صلاح الدین کا فرضی نام اختیار کر کے حزب المجاہدین کی قیادت سنبھال لی۔

اگلے دو برسوں کے دوران پاکستان نے وسائل کا رخ بتدریج جے کے ایل ایف سے موڑ کر حزب المجاہدین کی طرف کر دیا جب تک کہ تربیت کیلئے لائن آف کنٹرول کے اس پار سے آنے والے نوجوانوں کے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ موخر الذکر میں شامل ہو جائیں۔ قطع نظر اسکے کہ وہ جماعت اسلامی کے حامی تھے یا نہیں۔ انتفاضہ کے ابتدائی مراحل کے دوران پے در پے نقصانات برداشت کرنے کے ساتھ ہی پاکستانی امداد و تعاون سے محرومی کے باعث جے کے ایل ایف نے آخر کار مسلح جدوجہد ختم کر دیتی ہے جب کہ حزب المجاہدین کشمیر میں ایک غالب باغی تنظیم کی صورت میں منظر عام پر آجاتی ہے۔ اگرچہ حزب المجاہدین کے قائدین اپنے افغان ہم منصب بھائیوں کی طرح مذہبی حسب نسب رکھتے تھے، تاہم ان کے مقاصد یا عزاء خالص مذہبی نوعیت کے نہیں تھے۔ یہ تنظیم اپنی ظاہری ساخت کے لحاظ سے بھرپور کشمیری رنگ میں رنگی نظر آتی تھی جبکہ اس کا بنیادی مقصد بھارتیوں کو اپنے وطن سے نکال باہر کرنا تھا۔ اس مقصد کے حوالے سے وہ جے کے ایل ایف کے ساتھ متفق نظر آتی تھی مگر اس نے اپنی سیکولر تنظیم سے مقبوضہ علاقے کے مستقبل کے حوالے سے اختلاف کے باعث علیحدگی اختیار کر لی تھی۔ حزب المجاہدین نے کشمیر کو پاکستان کا حصہ بنانے کے نظریئے کی حمایت پر اپنی پاکستان بانی تنظیم سے مکمل وفاداری کا مظاہرہ کیا اور اس کو عملی شکل دینے کے لئے آئی ایس آئی اور پاکستانی

فوج کے ساتھ خوشی خوشی تعاون کیا۔ میں نے ایک مرتبہ جماعت اسلامی پاکستان کے رہنما قاضی حسین احمد سے سوال کیا تھا کہ حزب المجاہدین جو آپ کے دعویٰ کے مطابق آپ کے کنٹرول میں ہے کس طرح ایک ہی وقت میں جماعت کی قیادت اور آئی ایس آئی دونوں سے احکامات لے سکتی تھی۔ تھوڑی دیر توقف کرنے اور پھر ہلکی سے مسکراہٹ چہرے پر لانے کے بعد اس نے یوں جواب دیا، ''یہ پاکستان ہے''۔

حزب المجاہدین کے ساتھ کشمیر میں جلد ہی دو عدد اور تنظیمیں بھی آملیں، اور دونوں ہی زیادہ واضح جہادی محرکات یا عزائم رکھتی تھیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ایچ یو جے آئی روس مخالف جہاد کے دوران پہلی خالص پاکستانی تنظیم کے طور پر سامنے آئی تھی، مگر عرب مجاہدین کی طرح وہ اپنے افغان تجربے کی بدولت انتہاء پسندی کی راہ پر گامزن ہو چکے تھے اور جہادی مقاصد کے لئے نئے مواقع کی تلاش میں بے تاب نظر آتے تھے۔ اور ان کی خوش قسمتی کہ کشمیر میں انتقاضہ نے اس وقت زور پکڑنا شروع کیا جب آخری روسی بھی افغانستان سے روانہ ہو چکا تھا۔ چنانچہ ایچ یو جے آئی کے لیے یہ تصور کرنا اتنا مشکل نہیں تھا کہ ایک اور ممکنہ جہاد سر پر آپہنچا ہے۔ سوویت یونین کی شکست کے ساتھ ہی انہوں نے اپنی توجہ کا مرکز شمال مشرق کو بنا لیا تا کہ وادی کشمیر سے کافر ہندوؤں کو نکال باہر کرنے میں اپنے مسلمان بھائیوں کی مدد کر سکیں۔ اس حوالے سے یقینی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ایچ یو جے آئی رضا کار کشمیر کب یا کتنی تعداد میں پہنچے تھے۔ کچھ حد تک یہ اشارہ ملتا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ آئی ایس آئی اس خوف سے کہ پاکستانی شہریوں کو دیکھ کر بھارتی حکومت کہیں انتقامی کاروائیوں پر نہ اتر آئے، ان کی مدد کرنے سے پہلے پہل ہچکچاہٹ کا شکار ہوئی ہو گی۔ ایچ یو جے آئی کی قیادت کے اندر اس وقت تک اختلافات کی بنا پر ٹوٹ پھوٹ شروع ہو چکی تھی اور 1993 میں اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ اس کے قائدین حرکت الانصار (HUA) کے نام سے نئی تنظیم بنا کر دوبارہ متحد نہ ہو گئے۔ اس وقت تک آئی ایس آئی کشمیر میں پاکستانی شہریوں کو بھجوانے کے حوالے سے اتنی متذبذب نظر نہیں آتی تھی اور ایچ یو اے کے پیدل دستے لائن آف کنٹرول کے اس طرف پہنچنا شروع ہو گئے۔ اس دوران پاکستان کے اندر ایچ یو اے دیو بندیوں سے مالا مال سرائیکی پٹی کے اندر اپنی رکنیت وسیع کرنے میں مصروف رہی۔ نئے بھرتی ہونے والوں میں جلد ہی بدنامی کی حد تک شہرت حاصل کرنے والی بہاولپور کی مشہور شخصیت

مولانا مسعود اظہر بھی شامل تھا جو جلد ہی ایچ یو اے کی اعلیٰ نظریاتی شخصیات میں شمار ہونے لگا۔

اور عین اسی وقت لشکر طیبہ کے نام سے ایک نئی تنظیم بھی سامنے آ گئی۔ یہ دعوت والا رشاد نامی اس تبلیغی ادارے کا جہادی دھڑا تھا جو کہ پاکستان کے سنی فرقوں مین سب سے چھوٹے فرقے اہل حدیث کے نظریات کا پرچار کرنے کی غرض سے کئی برس قبل وجود میں آیا تھا۔ دعوت والا رشاد کی بنیاد لاہور کی انجینئرنگ یونیورسٹی میں مذہبی علوم کی تعلیم دینے والے پروفیسر حافظ سعید نے رکھی تھی۔ وہ اس وہابی عالم دین عبداللہ عزام کی تعلیمات سے متاثر تھا جس نے، جیسا کہ ہم نے پہلے ذکر کیا ہے، اسامہ بن لادن کو بھی افغان مجاہدین کی صفوں میں کھڑا کیا تھا اور جس کی کتاب ''ڈیفنس آف مسلم لینڈز'' جہادیوں کا عالمی منشور بن چکی تھی۔ اس کے بعد وجود میں آنے والی لشکر طیبہ بھی، جس کا مطلب ہے ''پاک لوگوں کی فوج'' کشمیر میں انتفاضہ کے منظر عام پر آنے کے دنوں میں یہی تشکیل پائی تھی جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس کی تخلیق کا خصوصی مقصد کشمیر میں جہادی سرگرمیوں کا فروغ تھا۔ حافظ سعید نے تنظیم کے بنیادی مقصد کا کھلے عام اعتراف کرنے میں کبھی شرم محسوس نہیں کی اور وہ مقصد ہے کشمیر کو آزاد کرانا جو کہ تمام بھارتی مسلمانوں کی حتمی آزادی کی طرف پہلا قدم ہوگا۔

یہ امر واضح نہیں ہے کہ آیا آئی ایس آئی نے لشکر طیبہ کی تشکیل کی حوصلہ افزائی بھی کی تھی یا محض اس کی موجودگی کا فائدہ اٹھایا تھا۔ کشمیر میں جہادی تنظیموں کا سراغ لگانے والی بھارتی ویب سائٹ ساؤتھ ایشیاء ٹریزم پورٹل کی تحقیق کے مطابق وادیء کشمیر مین اس موجودگی پہلی مرتبہ 1993 میں دیکھی گئی۔ اگرچہ یہ وقت اس کی تشکیل میں آئی ایس آئی کے کردار سے مطابقت رکھتا ہے، تاہم اس کا کبھی بھی کوئی حتمی ثبوت نہیں ملا۔ مگر جو نکتہ واضح نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ انتفاضہ کی تشکیل کے ابتدائی مراحل میں آئی ایس آئی نے لشکر طیبہ اور ایچ یو اے دونوں سے مراسم استوار کر لئے تھے اور اس کا مقصد یہ تھا کہ ان سے بھی وہی کام لیا جائے جو کام عرب جہادیوں اور پاکستانی رضا کاروں سے سوویت مخالفت جہاد کے دوران لیا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کے مذہبی نظریات سے متفق تھی یا پھر ان کے حتمی مقاصد کی اسی طرح یا اس سے زیادہ حامی تھی جتنا کہ امریکہ جہادیوں، مثلاً اسامہ بن لادن سے اس وقت متفق نظر آتا تھا جب اس نے انہیں مجاہدین کو صفوں میں خوش آمدید کہنے پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ اس کی بجائے پاکستان ان تنظیموں کو

خارجہ پالیسی کے ایسے حربے یا وسیلے کے طور پر دیکھتا تھا جسے کشمیر میں بھارتی بالادستی کا مقابلہ کرنے کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ اس حقیقت کو کہ لشکر اور حرکت الانصار پاکستانی تنظیمیں تھیں، بلاشبہ ایک مثبت انداز میں لیا گیا کیونکہ وہ بیرونی عناصر کی بجائے اپنے ہی مسلمان بھائی تھے اور یوں ریاست کے ساتھ ان کے اندر کچھ نہ کچھ وفاداری باقی رہ جانے کی توقع کی جا سکتی تھی۔ اس وقت صورتحال کو قریب سے دیکھنے والے فوج کے ریٹائرڈ اعلیٰ افسروں کے ساتھ بے شمار مباحث کے بعد مجھے یہ امر واضح نظر آتا ہے کہ وہ یہ سمجھتے تھے کہ وہ انہیں کنٹرول کر سکتے تھے۔

ثبوت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دہائی کے اختتام کی طرف جاتے جاتے لشکر اور حرکت الانصار پر آئی ایس آئی کا انحصار بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کی کچھ وجوہات کا تعلق خود کشمیر کے اندر پیش آنے والے واقعات سے تھا۔ کشمیر روز بروز ایک میدان جنگ کی شکل اختیار کرتا جا رہا تھا کیونکہ بھارت نے خطے کے اندر بڑے پیمانے پر فوج بھیجنے کا سلسلہ شروع کر رکھا تھا جس کی تعداد بعض اندازوں کے مطابق پانچ لاکھ تک پہنچ گئی تھی۔ یہ تعداد بھارتی فوج کا اچھا خاصا تناسب تھا جو کہ ویت نام جنگ کے عروج کے دنوں میں امریکی فوج کے تناسب کے برابر نظر آتا تھا۔ بشارت پیر نے اپنی کتاب کے ایک باب کو ''بنکرستان'' کا عنوان دیا ہے جو کہ اس وقت وادی کے اندر بھاری تعداد میں بھارتی فوجوں کی موجودگی کی طرف اشارہ اور جس کا ثبوت شہری اور دیہی علاقوں میں برابر طور پر بکھرے ہوئے ہزاروں بنکر زیاز مین دوز پناہ گاہوں اور فوجی خیموں کی تنصیب کی صورت میں ملتا ہے۔ بھارتی فوج اپنے قافلوں اور تنصیبات پر ہونے والے حملوں کا جواب قریبی دیہاتوں اور متصل علاقوں میں غارت گری اور تشدد کی کارروائیوں کی صورت میں دیتی۔ بہت سے مردوں اور نوجوان لڑکوں کو ایک ریوڑ کی صورت میں ہنکا کر تفتیش کے لئے لے جایا جاتا اور مقامی مخبر بھی ساتھ ہوتے جو کہ ممکنہ جہادی ساتھیوں کی شناخت میں مدد دیتے جنہیں پھر وہاں سے خصوصی تفتیشی مراکز لے جایا جاتا اور وہاں ان کو تشدد کا نشانہ بنایا جاتا اس طریقہ کار کی بدولت حزب المجاہدین کی طاقت اور جذبہ مدھم پڑنا شروع ہو گئے۔ اگرچہ وہ ابھی بھی کشمیر کی سب سے بڑی باغی تنظیم میں شمار ہوتی تھی، مگر لائن آف کنٹرول کے اس پار سے تربیت کے لئے آنے والے خواہشمندوں کی تعداد روز بروز کم ہوتی گئی۔ اس صورتحال کی تلافی کے لئے آئی ایس آئی کا پاکستانی جہادیوں پر انحصار بڑھنے لگا۔

1998 میں میرے اسلام آباد پہنچنے تک کشمیر میں برپا کی جانے والی بغاوت ایک تھکا دینے والی کاہلانہ لڑائی میں تبدیل ہو چکی تھی۔ پاکستان اور بھارت لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب سے نہ ختم ہونے والی گولہ باری میں مصروف تھے۔ پاکستانی فوج کے دستے سرحد کے اس پار سے تربیت کے لئے سرایت کرنے والوں کو دشمن سے چھپانے کے لئے توپوں سے شدید گولہ باری شروع کر دیتے اور دوسری طرف سے بھارتی بھی اسی طرح کی جوابی کاروائی کرتے۔

سرحد کے دونوں طرف رہنے والے معصوم و بے گناہ شہری دوطرفہ فائرنگ کی زد میں آ کر اکثر جان سے ہاتھ دھو بیٹھتے حزب المجاہدین، لشکر طیبہ اور حرکت الانصار کا شمار وادی کے متحرک باغی گروہوں میں ہوتا تھا۔ مگر اس وقت تک ایچ یو اے اور امریکہ کے تعلقات میں بگاڑ پیدا ہو چکا تھا کیونکہ امریکہ نے اسے دہشت گرد تنظیم قرار دے ڈالا تھا۔ امریکہ نے یہ قدم 1995 کے اس واقعے کے بعد اٹھایا جب ایچ یو اے سے منسلک ایک تنظیم کے لوگوں نے وادی میں پہاڑوں کی سیر کرتے ہوئے پانچ مغربی سیاحوں کو اغواء کر لیا تھا۔ بعد میں ان میں سے ایک سیاح کا سرکٹی ہوئی حالت میں ملا جبکہ ایک فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا اور باقی تین کا کبھی سراغ ہی نہ ملا۔ اس ایک واقعے کو مغربی ذرائع ابلاغ مین اتنی توجہ ملی جتنی کہ ساری کی ساری کشمیری انتفاضہ کو اور کشمیر میں پاکستانی کوششوں کو بھی مغرب کی کڑی تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ اس کے نتیجے میں خود کشمیر کی تحریک آزادی کو بھی نقصان پہنچا جو کہ ان عناصر کے ساتھ روابط کی بناء پر اپنی ساکھ کھو بیٹھی۔ ان واقعات کے جواب میں حرکت الانصار نے اپنا نام تبدیل کر کے حرکت المجاہدین (HUM) رکھ لیا، شاید اس امید کے ساتھ کہ اس وہ کسی کی نظروں میں نہیں آئے گی۔

اس دوران لشکر طیبہ نے خود پاکستان کے اندر اپنا ایک وسیع جال پھیلاتے ہوئے 2000 سے زائد دفاتر قائم کر دیئے جن میں سے زیادہ تر کا مقصد خیراتی سرگرمیوں کا فروغ تھا۔ اس نے لاہور کے شمال میں جی ٹی روڈ پر واقع قصبے مرید کے میں اپنے صدر دفاتر کے طور پر ایک عظیم الشان عمارت تعمیر کر ڈالی جس کے اندر ایک بڑی مسجد، مدرسہ، ایک ہسپتال، مارکیٹ اور رہائشی کالونی بھی تعمیر کی گئی تھی۔ میں نے اس وقت کے اخبارات میں اس کے حوالے سے جو خبریں اور معلومات حاصل کی تھیں ان کے مطابق مرید کے میں ہونے والا اس کا سالانہ اجتماع شان و شوکت کا زبردست مظاہرہ ہوتا تھا جس میں ایک لاکھ تک لوگ شرکت کرتے تھے۔ تنظیم نے بڑی

تعداد میں خود اپنے مذہبی مدارس بھی قائم کر دیئے جہاں دیوبندی مدارس کی نسبت بہت بہتر معیار کی تعلیم دی جاتی۔ اس کی صفوں میں شامل بہت سے مجاہدین نچلے متوسط طبقے کے وہ لوگ تھے جو اسکول چھوڑ کر بھاگ نکلے تھے، تاہم اس میں یونیورسٹی سے فارغ التحصیل طالب علموں کی بھی کافی تعداد تھی۔ اس سے ڈاکٹر اور صحت کے شعبے میں کام کرنے والے ملازمین بھی بڑی تعداد میں تھے جنہوں نے اس کی دن بدن مقبول ہوتی ہوئی خیراتی سرگرمیوں میں اہم کردار ادا کیا۔ جہاں ایچ یو ایم کی رکنیت زیادہ تر صوبہ سرحد اور جنوبی پنجاب کی سرائیکی پٹی سے لی جا رہی تھی وہاں لشکر طیبہ کا اثر و رسوخ ایک وسیع تر علاقے خصوصاً وسطی پنجاب پر محیط تھا۔ میرے اس وقت کے تاثرات و مشاہدات کے مطابق، جس سے پاکستان میں جہادی سرگرمیوں کا مشاہدہ کرنے والے بھی اتفاق کرتے نظر آتے تھے، لشکر طیبہ کی سرگرمیوں کا محور بنیادی طور پر کشمیر کی تحریک آزادی تھی جس کو آئی ایس آئی کی امداد و تعاون حاصل تھا۔ یہ ایک ایسی تنظیم تھی جس کے مقاصد واضح تھے۔

اس وقت تک کشمیر بغاوت کو تقریباً ایک عشرہ گزر چکا تھا۔ تاہم تین مختلف جہادی تنظیموں کو لڑائی میں شامل کرنے کے باوجود بھارتی کسی طرح بھی ہار ماننے کو تیار نہیں تھے تاہم پاکستانی ان کی توجہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔1996 میں نیو دہلی خیر خواہی کے ایک ایسے مظاہرے پر تیار ہو گیا جسے اس نے بظاہر بلا کسی طنز کے اچھی ہمسائے کی پالیسی قرار دے دیا جس کا مقصد اسلام آباد کے ساتھ مکالمے کا آغاز تھا۔ دونوں طرف سے روابط کا آغاز وزیر خارجہ کی سطح کے نیچے پڑ گئی جیسے ''مرکب یا جامع مذاکرات'' کا نام دیا گیا اور جس کے تحت تمام متنازعہ امور بشمول کشمیر کو زیر غور لانے پر اتفاق ظاہر کیا گیا۔ یہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ربع صدی میں اہم نوعیت کے دوطرفہ مذاکرات کا اولین سلسلہ تھا۔ دونوں فریق اس سے قبل بنگلہ دیش پر ہونے والی جنگ کے فوری بعد1972 میں شملہ کے مقام پر ملے تھے۔ شملہ مذاکرات دو ملکوں کے درمیان تعلقات کے حوالے سے ایک اہم موڑ تھا۔ دونوں فریق کشمیر کے متنازعہ علاقے سے گزر کر جانے والی اس جنگ بندی لائن کے جغرافیائی خطوط کی تشکیل پر رضامند ہو گئے تھے جسے انہوں نے لائن آف کنٹرول کا نام دے دیا تھا۔ تاہم، بدقسمتی سے وہ لائن آف کنٹرول کے اس مقام کے حوالے سے بالکل واضح طور پر کوئی حد بندی کرنے میں ناکام ہو گئے جہاں سے یہ کشمیر کے انتہائی شمال میں واقع قراقرم پہاڑوں کے دل سیاچن گلیشئر کے دور افتادہ علاقے سے گزرتی تھی۔ چنانچہ یہ غفلت

ایک عشرے کے بعد اس وقت وجہ تنازعہ بن گئی جب پاکستان نے کوہ پیماؤں کو چوٹیاں سر کرنے کے اجازت نامے دینے شروع کر دیئے۔ بھارتیوں کو یہ خبر ملی تو انہوں نے گلیشئر پر فوجیں تعینات کرنی شروع کر دیں۔ جس کے جواب میں جلد ہی پاکستان نے بھی اپنی فوجیں روانہ کر دیں اور یوں لڑائی کا آغاز ہونے کے بعد بیس ہزار فٹ کی بلندی پر واقع دنیا کے سب سے بلند اس جنگی مقام پر آخر کار ایک تعطل سا پیدا ہو گیا جہاں بندوق یا توپ کی فائرنگ سے اتنے فوجی ہلاک نہیں ہوئے جتنے کہ برف سے ٹھٹھر کر یا برفانی تودوں کے نیچے آ کر ہلاک ہو چکے ہیں۔

تاہم شملہ مذاکرات کا سب سے مثبت پہلو یہ تھا کہ ان کے نتیجے میں دونوں فریق اس امر پر رضامند ہو گئے تھے کہ کشمیر پر باہمی تنازعات کا حل دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے نکالا جائے گا۔ یہ ایک ایسی رکاوٹ ہے جسے بھارتی حکومت پوشیدہ رکھنے کی کوشش کرتی چلی آ رہی ہے تا کہ کسی بھی تیسرے فریق کی طرف سے مداخلت کی حوصلہ شکنی کی جا سکے۔ تاہم ان کی کوشش کچھ زیادہ موثر یا کارآمد ثابت نہیں ہوئی کیونکہ شملہ معاہدہ بھی اس امر کی حمایت کرتا ہے کہ اختلاف کے حل کے لئے ''باہمی طور پر متفقہ کوئی بھی اور پرامن طریقہ'' استعمال کیا جا سکتا ہے۔ مگر اس کے باوجود دوطرفہ مذاکرات کے حوالے سے بھارتی بڑی تندہی سے اپنے موقف پر اڑے ہوئے ہیں باوجود اس حقیقت کے کہ اس سے قبل 1962 اور 1963 کے درمیان وہ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کے ساتھ کئے جانے والے مذاکرات کے چھ ادوار میں وہ امریکہ اور برطانیہ دونوں کو بطور ثالث قبول کرتے رہے ہیں۔ ان مذاکرات کے دوران دونوں بیرونی طاقتوں نے مذاکرات کی میز پر خود اپنی مخصوص تجاویز پیش کر دی تھی جن کا ماحصل یہ تھا کہ بھارت اور پاکستان دونوں کو وادی میں خاطر خواہ نمائندگی حاصل ہونی چاہئے۔ بھارت کشمیر پر اپنی ملکیت کے دعوے کمزور کر کے رکھ دینے کا امکان کی حامل کسی بھی بیرونی مداخلت سے خوش نہیں تھا اور یوں مذاکرات بے نتیجہ رہے۔ اس کے بعد بھارت نے شملہ معاہدے کے حوالے سے اس امر کو یقینی بنانے کی کوشش کی ہے ایسی صورتحال کا ہرگز اعادہ نہ ہو۔ میرے پاکستان پہنچنے کے وقت تک کینیڈی دور کے مذاکرات قصہ پارینہ بن چکے تھے اور امریکہ کے نزدیک کشمیر کے مسئلے پر بیرونی مداخلت یا معاونت کی اجازت نہ دینے کی بھارتی تکرار مقدس فرمان سفارتی متبادل تھا۔

اگرچہ بھارت اور پاکستان نے 1996 میں دوبارہ مذاکرات پر آمادگی ظاہر کر دی تھی مگر

جامع مذاکرات کے نتیجے میں کوئی فوری پیشرفت سامنے نہ آئی اور مئی 1998 میں پہلے بھارت کی جانب سے اور پھر اس کے براہ راست اور سوچے سمجھے ردعمل کے طور پر پاکستان کی جانب سے کئے جانے والے ایٹمی دھماکوں نے آخر کار انہیں تعطل کا شکار کر دیا۔ جہاں پاکستانی دھماکوں سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ پاکستان کی ایٹمی صلاحیت خود اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ ہے وہاں امریکہ پریسلر ترمیم کے تحت وہ پابندیاں دوبارہ عائد کرنے پر مجبور ہو گیا جو بے نظیر نے دو برس قبل ہی ختم کروائی تھیں۔ بین الاقوامی حمایت حاصل کرنے کی کوششوں میں اس کے جانشین وزیراعظم نواز شریف نے، جس نے کہ ایٹمی دھماکوں کا حکم دیا تھا، آٹھ ماہ بعد 1999 کے شروع میں اپنے بھارتی ہم منصب اٹل بہاری واجپائی کو لاہور میں ایک سربراہی ملاقات کی دعوت دے ڈالی۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے یہ ایک ایسی دعوت تھی جس کا پرویز مشرف اور اس کے باقی جرنیل ساتھیوں نے بائیکاٹ کر دیا تھا، اور جس کے خلاف احتجاج کرتے ہوئے، اپنی احتجاجی طاقت کے لئے مشہور جماعت اسلامی کو لاہور کو پولیس والوں نے ناکوں چنے چبوا دیئے تھے۔ یہ سربراہی ملاقات بھاتی وزیراعظم کی جانب سے مینار پاکستان لاہور جا کر احترام کا مظاہرہ کرنے کے لئے بھی خاص طور پر یادگار ملاقات تھی۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں جناح اور ان کے مسلم لیگی ساتھیوں نے 1940 میں جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ایک الگ وطن کی تخلیق کے مطالبے کو پہلی مرتبہ رسمی انداز میں پیش کیا تھا۔ دونوں رہنماؤں نے جامع مذاکرات کے دوبارہ آغاز پر سرعام اتفاق کا اظہار کیا، مگر اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ انہوں نے روابط کے ذریعے مذاکرات کا سلسلہ جاری رکھنے پر بھی اتفاق کا اظہار کیا۔

باقی دنیا کی نگاہوں سے اوجھل خفیہ مذاکرات کا پہلا دور 1999 کے موسم بہار میں اس وقت ہی اختتام پذیر ہو گیا تھا جب ذرائع ابلاغ میں یہ خبریں منظر عام پر آنے لگیں کہ لائن آف کنٹرول کی اس سمت کارگل کی پہاڑیوں میں واقع ان دور افتادہ فوجی چوکیوں میں سے اکثر پر مجاہدین نے قبضہ کر لیا ہے جو بھارتی فوجی شدید سردیوں کے دوران چھوڑ کر چلے گئے تھے بلکہ خاکی وردی میں ملبوس پاکستانی فوج کے جوان بھی تھے جن کی بظاہر نیت یہ تھی کہ سیاچن گلیشئر کی طرف رسد لے جانے والے اس راستے کو بند کر دیں جہاں سے بھارتی فوج کو ساز و سامان فراہم کیا جاتا تھا۔ پاکستان کا یہ دعویٰ کہ اصل میں یہ مذہبی جذبات سے سرشار سویلین کی کارستانی تھی ان بے شمار کوششوں میں سے ایک کوشش تھی جن کا مقصد ان تمام کارروائیوں کی ذمہ داریوں سے بظاہر

بڑے معقول انداز میں خود کو دور رکھنا تھا جو وہ 1965 کی جنگ کے زمانے سے ہی کرتا چلا آ رہا تھا۔ دوسری جانب بھارتی حکومت جو کہ شروع سے اس ساری صورتحال کو شک وشبہے کی نظر سے دیکھ رہی تھی اپنی چوکیوں کو قابضین سے، خواہ ان کا تعلق کہیں سے بھی تھا، آزاد کرانے پر تلی ہوئی تھی، اور اس نے کارگل کی ان چوٹیوں پر انسان اور ساماں اتارنا شروع کر دیا جہاں دس ہزار فٹ سے زائد بلندی پر تصادم پھوٹ پڑا۔

امریکہ کو بھی یقین نہیں تھا کہ کارگل کا معرکہ مجاہدین نے سرانجام دیا تھا اور اس نے اس معرکے میں ملوث پاکستانی فوجیوں کو وہاں سے نکالنے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ کشمیر کے تنازعے میں کسی بھی فریق کے دعوے کی درستگی سے قطع نظر، امریکہ اس کے حل کے لئے فوجوں کے کھلم کھلا استعمال پر مبنی اخلاقی یا معاون کوشش کے حق میں نہیں تھا، خاص طور پر جبکہ دونوں فریق ایٹمی ہتھیاروں سے بھی مسلح تھے۔ بھارت نے چوٹیوں سے پاکستانیوں کو نکالنے کے لئے جیسے ہی کارگل کے اندر اپنی فوجیں اتارنی شروع کیں تو امریکی حکام نے اسلام آباد پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا اور حتیٰ کہ یو۔ایس سنٹرل کمانڈ کے سربراہ جنرل انتھونی زینی کو بھیجا کہ وہ نواز شریف اور آرمی چیف کے ساتھ ردوقدح کر کے دباؤ ڈالیں۔ امریکہ کے دباؤ سے حواس باختہ اور پاکستانی کاروائی کی بین الاقوامی سطح پر مذمت سے گھبرا کر نواز شریف نے اس مسئلے کا حل تلاش کرنے کی کوششیں تیز کر دیں۔ اس نے کلنٹن انتظامیہ کو قائل کیا کہ وہ اس حوالے سے مشاورت کے لئے جلد واشنگٹن آنے دے تاکہ اس طرح باعزت طریقے سے پسپائی کا جواز فراہم ہو جائے۔ بلیئر ہاؤس پر 4 جولائی کو کلنٹن انتظامیہ کے ساتھ ہونے والی تاریخی ملاقات میں اس نے کلنٹن سے اس یقین دہانی کے بدلے کہ وہ لاہور سربراہی ملاقات میں شروع ہونے والی امن کوششوں کا وہ سلسلہ دوبارہ بحال کروا دے گا جو اس لڑائی کے نتیجے میں بڑے بے ربط طریقے سے تعطل کا شکار ہو گیا تھا، نواز شریف نے کارگل میں اصل جنگ بندی لائن کی بحالی کا وعدہ کر لیا۔

مجھے اس وقت یہ دیکھ کر سخت حیرت ہوئی کہ پاکستانی کتنی آسانی سے امریکی دباؤ میں آ گئے تھے۔ آخر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ پاکستان کے ایٹمی پروگرام کی وجہ سے اس پر امریکہ نے پہلے بھی اتنی شدید پابندیاں عائد کر رکھی تھیں۔ ہم اس سے زیادہ کر بھی کیا سکتے تھے۔ اس کے باوجود نواز شریف کا ردعمل ایسا تھا جیسے وہ کوئی غلطی کرتے ہوئے پکڑا گیا ہو اور اسے خوف ہو کہ اب

اسے اس کی سزا ملے گی۔ مجھ پر یہ حقیقت بھی واشگاف ہونے لگی کہ پاکستانیوں کو رجعی طور پر، تقریباً یہ یقین سا رہتا تھا کہ امریکہ کا اثر ورسوخ اس سے کہیں زیادہ ہے جتنا کہ اصل میں تھا۔ اس رویے یا سوچ کے پس پشت کافی حد تک مقبول یہ نظریہ کارفرما تھا کہ امریکہ پردے کے پیچھے رہ کر واقعات کو اپنی مرضی کا رخ دے رہا ہے۔ یہ نظریہ نہ صرف ذرائع ابلاغ میں بلکہ ڈنر کی تقریبات میں بھی اکثر و بیشتر پیش کیا جاتا رہتا تھا۔ یہ دراصل پاکستانی عوام کے اس لگاؤ کی عکاسی کرتا تھا جو انہیں سازشی نظریات کے ساتھ ہے اور اس کی واضح مثال یہ تھی کہ وہ اس بات پر بھی یقین کرنے کے لئے تیار تھے کہ 1979 میں خانہ کعبہ پر قبضہ کی کوششوں کی سازش کے پس پردہ بھی امریکہ کا ہاتھ تھا۔ میں نے یہ نکتہ پہلے بھی عیاں کیا تھا کہ بہت سے پاکستانیوں کو یہ یقین بھی رہتا تھا کہ ہر درخت کی آڑ میں آئی ایس آئی کا کوئی نہ کوئی کارندہ یا جاسوس چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ بالکل اسی طرح بہت سے لوگوں کے ذہن میں یہ نظریہ بھی سرایت کر چکا ہے کہ آئی ایس آئی کے ہر جاسوس کے پیچھے بھی کوئی نہ کوئی امریکی بیٹھا ہوتا ہے جو اسے بتاتا رہتا ہے کہ کیا کیا کاروائی کرنی ہے میں پاکستان میں بہت سے واقعات کا مسلسل مشاہدہ کرتا رہا ہوں اور ان میں سے اکثر واقعات کو میں نے آگے جا کر ترتیب سے بیان بھی کیا ہے۔ جس چیز سے مجھے شدید حیرت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستانیوں کو امریکہ کے اثر ورسوخ کے حوالے سے جو ضرورت سے زیادہ خوش یا غلط فہمی رہتی ہے اس سے امریکہ کتنا فائدہ اٹھاتا رہتا ہے۔ امریکہ دباؤ حتیٰ کہ امریکی دھمکیوں کی عدم موجودگی میں اس وقت بھی کارآمد ثابت ہوتا ہے جب اس کے پیچھے مبہم قسم کے تصورات سے ذرا زیادہ حقیقت ہوتی ہے۔ یہ محض میرا نظریہ نہیں ہے۔ میرے بہت سے قریبی اور بارسوخ پاکستانی شناساؤں، سول و ملٹری دونوں، کا بھی، اگرچہ کافی حد تک تاسف آمیز سہی، یہی خیال ہے کہ یہ ایک حقیقت ہے۔

اگرچہ 4 جولائی کی واشنگٹن ملاقات کے بعد پاکستان نے کارگل سے اپنی فوجیں واپس بلا لی تھیں، مگر معاملہ یہیں ختم نہیں ہو گیا۔ اس واقعے کے نتیجے میں نواز شریف اور مشرف کے درمیان خلیج اور وسیع ہو گئی اور دونوں نے ذرائع ابلاغ کے توسط سے اس ناکام واقعہ کی ذمہ داری ایک دوسرے پر ڈالنی شروع کر دی۔ نواز شریف کا دعویٰ تھا کہ اسے ان واقعات سے پوری طرح باخبر نہیں رکھا گیا تھا؛ جبکہ مشرف نے اس سے اتفاق نہیں کیا۔ یہ امر تو اب واضح ہو چکا ہے کہ کارگل میں بھارتی چوکیوں پر قبضہ کرنے کا فیصلہ لاہور کی سربراہی ملاقات سے بہت پہلے ہو چکا تھا مگر یہ

واضح نہیں ہوسکا کہ اس کے مقاصد کیا تھے۔ ہوسکتا ہے کہ فوج کے نزدیک یہ بھارت کو مذاکرات کے اس سلسلے کی طرف مائل کرنے کا آسان اور کم وقت طریقہ ہو جس کے آثار پہلے ہی نظر آرہے تھے، یا پھر یہ ایک طرح سے مذاکرات کی میز پر بھارت سے زیادہ سے زیادہ رعایات حاصل کرنے کی ایک بے ڈھنگی چال ہوسکتی تھی۔ محرک کچھ بھی ہو، اور نواز شریف کو اس کا پیشگی علم تھا یا نہیں، تاہم یہ ایک حقیقت ہے کہ تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ وزیراعظم کے لئے، جو کہ دو برس کی ناقص حکومتی کارکردگی سے پہلے ہی مقبولیت کی جنگ جیتنا انتہائی محال امر نظر آرہا تھا۔ فضا میں ایک فوجی بغاوت کی افواہیں تیزی سے گردش کرنے لگی تھیں۔ ہر طرف سے خود کو محصور پانے اور اس امر کا قائل ہوجانے کے بعد کہ مشرف اس کے خلاف کسی وقت بھی کاروائی کرسکتا ہے، نواز شریف نے پہلے ہی کاروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ وائٹ ہاؤس میں کئے جانے والے عہد/مطالبات سے دستبرداری کے صرف تین ماہ بعد 12 اکتوبر کو اس نے مشرف کو اس کے عہدے سے اس وقت ہٹانے کی کوشش کر ڈالی جب وہ سری لنکا سے ایک کانفرنس میں شرکت کے بعد ایک طیارے میں واپس پاکستان آرہا تھا اور اس کا زمین سے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ تاہم فوج کے لئے یہ صورتحال کسی طور بھی قابل برداشت نہیں تھی۔ مشرف کے اہم ماتحت افسروں فوری طور پر حرکت میں آگئے۔ بعد ازاں نواز شریف کو دریائے سندھ کے کنارے واقع اٹک کے قلعے میں قید کردیا گیا اور پھر سعودی عرب جلاوطن کردیا گیا۔

کارگل معرکے کا خمیازہ صرف جامع مذاکرات کے جمود اور دوسری وزارت عظمیٰ سے محرومی کی صورت میں ہی نہیں بھگتنا پڑا۔ بلکہ مذاکرات کا ایک زیادہ حساس مرحلہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا تھا۔ کارگل واقعے کے کچھ ہی عرصے بعد اور اخبارات میں نواز۔ مشرف الزامات و جوابی الزامات کی خبروں کے پس منظر میں میری ایک ریٹائرڈ اعلیٰ سفارتی افسر نیاز نائیک سے ایک ظہرانے پر ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھے یہ انکشاف کرکے ورطہ حیرت میں ڈال دیا کہ بھارتی اور پاکستانی وزرائے اعظم نے لاہور میں خفیہ مذاکرات کے ایک زیر تہہ سلسلے کی بنیاد رکھ دی تھی۔ انہیں اس کا علم یوں تھا کہ وہ پاکستان کی نمائندگی کر رہے تھے۔ انہوں نے وضاحت کرتے ہوئے بتایا کہ انہیں اور ان کے بھارتی ہم منصب آر۔ کے مشرا کو سال کے اختتام سے پہلے ہی کشمیر پر ایک معاہدے کا مسودہ تیار کرنے کی ذمہ داری سونپ دی گئی تھی۔ نیو دھلی میں ان کے اولین اور اکلوتے

مذاکراتی دور کے دوران اور کارگل واقعے کے نتیجے میں مذاکرات کے اس عمل کے سبوتاژ ہونے سے ذرا قبل، انہوں نے کشمیر کی حدود کے از سرِ نو ممکنہ تعین کے خاکے پر تبادلہ خیال کر لیا تھا۔ نائیک نے بتایا کہ انہوں نے یہ تجویز پیش کی تھی کہ بھارتی مقبوضہ کشمیر کو دریائے چناب کے کنارے کے ساتھ ساتھ تقسیم کیا جائے۔ اس کے نتیجے میں دریا کے شمال پر واقع بھاری مسلم اکثریت کی حامل وادی پاکستان کے حصے میں آجاتی اور جنوب کی طرف کا ہندو اکثریت پر مشتمل جموں کا علاقہ بھارت کے قبضے میں ہی رہتا۔ اگرچہ مشرا نے ابھی تک اس حوالے سے کسی اتفاق کا اظہار نہیں کیا تھا۔ مجھے شک ہے کہ وہ یا تو چکرا کر رہ گیا ہوگا یا پھر تہذیب و شائستگی کا مظاہرہ کر رہا ہوگا۔ مگر نائیک کو یقین تھا کہ بھارت اس تجویز سے اتفاق کر لیتا۔ مجھے یہ ہر لحاظ سے ناقابلِ عمل لگ رہا تھا کیونکہ اس کے لئے بھارت کو اپنے زیرِ انتظام بہت سا علاقہ بشمول اہم ترین عطیۂ قدرت بنام وادیٔ کشمیر پاکستان کے حوالے کرنا پڑ جاتا۔ یہ سمجھنا بہت ہی مشکل نظر آتا ہے کہ اس کو بھارت کی طرف سے پاکستان کے انتہائی بنیادی مطالبات کے آگے مکمل طور پر ہتھیار ڈال دینے سے کم کس طرح دیکھا جا سکتا ہے۔ تاہم اس کے باوجود نائیک کے نزدیک یہ ممکن تھا۔ مستقبل کے امکانات پر نظر رکھنے کی اسی اہلیت کا فقدان اور ممکنات کے فن کی یہی قدر ناشناسی ہے جس کی بناء پر مغربی حلقوں کو پاکستان کی طرف سے مسئلہ کشمیر کو سر پر سوار کر لینے کی عادت سخت ناگوار گزرتی ہے۔ اگرچہ میں نے کبھی رائے شماری تو نہیں کرائی مگر مجھے پورا یقین ہے جس کی بنیاد گزشتہ کئی برسوں کے دوران مختلف ماہرین سے ہونے والی میری گفتگو ہے، کہ جنوبی ایشیاء میں کام کرنے والے اور تنازعہ کشمیر کے پس منظر سے واقف بہت سے امریکی سفارت کاروں کی ہمدردی اس موقف سے ہے کہ کشمیر پر بھاری مسلم اکثریت کی وادی ہونے کی بناء پر پاکستان کا حق بنتا ہے۔ اس صورتحال میں شیخ عبداللہ کا موقف بھی ایک اہم عنصر کی حیثیت رکھتا ہے، جو نہ صرف اپنے وقت کا انتہائی مقبول کشمیری سیاستدان تھا۔ بلکہ نہرو کا دوست اور حکمران کانگرس پارٹی کے ہمدردوں میں سے بھی تھا۔ تقسیم کے بعد اقوامِ متحدہ کی طرف سے استصوابِ رائے کی منظور کردہ قرارداد پر اگر عمل کر دیا جاتا تو یہ مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حل ہو چکا ہوتا۔ مگر بھارت نے وادی کے مستقبل کے حوالے سے اس طرح کا کوئی خطرہ مول لینا مناسب نہ سمجھا اور یوں معاملہ التواء کا شکار ہوتا رہا۔ تاہم جب شیخ عبداللہ نے چند برسوں بعد ان سے اس مسئلے پر اختلاف کا اظہار کرنا شروع کر دیا تو اس موضوع کو ہمیشہ کے

لئے ہی سرد خانے کی نذر کر دیا گیا۔

تاہم یہ سب کچھ غیر متعلقہ ہے۔ سب سے اہم حقیقت کہ بھارت نے اس وقت استصواب رائے کی تجویز کو سراہنے سے انکار کر دیا تھا، وادی کو اپنے ہاتھوں سے نکالنے میں اس کی ہچکچاہٹ کی تصدیق کرتی ہے۔ وہ شروع سے ہی اسے بڑی شدت کے ساتھ اپنے سینے سے چمٹائے ہوئے ہے، اور اسے اپنے قبضے میں رکھنے کے لئے ہر طرح کے ظالمانہ ہتھکنڈے آزمانے، حتیٰ کہ اپنی فوج کا ایک اہم تناسب بھی وہاں متعین کرنے کی حد تک تیار ہے۔ اس کی اس ہٹ دھرمی کے پس منظر میں کارفرما وجوہات کو سمجھنا بھی مشکل نہیں ہے۔ بھارت نہ تو کوئی وسیع وعریض اور مربوط اکائیوں کی حامل ریاست ہے اور نہ کبھی رہی ہے۔ یہ مختلف نسلی، ثقافتی، لسانی اور مذہبی گروہوں کا ڈھیلا ڈھالا اور بے جوڑ مرقع ہے۔ کشمیر میں انتفاضہ ایک ایسے وقت میں منظر عام پر آئی جب بھارت کو پنجاب کو بھارت میں پہلے ہی سے سکھ بغاوت کا سامنا تھا۔ بھارت کو یہ خوف تھا کہ اگر کشمیر کے حوالے سے پاکستان کے بنیادی مطالبات کے آگے سر جھکا دیا گیا یا پھر کشمیریوں کی طرف سے ایک آزاد و خودمختار کشمیر کا مطالبہ تسلیم کر لیا گیا تو بھارت کے دوسرے حصوں میں بھی بغاوتیں پھوٹ پڑیں گی۔ چنانچہ وہ کسی قیمت پر بھی ایسا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔

اس صورتحال کا ادراک کرتے ہوئے مغربی سفارت کار پاکستان کے ساتھ بے خبری کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ کشمیر کے حوالے سے ان کی پالیسی بے مقصد دکھائی دیتی ہے کیونکہ اس کی کامیابی کا دور دور تک کوئی امکان نہیں ہے۔ اس بات پر کوئی کیسے یقین کر سکتا ہے کہ بھارت کو دراصل وادی کشمیر سے دستبردار ہونے پر آمادہ کیا جا سکتا ہے؟ اس کے باوجود بہت سے پاکستانیوں کا یہی خیال تھا اور ہے۔ حتیٰ کہ نیاز نائیک کا بھی جو بصورت دیگر انتہائی معتدل مزاج قسم کی شخصیت رکھتے تھے، غالباً یہی یقین تھا۔ اور ایک ادارے کے طور پر فوج کا بھی یہی عقیدہ ہے، اگرچہ میری ایک سے زائد ایسے ریٹائرڈ فوجی افسروں سے ملاقات ہوئی جن کا اعتراف ہے کہ یہ ایک بے کار تنازعہ ہے۔ بہت سے جاگیردار سیاستدانوں کو خاص طور پر جن کا تعلق صوبہ پنجاب سے ہے، یعنی وہ صوبہ جو کشمیر کے ساتھ متصل ہے اور بھارت کی طرف سے رابطہ منقطع کرنے سے قبل علاقے کے اس کے ساتھ قریبی مراسم تھے، اس موضوع سے گہری دلچسپی نظر آتی ہے۔ تاہم میں جس وقت پاکستان پہنچا، اس وقت تک کشمیر کے مقصد کے لئے حمایت ملک کے

اندر سیاسی نظریئے کی درستگی کے حوالے سے ایک ایسے اہم عنصر کی حمایت اختیار کر گئی تھی کہ یہ کہنا انتہائی مشکل نظر آتا تھا کہ لوگوں کا اصل عقیدہ یا نظریہ کیا ہے۔ دو تنظیمیں جو کہ کشمیر پر سخت موقف کے حوالے سے بہت زیادہ جوش خطابت کا مظاہرہ کر رہی تھیں ایک دوسرے سے بالکل ہی مختلف نظریات رکھتی تھیں۔ ایک ان سیکولر قوم پرستوں پر مشتمل تھی جو ذرائع ابلاغ میں پیش پیش اور فوج سے قریبی روابط رکھنے کے باعث کشمیری بڑھک بازوں کے نام سے مشہور تھے۔ جبکہ دوسری تنظیم جو کہ بلا کسی حیرت کے مذہبی ترغیب رکھنے والوں پر مشتمل تھی۔ مجھے وہ گفتگو بھی بھی اچھی طرح یاد ہے جس میں جماعت اسلامی کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے اس امر پر اصرار کیا تھا کہ مجاہدین بالکل اسی طرح ہندوؤں کو کشمیر سے باہر نکال پھینکیں گے جس طرح انہوں نے روسیوں کو افغانستان سے نکال باہر پھینکا تھا۔

یہ دراصل پاکستان کی طرف سے کشمیر میں جہادی تنظیموں کو استعمال کرنے کی حکمت عملی ہی تھی جس کے نتیجے میں وہ واشنگٹن سے کسی بھی طرح کی ہمدردی کی امید سے محروم ہو گیا تھا۔ امریکہ نے، یہ سچ ہے، سوویت مخالف جہاد کے دوران افغانستان میں جہادیوں کے استعمال کی حمایت کی تھی مگر یہ اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ وہ مغرب کی مخالفت پر نہیں تل گئے تھے۔ میں پاکستان اس روز پہنچا تھا جس سے اگلے دن القاعدہ نے نیرونی اور دارالسّلام میں امریکی سفارت خانوں میں بم دھماکے کر دیئے تھے۔ جیسا کہ میں آگے جا کر بہت تفصیل سے کھوج لگاؤں گا، اس وقت تک القاعدہ افغانستان میں ان طالبان کے تحفظ کی چھتری تلے سر عام کاروائیاں کرتی پھر رہی تھی جو روسیوں کی واپسی کے بعد شروع ہونے والی افغان خانہ جنگی میں پاکستانی گماشتوں کا کردار ادا کر رہے تھے۔ مشرقی افریقہ میں ہونے والے بم دھماکوں کے ردعمل میں امریکہ نے پاکستانی سرحد سے قریب واقع صوبہ خوست میں القاعدہ کے تربیتی مراکز پر کروز میزائلوں سے حملہ کر دیا۔ تاہم مارے جانے والوں میں اکثریت ایچ یو ایم کے جہادیوں کی نکل آئی جو کہ اس وقت ایک وسیع و عریض عمارت کے اندر جنگی سہولتوں کو استعمال کرنے والی بہت سی تنظیموں میں سے ایک تھی۔ یہ امر واضح تھا کہ القاعدہ اور ایچ یو ایم کے درمیان قدر مشترک صرف تربیتی کیمپ ہی نہیں تھا۔ ان کا بنیادی جہادی فلسفہ اور مغرب سے ان کے لئے ان کے دل میں تنفر کا جذبہ بھی ایک ہی تھا، اگرچہ اس وقت ایچ یو ایم کی ساری توجہ صرف اور صرف کشمیر پر مرکوز تھی۔ جیسا کہ ہم نے پہلے

دیکھا یہ وہ تنظیم تھی جسے 1995 میں کشمیر کے پہاڑوں کی سیاحت پر آئے ہوئے مغربی سیاحوں کے اغواء اور بعدازاں قتل کے واقعہ کے بعد امریکہ نے دہشت گرد تنظیم قرار دے ڈالا تھا۔ ایک ایسی حکومت کے ساتھ ہمدردی کرنا مشکل نظر آتا ہے جو بے کار مقاصد کی تکمیل کے لئے امریکہ کی انتہائی مسموم مخالفت کرنے والی تنظیموں کی خدمات حاصل کرنے پر تیار رہتی ہو۔

سفارت کاروں کے طبقے اور عمومی طور پر واشنگٹن کی بدگمانیاں اس وقت اور بھی شدت اختیار کر گئیں جب مشرف کے برسراقتدار آنے کے صرف ایک ماہ بعد ایک اور اہم واقعہ پیش آ گیا۔ امریکی سفیر بل مائلم (Bill Milam) اور میں اسلام آباد کی ایک اونچی پہاڑی پر واقع مشرف کی سرکاری رہائش گاہ پر اس سے ملاقات کے لئے جا رہے تھے۔ ہم جیسے ہی کار سے باہر نکلے تو ہمیں ایک ایسی گونج دار آواز سنائی دی جو پہاڑی سے نیچے واقع شہر کے اندر ہوتے والے کسی زوردار دھماکے کی طرح لگ رہی تھی۔ مگر ہم مزید کچھ غور کئے بغیر مشرف کی رہائش گاہ میں داخل ہو گئے۔ ایک گھنٹہ گزرنے کے بعد جب ہم واپس آئے اور اپنی کار کی طرف بڑھے تو ہم نے دیکھا کہ ہمارا ڈرائیور سخت اشتعال کے عالم میں ہماری لیموزین کی پچھلی نشست پر پڑے ہوئے فون کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ دوسری طرف مشن یا سفارت خانے کی ڈپٹی چیف تھی جو کہ بڑی اجتماعی آواز میں ہمیں وضاحت کر کے بتا رہی تھی کہ سفارت خانے پر ابھی ابھی ایک راکٹ حملہ ہوا ہے، جو کہ بظاہر ناکام ہو گیا ہے۔ اس نے ہماری حوصلہ افزائی کہ ہم سیکورٹی اہل کاروں کی طرف سے کوئی مثبت اشارہ ملنے تک انتظار کر سکتے ہیں مگر ہم کسی نہ کسی طرح بھاگ کر واپس سفارت خانے تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور تیزی سے دوسری منزل پر واقع اپنے دفاتر میں گھس گئے۔ عمارت کی ایک طرف قطاروں میں لگی ہوئی بڑی کھڑکیوں سے نگاہ ڈالتے ہوئے ہم کچھ دور ایک چوتھائی میل کے فاصلے پر خالی کھیت کے اس طرف ایک بڑے ایس یو وی کا جلتا ہوا بھاری بھرکم ملبہ دیکھ رہے تھے۔ واردات کرنے والوں نے بظاہر پچھلی نشست ہٹا کر دور سے ہی وہ راکٹ چلا دیا تھا جو اس کی جگہ نصب کر دیا تھا۔ سفارت خانہ نشانے کی زد میں آنے سے اس لئے محفوظ رہ گیا تھا کیونکہ انھوں نے اس کی پیچھے کی طرف پلٹنے کی طاقت کا غلط اندازہ لگایا تھا اور یوں طیارہ جھٹکے سے ایک طرف کو جھک گیا تھا اور راکٹ کا نشانہ ایک میل پہلے ہی خطا ہو کر رہ گیا۔ اس وقت ہمیں جو کچھ معلوم تھا وہ یہ تھا کہ یہ خوست میں ہونے والی اموات پر ایچ یو ایم کی طرف

سے جوابی کاروائی تھی۔

اگر پاکستانی اس طرح کے واقعات کے امریکی حسیات پر رونما ہونے والے اثرات سے آگاہ تھے بھی سہی تو انہوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ اس حوالے سے مجھے واحد رعایت مشرف اور جنوبی ایشیا کے لے امریکہ کے اسسٹنٹ سیکریٹری کارل انڈرفرتھ کے درمیان اس واقعہ کے کچھ ہی عرصہ بعد ہونے والی ملاقات میں محسوس ہوئی۔ کشمیری باغیوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے اس نے ان کے لئے جہادیوں کی اصطلاح استعمال کرنے کی بجائے سیکولر نظریات کا تاثر دینے والے ''مجاہدین آزادی'' کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے ملاقاتیوں کو اس سے کوئی خوشی نہیں ہوئی۔ امریکہ کی جھنجھلاہٹ و مایوسی سات ماہ بعد مارچ 2000 میں اس وقت اپنی علامتی حدوں کو چھونے لگی جب ان خوفناک قسم کے حفاظتی اقدامات کے ساتھ جن کا ذکر اس کتاب کے صفحہ اول میں کیا گیا ہے، بل کلنٹن پاکستان کے دورے پر پہنچا۔ اس کے دورے کا مرکزی خیال، جو کہ پاکستان آنے کی اہم وجہ بھی تھی، پاکستانی عوام سے ٹیلی ویژن پر براہ راست خطاب کے ذریعے یہ پرزور التجا کرنا تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلے کو اتنی زیادہ اہمیت دینا چھوڑ دیں جو کہ دیوانے کا ایسا خواب ہے جس کے پورا ہونے کی کوئی امید نہیں اور جس کی وجہ سے پاکستان مذہبی جنونیوں کے شکنجے میں پھنس کر رہ گیا ہے۔ وہ انہیں یہ بتا رہا تھا کہ اب اس حوالے سے پالیسی تبدیل کرنے کی ضرورت ہے۔

مگر انہوں نے اس نصیحت پر کان نہیں دھرے تھے۔ حتیٰ کہ جب صدر کا خطاب جاری تھا اس وقت بھی آئی ایس آئی کشمیر کے اندر کاروائی کے لئے ایک نئی جہادی تنظیم تیار کر رہی تھی۔ محض چند ماہ قبل کرسمس کے موقع پر ایچ یو ایم کے کارکنوں نے انڈین ایئرلائن کا ایک طیارہ اس وقت اغواء کر لیا تھا جب اسے نیپال میں کھٹمنڈو کے ہوائی اڈے سے اڑے ہوئے کچھ ہی دیر ہوئی تھی۔ ہائی جیکروں کا مطالبہ تھا کہ طیارے کا رخ لاہور کی جانب موڑ دیا جائے مگر پاکستانی حکام نے جہاز کو اپنی فضائی حدود میں داخل ہونے کی اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ جہاز جو پہلے ہی ایندھن کی قلت کا شکار تھا آخرکار سرحد کے اس پار امرتسر کے ہوائی اڈے پہنچ گیا۔ جب یہ ظاہر ہوا کہ بھارتی حکام طیارے کو دوبارہ پرواز سے روکنے کے لئے رن وے کو بند کر رہے ہیں تو ہائی جیکرز نے پائلٹ کو دوبارہ جہاز اڑانے پر مجبور کر دیا۔ اب طیارے کا رخ ایک مرتبہ پھر لاہور کی طرف ہو

گیا جہاں ہوائی اڈے کے عملے نے طیارے کو اترنے کی اجازت دینے سے پھر انکار کر دیا۔ تاہم جب پائلٹ نے جھنجھلاہٹ میں طیارے کو ایک قریبی سڑک پر اتارنے کے لئے زوردار انداز میں زمین پر تقریباً ٹکرا ہی دینا تھا تو اسے اجازت مل گئی۔ طیارہ زمین پر اتر آیا، ایندھن دوبارہ بھرا گیا اور پھر فضاء میں بلند ہو گیا۔ اب اس کی پہلی منزل دبئی تھی جہاں عورتوں اور بچوں کی کثیر تعداد کو اتار دیا گیا اور اس کے بعد وہ اپنی حتمی ثابت ہونے والی منزل یعنی جنوبی افغانستان میں طالبان کے دارالحکومت قندھار کی طرف روانہ ہو گیا۔

قندھار ایک اچھا انتخاب تھا کیونکہ وہاں ایچ یو ایم کی موجودگی واضح تھی جیسا کہ گزشتہ برس خوست پر امریکی کروز میزائل کے حملے کے نتیجے میں ہونے والی اموات کی فہرست سے ظاہر ہوتا تھا۔ اس کے بعد ہونے والے مذاکرات میں ہائی جیکرز اس شرط پر طیارے اور اس کے مسافروں کو چھوڑنے پر آمادہ ہو گئے کہ اس کے بدلے انڈیا کی قید میں پڑے ہوئے بے شمار جہادیوں کو رہا کر دیا جائے گا۔ ان میں سے ایک عمر شیخ تھا جو کہ برطانیہ میں جنم لینے والا وہ جہادی تھا جس نے بعد ازاں ڈینیئل پرل کے اغواء اور پھر قتل میں مرکزی کردار ادا کرنا تھا۔ مگر بڑی مچھلی مولانا مسعود اظہر تھا جو کہ ایچ یو ایم کا سرائیکی پٹی میں آنے والے علاقے بہاولپور سے تعلق رکھنے والا رہنما تھا اور جسے 1994 میں کشمیر سے گرفتار کیا گیا تھا۔ کچھ حد تک علمی شخصیت ہونے کا تاثر دینے والے اس جہادی نے ایچ یو ایم کے اصل بانی کے نقش قدم پر چلتے ہوئے مدرسہ جامعہ علوم الاسلامیہ، کراچی میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انڈیا کی طرف سے اسے رہا کر کے قندھار کے حوالے کر دیا گیا تو وہ اچانک کہیں غائب ہو گیا اور پھر کئی ماہ بعد پاکستان میں اس وقت منظر عام پر آیا جب اس نے اپنی نئی جہادی تنظیم ''جیشِ محمد'' یا محمدؐ کی فوج کی تشکیل کا اعلان کیا۔ یہ امر ابھی تک واضح نہیں ہو سکتا کہ آیا اس کے ایچ یو ایم کی اس وقت کی قیادت سے اختلافات ہو گئے تھے یا پھر وہ محض اپنا الگ راستہ منتخب کرنا چاہتا تھا۔ تاہم اسے جنوبی پنجاب میں ایچ یو ایم کے عملی طور پر تقریباً سارے کے سارے ارکان کو اپنے ساتھ ملانے میں کامیابی حاصل ہو گئی۔ یوں ایچ یو ایم کے پاس صرف پشتون ارکان ہی باقی رہ گئے اور وہ جلد ہی نسبتاً ایک غیر معروف تنظیم بن کر رہ گئی۔

اس طرح کی تبدیلیوں کا قریب سے مشاہدہ کرنے والے بہت سے تجزیہ کار حضرات کے مطابق آئی ایس آئی نے اگرچہ ہو سکتا ہے کہ طیارے کے اغواء کے واقعہ میں کوئی کردار ادا نہ کیا

ہو مگر جیشِ محمد کی تخلیق میں ضرور اس کا ہاتھ ہوگا کیونکہ جنوبی پنجاب میں اس کے اثر و رسوخ کے باعث انہیں یقین ہوگا کہ وہ اس کو زیادہ آسانی سے اپنی نگرانی اور کنٹرول میں رکھ سکتے تھے۔ علاوہ ازیں وہ ایک ایسی تنظیم بنانا چاہتے ہوں گے جس کی توجہ و سرگرمیوں کا اہم محور صرف کشمیر ہی ہو بہ نسبت ایچ یو ایم کے جو افغانستان میں بھی مصروف عمل تھی۔ جیسا کہ اس طرح کے معاملات میں اکثر ہوتا ہے، ان کا نہ تو کوئی دستاویزی ثبوت ہے اور نہ ہی متعلقہ اہم فریقوں کا تبصرہ یا رائے لینا موزوں نظر آتا ہے۔ مگر جو بات واضح نظر آتی ہے وہ یہ کہ مولانا اظہر جیش کو ایک منفرد قسم کی تنظیم بنانا چاہتا تھا۔ اس کی تخلیق کے چند ماہ کے اندر اندر یہ خبریں منظر عام پر آنے لگی تھیں کہ اس کی صفوں سے مجاہدین کے چند دستے کشمیر کے اندر سرایت کر گئے تھے۔ تاہم دوسری طرف یہ خبریں بھی سر ابھارنے لگیں کہ یہ پنجاب میں شیعوں کے خلاف فرقہ ورانہ کاروائیوں میں بھی ملوث تھی اور اس طرح سے یہ اندرون ملک فرقہ ورانہ فساد اور بیرون ملک جہادی سرگرمیوں میں فرق مٹا کر رکھ دینے والی اپنی نوعیت کی منفرد تنظیم بن کر رہ گئی۔ بعض تجزیہ کاروں کے خیال میں جیش کا اپنے سے بھی زیادہ کھلی فرقہ ورانہ تنظیم سپاہ صحابہؓ اور اس کی اور بھی زیادہ تشدد پسند شاخ لشکر جھنگوی کے ساتھ اشتراک نظریہ و عمل پر اتفاق پایا جاتا تھا۔ بہرصورت، یہ امر واضح تھا کہ یہ بھی اس طرح دیوبندیوں سے بھرتی کر رہی تھی جیسا کہ دوسری تنظیمیں اور اسی لئے یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ وہ سب ایک دوسرے کے ساتھ تعاون بھی کر رہی تھیں جیسا کہ بعد کے برسوں میں زیادہ سے زیادہ واضح ہونے لگا تھا۔

کشمیر کے محاذ پر جیشِ محمد کے تعارف کے بعد سے وہاں بغاوت کا انداز بھی تبدیل ہو کر رہ گیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے وہاں بھارتی فوجوں کی وسیع تعداد میں موجودگی کے باعث حزب المجاہدین کے لئے کاروائیاں کرنا بہت مشکل ہو چلا تھا۔ 1996 تک کشمیر کے لوگ جنگ کی طوالت سے اکتانے کی علامات ظاہر کرنے لگے تھے اور انتفاضہ کے آغاز کے بعد ایسا پہلی مرتبہ ہوا تھا کہ بھارتی حکومت وادی میں انتخابات کے حوالے سے پر اعتماد نظر آنے لگی تھی۔ اگرچہ حزب مخالف نے انتخابات کا بائیکاٹ کر دیا تھا، تاہم بغاوت کے غبارے سے ہوا نکلنے لگی تھی۔ حزبُ المجاہدین سے تعداد میں ہمیشہ کم ہونے کے باعث لشکر طیبہ نے آخر کار ایسے حربے آزمانے کا فیصلہ کر لیا تھا جو اس کے عزائم حالات سے مطابقت رکھتے تھے۔ اس نے اپنی توجہ بڑے بڑے حملوں

سے ہٹا کر، جنہیں جاری رکھنا نہ صرف مشکل ہوتا جا رہا تھا بلکہ ان کے نتیجے میں اس کی صفوں میں شامل جہادی بھی تھکنے لگے تھے، بہت چھوٹے پیمانے کی بم دھماکوں جیسی کارروائیوں کی طرف مبذول کر دی جن میں اکثر اوقات صرف 2 افراد پر مشتمل ٹیم کو ایک محفوظ تر مگر عملی نکتہ نظر سے انتہائی کارآمد بھارتی ٹھکانوں پر حملہ کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا۔ اس طرح پہلا حملہ، مبینہ طور پر، جولائی 1999 میں اس وقت سامنے آیا جب لشکر کے دو جہادیوں نے بھارتی پیراملٹری فورسز سے بھرے ہوئے کیمپ کی طرف گرنیڈ اچھالے اور بندوقوں سے فائرنگ کرتے ہوئے خود کو دھماکے سے اڑا دیا۔ اس سے اگلے تین برسوں کے دوران اس طرح کے 55 حملے کئے گئے جن کا اہم ہدف پولیس، پیراملٹری فورسز اور فوج کے ٹھکانے تھے۔ ان میں جیشِ محمد کی طرف سے کیے گئے حملے بھی شامل تھے جن میں اس طرح کے حربے استعمال کئے گئے جو 2000 میں کشمیر کے اندر سرایت کر جانے والوں کے حملے قرار دے دیا اور یہ نہ صرف حربوں میں تبدیلی کے غماز تھے بلکہ ان کی نوعیت بھی بہت مختلف تھی کیونکہ ان میں یقینی موت کا امکان بھی شامل ہوتا تھا۔

اس امر کا غالب امکان ہے کہ آئی ایس آئی کو ان حربوں یا حکمت عملیوں میں تبدیلی کا نہ صرف علم تھا بلکہ یہ اس کی منظوری سے تبدیل کی گئی تھیں۔ چونکہ اس طرح کے حملے بہت کثرت سے اور بہت طویل عرصے سے کئے جا رہے تھے اس لئے آئی ایس آئی کے کردار سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ اگرچہ کوئی بھی ریٹائرڈ یا حاضر سروس اعلیٰ فوجی افسر اس امر کا اعتراف نہیں کرے گا مگر میرے شناسا ایک سے زائد فوجی افسروں نے بادلِ نخواستہ اعتراف کرتے ہوئے جہادیوں کی جرأت وہمت کی تعریف کے ساتھ ہی انہیں جنونی بھی قرار دے دیا تھا۔ جیسے جیسے فدائین حملوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور ان کے اہداف کی لپیٹ میں بھارت کے مرکزی شہروں کے اندر کی جانے والی کارروائیوں سمیت زیادہ سنسنی خیز اور آگ لگانے جیسے واقعات بھی آتے جا رہے تھے، ویسے ویسے اس امر کا تعین مشکل ہوتا جا رہا تھا کہ ان میں پاکستانی فوج اور آئی ایس آئی کس حد تک ملوث تھے۔ فدائین کی ایک ٹیم نے دسمبر 2000 میں نیو دہلی کے لال قلعہ اور سری نگر کے ہوائی اڈے پر دھاوا بول دیا۔ سری نگر کی قانون ساز اسمبلی کو آنے والے اکتوبر میں نشانہ بنایا گیا۔ اس کے دو ماہ بعد 13 دسمبر کو پانچ جہادیوں نے نیو دھلی میں پارلیمنٹ کی عمارت پر حملہ کر دیا۔ اگرچہ وہ بھارت کے زیادہ سے زیادہ اعلیٰ عہدیداروں کو قتل کرنے کے اپنے اہم مقصد میں ناکام ہو گئے تھے

مگر اس نوعیت کے خطرناک حملے کی جرأت سے ہی، جس کے نتیجے میں کشمیر کے تنازعے کو بھارت کے سیاسی اقتدار کے مرکز تک لانے میں کامیابی حاصل ہوگئی تھی، بھارتی عوام اشتعال کا شکار ہو گئے تھے۔ نیو دھلی نے بین الاقوامی سرحدوں پر فوجیں تعینات کر دیں، ایک ایسا قدم جس کے جواب میں پاکستان نے بھی یہی کچھ کیا اور یوں دونوں ممالک بظاہر ایک خطرناک جنگ کے دہانے پر پہنچ گئے۔

امریکہ کی بحرانی حالات سے نمٹنے کی صلاحیتوں کی حامل سفارت کاری اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کی طرف سے جنوری 2001 میں لشکر طیبہ اور جیش محمد پر پابندی لگانے کے اعلان کے باعث صورتحال کو معمول پر لانے میں مدد ملی، تاہم مئی کے مہینے میں فدائین کی طرف سے جموں کے علاقے میں ان بھارتی فوجیوں کے گھرانوں کی رہائش کے لئے بنے ہوئے احاطے کے اندر ایک اور حملہ کر دیا گیا جو کشمیر میں خدمات انجام دے رہے تھے۔ اس حملے میں 33 افراد ہلاک ہو گئے تھے جن میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی تھی۔ اس حملے کے اور بھی منفی نتائج برآمد ہوئے اور اس مرتبہ دونوں طرف سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال کی دھمکیاں بھی دی جانے لگیں۔ ایک خطرناک جنگ کے امکانات سر پر منڈلاتے دیکھ کر امریکہ نے بھارت میں اپنے سفارت خانے اور قونصلیٹ میں متعین غیر ضروری عملے اور امریکی ملازمین کے اہل خانہ کو وہاں سے بحفاظت امریکہ بھجوانا شروع کر دیا، جو کہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس نے بھارتی فیصلہ سازوں کو اپنا قبلہ تبدیل کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور پھر آخر کار پرویز مشرف کی طرف سے کشمیر میں جہادیوں کا راستہ ہمیشہ کے لئے بند کر دینے کے وعدے کے اعلان نے دونوں فریقوں کو آخری حد سے پیچھے ہٹنے کا ایک مناسب بہانہ فراہم کر دیا۔ حافظ سعید اور مسعود اظہر کو کئی ماہ کے لئے جیل میں بند کر دیا گیا، مگر ان کی تنظیموں کو غیر موثر بنا کر رکھ دینے والے ایسے کوئی اقدامات دیکھنے میں نہیں آئے جنہیں صحیح معنوں میں ٹھوس اقدامات کہا جاسکتا۔ دونوں تنظیمیں کچھ عرصہ کے لئے غیر متحرک ہوگئیں، اپنے نام تبدیل کر لئے اور پھر جلد ہی اپنے معمول پر آگئیں۔ پاکستان کو ان کے خلاف کسی قسم کی سنجیدہ کاروائی کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ پاکستان میں بسا اوقات نام تبدیل کر لئے جاتے ہیں، مگر ان کا مقصد معصوم افراد کا تحفظ نہیں بلکہ جہادیوں کے ساتھ مل کر کاروائیاں کرنے والوں کو بچانا ہوتا ہے۔

اس حوالے سے مختلف آراء کا اظہار کیا جاتا ہے کہ ایسے مواقعوں پر بھارت اور پاکستان جنگ کے کس قدر قریب پہنچ چکے تھے۔ میرا اپنا اندازہ یہ ہے کہ وہ کبھی بھی جنگ کے زیادہ قریب نہیں آئے۔ پاکستان کے ساتھ جنگ کے حوالے سے بھارت ہمیشہ جس عظیم مخمصے کا شکار رہا ہے، خواہ اشتعال کی نوعیت کیسی ہی کیوں نہ ہو، وہ یہ ہے کہ اگر وہ میدان جنگ میں کامیابی حاصل کر بھی لے تو پھر بھی اس کے سر پر ایک عدد ایٹمی حملے کا شدید خطرہ منڈلاتا رہے گا۔ اگر لاہور کا ہر طرف سے محاصرہ کر لیا جاتا یا پھر یہ بھارت کے قبضے میں چلا جاتا یا اگر بھارتی فوج پیش قدمی کرتے ہوئے آگے جنوب تک پہنچ جاتی جس سے پاکستان کے دو ٹکڑے ہو جانے کا امکان پیدا ہو جاتا تو ایسی صورتحال میں پاکستان کا کیا ردعمل ہوتا۔ اس حوالے سے اس ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل نے جس کے جذباتی ردعمل کا ذکر میں نے دوسرے باب میں کیا ہے، پاکستان کی طرف سے ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے پر مجبور ہو جانے کے امکانات کے حوالے سے چند ایک شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا۔ تاہم بھارتی اس حقیقت سے بلاشک وشبہ اچھی طرح آگاہ ہیں کہ پاکستانی فوج کے افسروں کے اندر اس طرح کی سوچ موجود ہے اور یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی وجوہات گمراہ کن نظریات یا غلط فہمی پر مبنی ہیں۔ بھارت فدائین حملوں سے جس جھنجھلاہٹ کا شکار نظر آتا ہے اس کی ایک اہم وجہ یہ ہے کہ اسے پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کی اہلیت کا اچھی طرح احساس ہے جو کہ بھارت کے بڑے شہروں کو اگرچہ پوری طرح تو نہیں مگر اچھا خاصا تباہ کر کے رکھ دینے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔

اس نکتے کو سامنے رکھا جائے تو یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا آئی ایس آئی نے نیو دھلی اور جموں میں ہونے والے حملوں کی منظوری دی تھی یا کیا وہ ان سے پیشگی آگاہ تھی۔ اس حوالے سے کسی ناقابل تردید شہادت کی عدم موجودگی کے باعث صرف قیاس آرائی ہی کی جا سکتی ہے۔ اگرچہ یہ سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے کہ کشمیر کے اندر بھارتی پولیس اور فوج کے ٹھکانوں پر فدائین حملے وادی میں بھارتی سیکیورٹی فورسز پر دباؤ بڑھا کر پاکستان کے سیاسی مقاصد کی تکمیل میں کس طرح معاون ثابت ہو سکتے ہوں گے۔ تاہم یہ امر سمجھ سے بالاتر ہے کہ بھارتی حکومت کے مرکزی ٹھکانے پر حملہ کر کے یا بے گناہ اور نہتے بچوں اور خواتین کو ہلاک کر کے پاکستان اپنے مفادات کس طرح حاصل کر سکتا ہے۔ اس طرح کے واقعات کے نتیجے میں، جیسا کہ سات برس بعد ہونے

والے ممبئی حملوں نے ایک بار پھر ثابت کر دیا تھا، پاکستانی عزائم کے حوالے سے عالمی رائے عامہ اور بھی زیادہ منفی رنگ اختیار کر گئی تھی۔ اس حوالے سے کارگل کی تازہ تازہ یادیں بھی پرویز مشرف کو قائل کرنے کے لئے کافی تھیں۔ نہ ہی پاکستان کو یہ یقین ہوسکتا تھا کہ اس طرح کے واقعات اپنی اشتعال انگیز نوعیت کے سبب جنگ اور اس کے ساتھ اس کی تباہ کاریوں کے خلاف ڈھال ثابت ہوں گے۔

یہ نکتہ ذہن نشین کرنا ضروری ہے کہ لشکر طیبہ اور جیشِ محمد جیسی پاکستانی جہادی تنظیمیں، خواہ ان کے آئی ایس سے تعلق کی نوعیت کچھ بھی ہو نہ تو پاکستان کی خارجہ پالیسی مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہیں اور نہ ہی کبھی رہی ہیں۔ ان تنظیموں کے دنیا کے حوالے سے اپنے ہی نظریات اور اپنے ہی سیاسی اہداف ہیں جو اگرچہ کبھی کبھی ان کے پاکستانی خیرخواہوں اور مربیوں کے مفادات سے ہم آہنگ ہو جاتے ہیں مگر وہ واضح اور بنیادی طور بالکل مختلف نظریات ہیں۔ اگرچہ دونوں فریق کشمیر سے بھارت کو باہر نکال دینے کے مقصد پر متفق نظر آتے ہیں، تاہم پاکستان کے مقتدر سیاسی حلقے، سویلین اور فوجی دونوں، پاکستان میں یا کہیں اور ایک عالمی اسلامی خلافت کی بحالی یا شریعت کی حکمرانی نہیں چاہتے۔ لشکر اور جیش جیسی تنظیمیں رائے عامہ کی چنداں پرواہ نہیں کرتیں اور انہیں پاک۔ بھارت جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والے یقینی انتشار کی صورت میں بھی ایک موقع فراہم ہوسکتا ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی اچھی طرح باخبر ہیں کہ پاکستانی حکام کے نزدیک ان کا مقام کشمیر کے مسئلے پر بھارت کے ساتھ ہونے والی کشمکش میں ایک فیصلہ کن ہتھیار کی طرح ہے۔ پاکستان کے ان پر اس قدر انحصار کو وہ غالباً اپنے ہی جہادی عزائم کی تکمیل کا مکمل اجازت نامہ سمجھتی ہیں۔

اس امر سے قطع نظر کہ ان کی اصل یا حتمی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی تھی، یہ واقعات بھارت کے لئے ایک ایسی کڑوی گولی ثابت ہوئے جسے وہ نگلے بغیر نہ رہ سکا۔ ورنہ آخر کار وہ کشمیر پر اپنی پچاس برس سے زیادہ عرصے پر محیط بالادستی کا کیا جواز پیش کرتے؟ وادی میں ایک عدد مخاصمانہ اور مستقل عدم اطمینان کا شکار مسلم آبادی۔ مستقل طور پر متعین پانچ لاکھ فوجی جوان سب سے نزدیکی ہمسائے کی نرم نہ کی جاسکنے والی مخالفت ان کے ملک کے مرکز میں سنسنی خیز دہشت گرد واقعات کے بڑھتے ہوئے امکانات، جن کا بدلہ یا انتقام لینے کی کوششوں کا نتیجہ جنگ اور بڑے

بڑے شہروں کی ایٹمی حملوں سے تباہی کی صورت میں نکل سکتا تھا۔ یہ علم کہ اگر وہ کشمیر میں اپنے نقصانات کم کرنے اور وہاں سے نکل بھاگنے کا فیصلہ کریں تو اس کے نتیجے میں دوسری جگہوں پر بھی علیحدگی کی تحریک چل سکتی ہے اور یوں بھارت نسلی، لسانی اور مذہبی بنیادوں پر ٹوٹنا شروع ہو جائے گا۔ اگر بھارتی قوم کے بانی رہنماؤں کے اندر مستقبل میں جھانکنے کے نتائج دیکھنے کے قابل ہوتے تو کیا وہ ہری سنگھ کی مدد کے لئے تیار ہو جاتے؟ اس وقت ان کے پاس متبادل ترجیحات موجود تھیں۔ مگر اب ان کے پاس کونسی متبادل ترجیحات ہیں، یہ امر واضح نہیں ہے۔

جہاں تک پاکستانیوں کا تعلق ہے، ان کا خیال تھا کہ انہوں نے افغانستان سے جو اسباق حاصل کئے تھے انہیں کشمیر میں نافذ کرنے کا فیصلہ کر کے انہوں نے بڑی چالاکی کا ثبوت دیا تھا۔ یہ بھارت پر دباؤ ڈالنے اور اسے اپنی فوج کا اچھا خاصا تناسب کشمیر میں متعین کرنے پر مجبور کرنے کا ایک سستا طریقہ تھا۔ انہیں بلاشبہ بڑی امیدیں تھیں کہ اس طرح وہ بھارت کو مذاکرات کی میز پر لانے میں کامیاب ہونے کے ساتھ ہی، شاید، کچھ عرصے میں وادی سے نکل جانے پر بھی مجبور کر دیں گے۔ مگر وہ غالباً اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام ہو گئے تھے کہ اس مقصد کے لئے انہوں نے جن تنظیموں کا انتخاب کیا تھا وہ بالکل ہی مختلف مقاصد اور اہداف کو مدنظر رکھے ہوئے تھیں۔ آخر لشکر طیبہ اور جیشِ محمد کے حتمی اہداف و مقاصد کیا تھے؟ کیا کسی کو بھی یقین تھا کہ بھارت کو کشمیر سے نکال چکنے کے بعد وہ اپنے ہتھیار پھینک کر جاگیردار سیاستدانوں اور فوج کے تسلط کے حامل سیکولر پاکستانی مقتدر کی رحم دل حکومت کے تحت امن اور چین کی زندگی گزارنے کے لئے پاکستان میں اپنے گھروں کو لوٹ آئیں گے؟

مجھے شک ہے کہ کسی نے بھی اس نکتے پر زیادہ غور وغوض نہیں کیا تھا۔ اگر کسی نے سوچا بھی سہی تو یہ یقیناً یہی سوچا کہ یہ مستقبل کا مسئلہ ہے، ایک دور کا خطرہ جسے بڑی آسانی سے آنے والے وقت پر چھوڑا جا سکتا ہے آئی ایس آئی کو یہ پختہ یقین تھا اور جسے فوجی اور اس سویلین قیادت کی طرف سے بھی تقویت فراہم کی جاتی تھی جو اس دوران زیادہ عرصہ برسر اقتدار رہے تھے، کہ وہ جہادیوں کو اپنے کنٹرول میں رکھ سکتی ہے۔ افغانستان میں بھی مجاہدین کے حوالے سے ان کا یہی تجربہ رہا تھا۔ تاہم وہ اس امر کا پوری طرح ادراک کرنے میں ناکام ہو گئے تھے کہ یہاں ان کا واسطہ کس صورتحال اور کن لوگوں سے تھا۔ انہیں آہستہ آہستہ یہ پتہ چلنا شروع ہو گیا تھا کہ وہ بنیاد

پرست اسلام پسندوں کو صرف اس حد تک کنٹرول کرتے اور اپنے زیر اثر رکھ سکتے جس حد تک ان کا مفاد مشترک تھا۔ اس حد سے آگے نیو دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ کی عمارت کی سیڑھیاں اور جموں میں تعینات بھارتی فوجیوں کے بیوی بچوں کی لاشیں ہی پڑی نظر آتی تھیں۔ مگر یہ صرف کشمیر نہیں تھا جہاں پاکستانیوں نے یہ مشکل سبق سیکھنا شروع کر دیا تھا۔ افغانستان بھی حیرت انگیز طور پر اور ان کے تنفر کی حد تک ایک ڈراؤنے خواب کی طرح دوبارہ ان کے تعاقب میں تھا۔

MashalBooks.org

MashalBooks.org

5

طالبان، بن لادن، اور 9/11 کی سمت آغاز سفر

یہ اس طرح نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہر ایک کا خیال تھا کہ جب ایک مرتبہ روسی افغانستان سے نکل گئے تو ان کے پیچھے رہ جانے والی کٹھ پتلی کمیونسٹ حکومت جس کا سربراہ محمد نجیب اللہ تھا، فوراً ہی افغان مجاہدین کے آگے گھٹنے ٹیک دے گی۔ مگر روسیوں نے اپنی مالی امداد جاری رکھی اور کمیونسٹ حکومت کو نقصان نہیں پہنچا۔ نہ 1989 میں، نہ ہی اس سے اگلے برس۔ آئی ایس آئی نے اپنے مالی وسائل کا زیادہ حصہ گلبدین حکمت یار پر لٹانے کا عمل جاری رکھا جس کے پاس واضح طور پر یہ راستہ موجود تھا کہ ایک مرتبہ جب کمیونسٹ حکومت کا تختہ الٹ دیا جائے گا تو حکومت اس کے قبضے میں آ جائے گی۔ مگر نہ تو وہ اور نہ ہی اس کا اہم مخالف احمد شاہ مسعود کابل کے اندر بزور طاقت داخل ہونے میں کامیاب ہو سکے۔ یہ سوویت یونین کے حتمی زوال کے وقت 1992 کے آغاز کی بات ہے جب نجیب اللہ کے پاؤں کے نیچے سے آخر کار زمین کھسکنے لگی تھی۔ نئی روسی جمہوریہ نے تنخواہ کے رجسٹر سے اس کا نام کاٹ دیا تھا اور یوں اس کے سپہ سالاروں کے پاس اس کی حمایت جاری رکھنے کے لئے محرکات میں بھی کمی آ گئی۔ فیصلہ کن قدم فروری میں اس وقت اٹھایا گیا جب ازبک فوجوں کے سپہ سالار جنرل دوستم نے اس کا ساتھ چھوڑ کر مجاہدین سے جا ملنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ نہ صرف نجیب اللہ کے لئے ایک شدید دھچکا تھا بلکہ پاکستان کے لئے بھی کیونکہ دوستم نے مقابل طاقتوں میں سے حکمت یار کی بجائے مسعود کا انتخاب کیا تھا۔

آخر کار مسعود اور دوستم کے مشترکہ دباؤ کی تاب نہ لا کر کابل حکومت تڑخ کر ٹوٹ گئی۔ اقتدار سے نکالے ہوئے نجیب اللہ نے اقوام متحدہ کے احاطے میں پناہ طلب کی جہاں وہ کئی برس

بعد اپنی بے رحم موت تک قیام پذیر رہا۔ آئی ایس آئی اور حکمت یار اس سارے ڈرامے میں محض تماشائی بن کر رہ گئے۔ موخر الذکر خود ہی اس صورتحال کا ذمہ دار ٹھہرتا تھا۔ شہر میں داخلے سے قبل مسعود نے اسے موقع سے مشترکہ طور پر فائدہ اٹھانے کی پیش کش کی تھی مگر حکمت یار نے الٹا اسے لڑائی میں شکست دینے کی کوشش کر ڈالی۔ اگرچہ اسے اس کوشش میں ناکامی ہوئی مگر وہ اپنے سابقہ مخالف مجاہدین رہنما کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے الگ تھلگ کرنے میں کامیاب ہوگیا اور یوں اقتدار کے لئے ایک مسلسل والا حاصل کشمکش میں ایک دوسرے کے مدمقابل دوسرے امیدوار بھی جب ان جنگجوؤں کے ساتھ آن ملے تو ایک بظاہر نہ ختم ہونے والی افغان خانہ جنگی کے دوسرے مرحلے کی بنیاد رکھ دی گئی۔ افغان عوام کی زندگی مسلسل اجیرن کی جاتی رہی اور سب سے زیادہ تکالیف جنوب میں قندھار کے پشتونوں کے لئے تھیں۔ یہاں ہر طرف انتشار سا پھیلا ہوا تھا اور کوئی ایک کمانڈر بھی اس قابل نہیں تھا جو کہ سیاسی صورتحال کو کنٹرول کر سکے۔ اس کے برعکس جنگجوؤں کے ایک گروہ نے لوگوں کی زندگی عذاب بنا کر رکھ دی تھی، جو کہ صوبے کے جابر حکمرانوں کی طرح، کئی مدتوں سے زنا بالجبر، لوٹ مار اور آتش زنی کی وارداتوں میں مصروف چلے آرہے تھے۔

اس طرح کے حالات اور واقعات سے ایک مقامی سابقہ مدرسے کے طلباء کا ایک گروہ سخت تنگ آچکا تھا۔ ان میں سے بعض تو عمر کی اس حد تک پہنچ چکے تھے کہ سوویت مخالف جہاد میں مجاہدین کے شانہ بشانہ لڑ چکے ہوں گے جبکہ باقی ماندہ فرار ہوکر پناہ گزینوں کے ان خیموں تک پہنچ گئے تھے جو پاکستان نے صوبہ سرحد میں اس مقصد کے لئے قائم کر دیئے تھے۔ تقریباً سب کے سب ان بے شمار مدرسوں میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے جو جے یو آئی نے خطے مین اس لئے قائم کئے تھے تاکہ افغانستان میں مجاہدین کے مختلف گروہوں کے درمیان ہونے والی کشمکش میں اپنا علیحدہ کردار ادا کرنے کے قابل ہو سکے۔ وہاں انہوں نے قرآن کی تلاوت اور دوسری بنیادی اسلامی تعلیمات کے ساتھ دیوبندی نظریات پر عبور حاصل کیا جو کہ ان کی اپنی پشتون قبائلی روایات کی چھلنی سے گزر کر ان کے اندر سرایت کر گئے۔ جو طلباء مجاہدین کے ساتھ لڑنے کے لئے بہت کم سن تھے انہوں نے یقیناً ان داستانوں کو بہت غور سے سنا ہوگا جو ان سے بڑے طلباء نے کافر روسیوں کے خلاف جرأت مندانہ جہاد کے حوالے سے سنائی ہوں گی اور جس کے نتیجے میں وہ کافر ملک چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور کر دیئے گئے تھے۔ تاہم جب مدرسوں کے یہ طلباء اپنی

تعلیم مکمل کرنے کے بعد جنوبی افغانستان میں اپنی پشتون سرزمین پر واپس آنا شروع ہوئے تو یہاں انہیں سخت صدمے جیسی صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔ روسیوں کی شکست کے نتیجے میں کسی اسلامی ہزاریہ کا آغاز نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ان کو جنم دینے والی سرزمین الٹا تباہی اور انتشار کے دہانے پر پہنچ چکی تھی۔ نہ صرف یہ کہ علاقے میں کسی مرکزی حکومت کا نام ونشان نہیں تھا بلکہ غاصب قسم کے مقامی جنگجوؤں نے جو کہ علاقے کے اندر طاقت واقتدار کے لئے دست وگریباں تھے، لاقانونیت وبدعنوانی کا بازار گرم کر رکھا تھا۔ پہلے پہل تو مدرسوں سے فارغ التحصیل طلباء نے آپس میں ان برائیوں اور ناانصافیوں پر شکوہ شکایت سے بڑھ کر کچھ زیادہ نہیں کیا۔ تاہم آخر کار وہ اس حوالے سے فیصلہ کن اقدامات کے لئے تیار ہو گئے۔

جیسا کہ پاکستانی صحافی احمد رشید نے بتایا اس حوالے سے انہوں نے پہلی مرتبہ اسلحہ اٹھانے کا فیصلہ 1994 کی موسم بہار میں اس وقت کیا تھا جب ایک مقامی جنگجو کے فوجی سالار نے دو نوجوان لڑکیوں کو اغواء کرنے کے بعد عصمت دری کا نشانہ بنا ڈالا۔ عمر نام کے ایک نوجوان ملّا نے اپنے تیس ساتھیوں کو اکٹھا کر کے اس چوکی پر حملہ کر دیا جہاں لڑکیوں کو قید میں رکھا جا رہا تھا اور یوں لڑکیوں کو آزاد کرا دینے کے ساتھ ہی اس سالار کو اپنے ہی ایک ٹینک کی نال سے لٹکا کر پھانسی دے دی۔ اپنے بہت سے دیگر ساتھیوں کے برعکس مُلّا عمر نے پاکستانی مدرسے کی بجائے ایک مقامی افغان مدرسے میں تعلیم حاصل کی تھی۔ وہ ایک دیہاتی قسم کا پسماندہ خیالات رکھنے والا وہ پشتون ہے جس نے اپنے پاکستانی مدرسہ کے ساتھ طالب علموں کی طرح اپنے شدت پسند دیوبند نظریات کو پختون ولی کے انتہائی سخت قدیم پشتون قبائلی ضوابط کے ان باریک بیں عدسوں سے گزار کر پرکھا تھا جن میں عزت، انتقام، اور سرحدی علاقوں کے کھردرے انصاف پر زور دیا گیا تھا۔ نسلی و مذہبی روایات کے اس ملغوبے کے مطابق ایک اچھے مسلمان کا نہ صرف یہ فرض تھا کہ وہ معصوم و بے گناہ لوگوں کو جابر قسم کے مقامی حکمرانوں کے پنجۂ ستم سے چھڑوائے بلکہ جرم کا ارتکاب کرنے والوں کو بھی ٹینک کی نال کے ساتھ لٹکا کر پھانسی دے ڈالے۔ طالبان جنم لے چکے تھے۔

اس واقعہ سے حوصلہ افزائی ملنے کے بعد، جن کے نتیجے میں انہیں علاقے میں اچھی خاصی شہرت ملی، عمر اور اس کے ساتھیوں کو قندھار کے علاقے میں ایک کے بعد کامیابی ملنی شروع

ہو گئی۔ عمر ایک طرح سے اپنے علاقے کا رابن ہڈ بن چکا تھا، ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے ہوئے اور غریبوں کو مقامی جنگجوؤں کے ظلم وستم سے چھڑاتے ہوئے۔ جیسا کہ قسمت نے ساتھ دینا تھا، یہ واقعات اس وقت ظہور پذیر ہو رہے تھے جب آئی ایس آئی افغانستان میں اپنے ہی آدمی، یعنی گلبدین حکمت یار کے طرز عمل سے جھنجھلاہٹ کا شکار ہو رہی تھی جو کہ دشمن بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتا تھا۔ اس کی بعض مشکلات کے پس پردہ یہ حقیقت کارفرما تھی کہ اس کی بھرتی کی سماجی و جغرافیائی بنیاد بہت محدود تھی۔ جماعت اسلامی کی تحریک کے پس منظر کے ساتھ مطابقت رکھنے کے باعث اس کے حواریوں یا حمایتیوں کا حلقہ زیادہ تر تعلیم یافتہ شہری پشتونوں پر مشتمل تھا جو کہ دیہی اور ان پڑھ افغانوں کی اکثریت کے اندر ایک نسبتاً محدود تناسب رکھنے والا طبقہ تھا۔ طالبان کو اس طرح کی کوئی مشکل درپیش نہیں تھی جن کی صفوں میں نہ صرف پاکستانی مدرسوں سے بھرتی کی جا رہی تھی بلکہ ملا خود ملا عمر کی طرح کے ان پڑھ دیہاتی پشتون بھی شامل ہوتے جا رہے تھے۔

یہ محض اتفاق ہی ہے کہ طالبان کو پاکستانی حکومت کی شکل میں ایک حلیف بھی مل گیا تھا۔ بے نظیر بھٹو جو کہ 1993 میں ہونے والے قومی اسمبلی کے انتخابات میں معمولی سی اکثریت سے جیت تو گئی تھیں مگر انہیں حکومت کی تشکیل کے لئے چھوٹی سیاسی جماعتوں کی حمایت درکار تھی۔ جے یو آئی صرف چار نشستوں پر کامیابی حاصل کی تھی مگر اس کے رہنما مولانا فضل الرحمٰن کو اچانک ہی پی پی پی کے رہنماؤں کی توجہ اور التفات ملنا شروع ہو گئی تھی۔ اس کی حمایت کے بدلے بے نظیر نے اسے قومی اسمبلی کی خارجہ امور کمیٹی کا چیئرمین بنانے پر رضامندی ظاہر کر دی۔ جب طالبان، جن کی اکثریت اس کے اپنے مدارس سے فارغ التحصیل ہوئی تھی، 1994 کے موسم بہار اور موسم سرما میں اچانک ہی منظر عام پر آنا شروع ہو گئے تو وہ اس وقت (وہ بھی حکومت کے کام آئے) ان کی حمایت حاصل کرنے کے لئے وزیر دفاع نصیر اللہ بابر کے پاس کنجی موجود تھی، جو کہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر اور بے نظیر کا طویل عرصہ سے ساتھی اور مددگار ہونے کے علاوہ، نسلاً پشتون بھی تھا۔ جے یو آئی کے رہنما کا یہ موقف تھا کہ طالبان کے پاکستان کے ساتھ مدارس کے حوالے سے جو مضبوط تعلقات تھے ان کی بنیاد پر وہ کانٹے کی طرح کھٹکنے والے حکمت یار کی نسبت زیادہ بہتر حلیف ثابت ہوں گے اور یہ کہ اگر انہیں مناسب امداد و تعاون سے نوازا جائے تو وہ اس جگہ کامیابی حاصل کر لیں گے جہاں حکمت یار ناکام ہو گیا تھا۔ بابر نے اس دلیل سے قائل ہو کر معاملہ بے نظیر کے سامنے

رکھ دیا جو کہ اس سے اتفاق کرتی نظر آرہی تھی۔ اسے یہ امکان بہت متاثر کن نظر آرہا تھا کہ طالبان قندھار میں جو کہ ان کا اصل علاقہ تھا خاطر خواہ استحکام لاکر پاکستان اور وسطی ایشیا کے درمیان براستہ جنوبی افغانستان تجارتی راستے کھولنے میں معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔ تاہم آئی ایس آئی راستے کا پتھر ثابت ہوئی۔ اس نے یہ تو تسلیم کرلیا کہ حکمت یار کی کارکردگی مایوس کن رہی ہے مگر ساتھ ہی یہ نکتہ بھی اجاگر کر دیا کہ اس کی فوجیں کم سے کم مسعود کو تو کابل تک محدود رکھے ہوئے ہیں۔ یہ ایک اہم نکتہ تھا کیونکہ مسعود اور اس کا سیاسی مرشد برہان الدین ربانی حکمت یار کی حمایت کرنے کی بناء پر پاکستان کے سخت خلاف ہو چکے تھے۔ آئی ایس آئی کو خدشہ تھا کہ اگر حکمت یار کی طرف سے ڈالا جانے والا دباؤ ہٹا دیا گیا اور مسعود اور ربانی کی ملک پر گرفت مضبوط ہوگئی تو ان کا جھکاؤ ناگزیر طور پر بھارت کی طرف ہو جائے گا۔

تاہم اس ساری بحث کے دوران یہ سویلین ہی تھے جن کی رائے کو فوقیت حاصل ہوگئی تھی۔ آئی ایس آئی نے طالبان کی حمایت پر رضامند ہوتے ہوئے انہیں ایک آزمائشی موقعہ فراہم کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اس کا نتیجہ فوری طور پر سامنے آگیا۔ طالبان نے پہلے پہل ایک پاکستانی قافلے کو ایک جنگجو کے زیر انتظام علاقے سے محفوظ طور پر گزروا دینے میں کامیابی حاصل کرلی۔ تاہم نومبر تک وہ خود قندھار پر بھی قبضہ کر لینے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ اس خبر نے صوبہ سرحد کے اندر جے یو آئی کے مدرسوں مین زیر تعلیم نوجوان افغانی اور پاکستانی طلباء کے اندر خوشی کی لہر دوڑا دی۔ اپنے مُلّا سرپرستوں سے حوصلہ افزائی پا کر دس ہزار سے زائد طلباء اپنے سادہ سے ٹھکانوں سے نکل کر جنوبی افغانستان میں طالبان کے جھنڈے تلے اکٹھے ہوگئے۔ مُلّا عمر اور اس کے رفقائے کار نے پشتون قبائلی روایات اور شریعت کے سخت گیر قوانین کا ایک انوکھا امتزاج قندھار اور اس کے نواحی علاقوں پر نافذ کرتے ہوئے لڑکیوں کے اسکول اور عورتوں کے سرعام گھومنے پھرنے پر پابندی عائد کردی، مردوں کا داڑھی رکھنا لازمی قرار دے دیا۔ ٹیلی ویژن اور فلموں کو غیر قانونی قرار دے دیا، چھوٹے چھوٹے جرائم پر ہاتھ پاؤں کاٹنے کا حکم جاری کر دیا اور شکست کھانے والے مخالفین کو اپنے اسلحہ خانے میں بڑی تعداد میں شامل ہونے والے ٹینکوں کی نال سے باندھ کر پھانسیاں دینی شروع کر دیں۔

اگرچہ آنے والے دو برسوں کے دوران طالبان کو ایک سے زیادہ محاذوں پر پسپائی

اختیار کرنی پڑی، تاہم آئی ایس آئی کی حمایت اور میدان جنگ میں اپنی بڑھتی ہوئی مہارت کی بدولت وہ ایک کٹھن آزمائش ثابت ہوئے۔ ایک برس کے اندر اندر وہ سارے جنوبی افغانستان پر قابض ہو چکے تھے ستمبر 1995 میں انہوں نے ہرات پر بھی قبضہ کر لیا تھا جو کہ ملک کے مغربی حصے میں واقع سب سے بڑا شہر ہے۔ اس سے پورے ایک برس بعد، جبکہ ملا عمر کی طرف سے دونو جوان لڑکیوں کو رہا کروائے ہوئے صرف ڈھائی برس ہی گزرے ہوں گے، طالبان کابل کے اندر گھس گئے، اور مسعود کی فوجوں کو وہاں سے باہر نکال کر افغان دارالحکومت پر اپنا خوفناک راج مسلط کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ بدقسمت حکمت یار جس نے آخر کار گزشتہ موسم بہار میں مسعود کے ساتھ صلح کر لی تھی اور اس کے بعد کابل حکومت میں وزارت عظمیٰ کے عہدے پر فائز ہو گیا تھا، خود کو یوں بے یار مددگار پا کر جلد ہی جلاوطن ہو کر ایران پہنچ گیا۔ اس دوران کابل میں اقتدار سنبھالنے کے بعد طالبان نے اپنی پہلی سیاسی کاروائی کرتے ہوئے سابقہ کمیونسٹ رہنما نجیب اللہ کو اقوام متحدہ کے اس احاطے سے گھسیٹ کر باہر نکالا جس میں وہ گزشتہ چار برسوں سے قیام پذیر تھا، اس کے مردانہ اعضاء کاٹ دیئے اور ایک جیپ کے پچھلے حصے سے باندھ کر اسے گھسیٹے ہوئے لے گئے اور آخر کار اسے اسٹیل کی ایک تار کے ساتھ شہر کے وسط میں واقع ٹریفک کے اشارے والے کھمبے کے ساتھ نہ کہ ٹینک کی نالی کے ساتھ، لٹکا کر پھانسی دے ڈالی۔

اگست 1998 میں میرے اسلام آباد پہنچنے تک طالبان شمال مغرب میں واقع ایک اہم علاقے مزار شریف پر بھرپور چڑھائی کے لئے مکمل طور پر تیار ہو چکے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ایک برس قبل ان کی اس وقت تک کی سب سے بڑی فوجی شکست کے دوران مقامی فوجوں نے ان کے 3000 طالبان فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ وہ اس کا بدلہ لینے کے ساتھ ہی ملک کے 80 فی صد علاقے کو بھی اپنے زیر تسلط لانے کے لئے پوری طرح متحرک نظر آتے تھے۔ ان کے سب سے بڑے دشمن، شمالی اتحاد کو، وہ نام جس سے مسعود اور اس کے کبھی حریف کبھی حلیف جنرل دوستم نے اپنی فوجوں کو نوازا تھا، وادی پنج شیر کے مرکز میں، جو کہ مسعود کا گڑھ تھی، کابل کے شمال کی طرف ملک کے ایک تنگ سے علاقے کے اندر ایک خوفناک جنگ کے لئے تیار کر دیا گیا تھا۔

میں نے جس دن پاکستان کی سرزمین پر قدم رکھے اس وقت تک امریکہ اور طالبان کے درمیان تعلقات نہ اچھے تھے اور نہ برے تھے۔ امریکہ نے کابل میں اپنا سفارت خانہ

1989 میں افغان خانہ جنگی کے آغاز کے ساتھ ہی امن عامہ کی بگڑتی ہوئی صورتحال کے پیش نظر بند کر دیا تھا۔ اس کی بجائے افغانستان کی سرگرمیوں کا احاطہ اسلام آباد میں واقع امریکی سفارت خانے سے کیا جانے لگا اور طالبان کے ساتھ زیادہ تر مذاکرات بھی پاکستانی دارالحکومت میں کئے گئے جہاں طالبان نے وہ سفارت خانہ برقرار رکھا ہوا تھا جس کا قبضہ انہوں نے شمالی اتحاد کے نمائندوں سے لیا تھا۔ یہ ایک انتہائی سرسبز قسم کے گھنے درختوں میں گھری ہوئی عمارت تھی جو کہ میری رہائش گاہ کی مخالف سمت چند گھروں کو چھوڑ کر واقع تھی۔ اس وقت تک امریکہ افغانستان کی خانہ جنگی میں ایک غیر جانبدار فریق کی حیثیت رکھتا تھا۔ امریکہ کا یہ خیال تھا کہ کہ اس مسئلے کا حل میدانِ جنگ میں نہیں بلکہ اقوام متحدہ کی وساطت سے ہونے والے ان مذاکرات کے ذریعے ہونا چاہئے جن کا مقصد ایک وسیع البنیاد مخلوط حکومت کا قیام تھا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اس پالیسی کے حوالے سے قندھار سے کسی قسم کے موافق ردعمل کی امید نہیں تھی، جس کی ایک وجہ یہ تھی کہ ملک میں طالبان کا غلبہ قائم ہو چکا تھا۔ طالبان امریکہ سے اس سے زیادہ اور کچھ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی غالب حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔ تاہم وہ کسی طرح سے بھی مخاصمانہ جذبات نہیں رکھتے تھے۔ امریکی عہدیداروں سے ان کی ہر ملاقات کا آغاز اظہار تشکر کے ان کلمات سے ہوتا جن کے مطابق امریکہ نے سوویت مخالف جہاد میں ان کو امداد و تعاون سے نواز کر بہت مہربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔

تاہم رنگ میں ایک بہت بڑا بھنگ تھا: اسامہ بن لادن۔ وہ افغانستان سے سوویت فوجوں کے اخراج کے بعد واپس سعودی عرب چلا گیا تھا مگر جلد ہی اس کا سعودی حکومت سے 1991 کی جنگ خلیج کے دوران امریکہ کو سعودی سرزمین سے کاروائی کرنے کے ٹھکانے فراہم کرنے کے مسئلے پر اختلاف پیدا ہو گیا تھا، اس کے نزدیک، جیسا کہ وہ کہتا تھا، ''صلیبی طاقتوں'' کا ''دو مقدس مقامات والی سرزمین'' پر قیام مذہبی جذبات کی پامالی سے کم نہیں تھا اور اس کے خلاف اس نے کھلم کھلا اور بڑی جرأت سے آواز بلند کرنی شروع کر دی تھی۔ سعودی شاہی خاندان اس صورتحال سے ناخوش تھا اور آخر کار بن لادن کو ملک چھوڑنے پر مجبور کر دیا گیا۔ سوڈان میں پناہ لیتے ہوئے اگلے کئی برسوں کے دوران اس نے ایک ایسی تنظیم تشکیل کر ڈالی جو بعد میں القاعدہ کے نام سے معروف ہوئی۔ تاہم امریکہ کے خلاف اس کے جوش خطابت اور امریکی تنصیبات کو نشانہ

بنانے کی مسلسل دھمکیوں کی بدولت واشنگٹن میں متعلقہ حلقوں کی تشویش میں اضافہ ہوتا چلا گیا جس کے نتیجے میں سوڈانی حکومت پر دباؤ ڈالا گیا کہ وہ اسامہ بن لادن کو ملک سے نکال دے۔ اس پر آخر سوڈانی حکومت نے رضامندی ظاہر کردی اور بن لادن نے اپنی محدود ترجیحات کو سامنے رکھتے ہوئے ایک ایسی جگہ پہنچنے کا فیصلہ کرلیا جہاں اس کا خیال تھا کہ اسے کھلے دل سے خوش آمدید کہا جائے گا۔ وہ مئی 1996 میں واپس افغانستان آ گیا، طالبان کے کابل داخل ہونے سے صرف چار ماہ قبل۔

بن لادن پہلے پہل پاکستانی سرحد سے تھوڑے سے فاصلے پر واقع افغانستان کے شمالی حصے میں جلال آباد شہر کے اپنے پرانے ٹھکانوں پر قیام پذیر رہا، یعنی اس علاقے میں جو اس وقت طالبان کی عملداری سے باہر تھا۔ یہیں سے اس نے اپنے امریکہ مخالف فتووں میں سے پہلا فتویٰ جاری کیا تھا۔ 1997 کے آغاز میں وہ طالبان کے دل میں اپنا مقام بنا چکا تھا اور یوں وہاں سے ان کے اصل ٹھکانے قندھار منتقل ہو گیا۔ اس نے جلال آباد کے جنوب میں خوست کے اندر قائم کردہ ایک تربیتی مرکز تک بھی رسائی حاصل کر لی تھی۔ اس تربیتی مرکز کو پہلے سے ہی اس پاکستانی جہادی تنظیم حرکت المجاہدین کے لئے ایک تربیت گاہ کے طور پر استعمال کیا جارہا تھا جو آئی ایس آئی سے ملنے والی مالی معاونت کی بدولت اسے کشمیر میں اپنی پیدل سپاہ کی تیاری کے لئے استعمال کر رہی تھی۔ بن لادن نے اس تربیتی مرکز کے ایک حصے کو خود اپنی القاعدہ کے جہادیوں کے استعمال کے لئے وقف کر دیا تھا۔ وہاں ایمن الظواہری بھی اس کے ساتھ آن ملا جس نے خود اپنی تنظیم بنام ایجپشن اسلامک جہاد کو بھی القاعدہ میں ضم کر دیا تھا۔ فروری 1998 میں بن لادن نے امریکہ کے خلاف ایک عدد اور فتویٰ تیار کیا جس پر ان دونوں نے اپنے اپنے دستخط ثبت کر دیئے تھے۔ اس فتوے کے تحت مسلمانوں پر زور دیا گیا تھا کہ وہ امریکیوں کو مار ڈالیں اور جہاں کہیں بھی ان کی تنصیبات نظر آئیں انہیں تباہ کر ڈالیں۔ ہتھیار اٹھانے کی اس پکار نے امریکہ کے اندر خطرے کے احساس کو اور تیز کر دیا جس نے امریکی سفیر برائے اقوام متحدہ بل رچرڈز کے طے شدہ دورہ کابل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس معاملے کو طالبان کے سامنے رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ ان کا ردعمل بنیادی طور پر حیرت اور تعجب کے مظاہرے پر مبنی تھا۔ بن لادن کوئی مُلّا نہیں تھا اور اس طرح کے فتوے یا احکام جاری کرنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا تھا۔

میرے پاکستان پہنچنے کے چار روز بعد بن لادن نے اپنے فتوے کے عین مطابق نیروبی اور دارلسلام میں امریکی سفارت خانوں پر بم دھماکے کروا دیئے۔ یہ 7 اگست 1998 کا دن تھا۔ان دھماکوں میں بارہ امریکیوں سمیت 200 سے زائد افراد ہلاک ہو گئے تھے۔اس کے عواقب جلد ظاہر ہونے والے تھے۔ دو ہفتوں کے بعد امریکہ نے احتیاطی تدابیر اختیار کرتے ہوئے پاکستان میں اپنے سفارت خانے خالی کروا لئے۔ سفارتی عملے کے تمام گھرانوں اور غیر ضروری ارکان کو ملک سے باہر روانہ کر دیا گیا۔ان کی روانگی کے دو دن بعد پاکستان کے ساحلوں سے پرے کھڑے ہوئے امریکی بحری جہازوں سے کروز میزائل پرواز کرتے ہوئے خوست کے اس تربیتی مرکز میں جا لگے جہاں مبینہ طور پر اسامہ بن لادن موجود تھا۔مگر یہ حملہ اتنا موثر ثابت نہ ہوا۔ تربیتی مرکز میں موجود بہت سے افراد ہلاک ہو گئے مگر ان میں سے کوئی بھی القاعدہ کا رکن نہیں تھا۔ جیسا کہ پہلے نکتہ اجاگر کیا جا چکا ہے، ہلاک ہونے والوں کی اکثریت کا تعلق بلاشبہ حرکت المجاہدین سے تھا۔ بن لادن، بظاہر یہ لگتا تھا کہ حملے سے کئی گھنٹے پہلے ہی کہیں اور جا چکا تھا۔ امریکہ نے سوڈان میں اس کیمیکل فیکٹری پر بھی بمباری کر دی تھی جس کے بارے میں یہ یقین پایا جاتا تھا کہ اس کا تعلق بن لادن سے ہے۔

مشرقی افریقہ میں ہونے والی بمباری اور خوست پر کیے جانے والے ناکام انتقامی حملے امریکہ کی تین سالہ ان ناکامیاب کوششوں کا باقاعدہ آغاز کا پیش خیمہ تھے جن کا مقصد بن لادن کو انصاف کے کٹہرے میں لا کھڑا کرنا تھا اور جن کا انجام 11 ستمبر کو ورلڈ ٹریڈ سنٹر اور پینٹا گون پر ہونے والے مشہور زمانہ حملوں کی صورت میں نکلا۔ امریکہ مشرقی افریقہ پر کئے جانے والے حملوں کے جواب میں طالبان سے جنگ کرنے پر تیار نہیں تھا۔ بن لادن اور طالبان کی قیادت کے درمیان تعلقات کی بالکل درست نوعیت کا کسی کو علم نہیں تھا، اور محض اشتعال کی بنیاد پر کارروائی کا کوئی خاطر خواہ جواز نہیں تھا۔امریکی حکومت یا عوام کی طرف سے اس طرح کے انتہائی اقدام کے حوالے سے مجموعی طور پر کوئی شور وغوغا نہیں کیا گیا تھا۔اس کی بجائے امریکہ نے بن لادن کو تلاش کرنے کی کوشش میں افغانستان میں کارروائی کے مقام پر موجود خفیہ وسائل سے استفادہ کرنے کے ساتھ ہی بحیرہ عرب میں اپنے بحری بیڑے کو بھی تیار رکھا تاکہ اگر اس کے ٹھکانے کا علم ہو جائے تو اس پر کروز میزائلوں سے حملہ کیا جا سکے۔ مبینہ طور پر اس کو دیکھے جانے کی اطلاعات بھی ملیں، تاہم

اگرچہ واشنگٹن میں کچھ لوگ خطرہ مول لینے پر تیار تھے، البتہ قابل بھروسہ معلومات کے فقدان کے ساتھ ہی راستے سے گزرتے یا قریب کھڑے ہوئے بے گناہ لوگوں کو مارنے کا خطرہ بھی اتنا غیر اہم نظر نہیں آتا تھا کہ حملے کا بھرپور جواز فراہم کیا جا سکتا اور وہ بھی خاص طور پر خوست حملوں کی ناکامی کے بعد۔ نہ ہی امریکہ طالبان کی مخالفت میں ایک ایسے مقصد کے لئے جس کا حصول ممکن نظر نہیں آتا تھا، شمالی اتحاد کے ساتھ الحاق کرنے پر تیار تھا۔ مسعود کی فوجوں کے لئے تو ثابت قدم رہنا بھی مشکل ہوتا جا رہا تھا اور صورتحال کو اپنے حق میں کرنے کے لئے اس کے پاس افرادی قوت کی کمی تھی حالانکہ امریکہ نے اپنی غیر جانبداری کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اسے مادی وسائل فراہم کرنے کا فیصلہ بھی کر لیا تھا۔

واشنگٹن زیادہ سے زیادہ یہی کرنے پر تیار تھا کہ طالبان کو سختی سے خبردار کر دے کہ اگر القاعدہ نے کوئی اور حملہ کیا تو اس کی ذمہ داری طالبان پر ہی عائد ہوگی۔ میرے اسلام آباد قیام کے تین برسوں کے دوران طالبان کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں میں یہ دھمکی تقریباً ایک منتر پڑھنے کی رسم بن گئی تھی۔ یہ امر تو واضح نہیں ہے کہ انہوں نے اس مبہم قسم کی دھمکی کے بارے میں کیوں سوچا، مگر اس کا ان پر کوئی خاص اثر ہوتا نظر نہیں آ رہا تھا۔ بن لادن کے خلاف کسی قسم کی کاروائی سے انکار کے لئے پیش کی جانے والی وجوہات وقتاً فوقتاً بدلتی رہتی تھیں۔ جو وجہ بار بار دہرائی جاتی تھی وہ یہ کہ وہ ایک مہمان تھا اور پختون ولی ضوابط کے مطابق پشتون روایت کے تحت اسے کسی کے سپرد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس کو یکدم مسترد بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کیونکہ پختون روایات کے مطابق مہمان کی حفاظت ایک اہم فریضہ ہے۔ بعض دوسرے مواقع پر طالبان بن لادن کے خلاف کاروائی کرنے پر کم از کم مصنوعی قسم کی آمادگی ظاہر کر چکے تھے انہوں نے مشرقی افریقہ میں کئے جانے والے بم دھماکوں میں اس کے ملوث ہونے کے ثبوت فراہم کرنے کے مطالبے کے ساتھ ہی یہ امکان بھی ظاہر کر دیا کہ وہ اس حوالے سے مذہبی علماء پر مشتمل ایک کمیشن قائم کریں گے جو صورتحال کا جائزہ لے گا۔ بم دھماکوں کے فوری بعد انہوں نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ انہوں نے خود ہی بن لادن اور اس کی سرگرمیوں پر پابندیاں عائد کر دی تھیں اس کے بعد آنے والے فروری کے مہینے میں انہوں نے اعلان کیا کہ وہ کسی نامعلوم مقام پر روپوش ہو گیا ہے۔ سب سے بعید از فہم جواز وہ یہ پیش کرتے تھے کہ اگر انہوں نے اسامہ بن لادن کو ملک بدر کرنے کی کوشش کی تو افغان عوام

ان کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس عرصے کے دوران جبکہ وہ ایک کے بعد ایک مشکوک تجویز پیش کرتے چلے جا رہے تھے، یہ امر واضح ہوتا گیا کہ ان کا بنیادی مقصد صرف یہ تھا کہ وہ پریشانی کا باعث بننے کے ساتھ ہی وقت ضائع کرتے رہیں تا کہ امریکہ کو اوپر سے تعاون دینے کا تاثر دے کر اسے دھوکے میں مبتلا کئے رکھیں۔ طالبان کو امریکہ سے سب سے زیادہ جس چیز کی طلب تھی وہ یہ تھی کہ انہیں تسلیم کر لیا جائے۔ باوجود اس حقیقت کے کہ وہ افغانستان کے 80 فی صد سے زیادہ علاقے پر اپنا نظم ونسق قائم کر چکے تھے، انہیں افغانستان کے قانونی حکمران کی حیثیت سے تسلیم کرنے والے صرف تین ممالک تھے، یعنی پاکستان، متحدہ عرب امارات اور سعودی عرب۔ سعودی حکومت طالبان کے اولین حامیوں میں شمار ہوتی تھی اور جب انہوں نے بعد ازاں اسامہ بن لادن کو تعاون سے نوازہ تو اگرچہ اس پر انتہائی ناخوش تھی مگر اس نے کبھی بھی ان کے ساتھ تعلقات منقطع کرنے پر آمادگی ظاہر نہیں کی۔ اس پس منظر میں امریکہ کی طرف سے طالبان کو تسلیم کرنے کا فیصلہ ایک طرح سے انتہائی اہم مضمرات کا حامل ہوتا، جس کے نتیجے میں ان کو شدت سے درکار وہ بین الاقوامی عزت واحترام مل جاتا جو کہ میدان جنگ میں حاصل ہونے والی کامیابی کے برابر تھا۔ تاہم نہ تو امریکہ بن لادن کے بدلے کسی قسم کے سفارتی تعلقات قائم کرنے پر آمادہ تھا اور نہ ہی طالبان نے ان دونوں کے درمیان کبھی کوئی واضح تعلق ظاہر کرنے کی کوشش کی۔ اگرچہ امریکہ کو بن لادن بری طرح مطلوب تھا مگر وہ ایک ایسی حکومت کو تسلیم کرنے پر ہرگز آمادہ نہیں تھا جو کہ ساتویں صدی کے نظام کو ایک خوبی بنا کر پیش کر رہی تھی۔ اس طرح کرنا گویا انتہائی مایوس کن ذہنیت کی عکاسی ہوتی۔ اس کے علاوہ ایک ایسی حکومت کو تسلیم کرنے سے خود امریکہ کے اندر بھی شدید ردعمل ہوتا جو کہ خواتین کے حوالے سے انتہائی رجعت پسندانہ اقدامات کرتے ہوئے لڑکیوں کے اسکول بند کروانے کے علاوہ انہیں گھر سے باہر برقع پہننے اور گھر کے اندر پردہ کرنے پر مجبور کرتی نظر آتی تھی۔ تاہم یہ یقین کئے بغیر نہیں رہا جا سکتا کہ طالبان اس طرح کی سودے بازی پر کبھی تیار نہ ہوتے۔ جب میں پاکستان پہنچا تھا تو بن لادن اور ملا عمر کے درمیان تعلقات کی نوعیت ابھی تک واضح نہیں تھی۔ پہلے پہل پختون ولی کے ضوابط کے حوالے سے دلیل میں کچھ وزن نظر آتا تھا۔ مگر سفارت خانے میں اپنے پہلے سال کے دوران ہم نے طالبان کے اپنے دفاتر سے ذرائع ابلاغ کو جاری کردہ خبریں اکھٹی کرنا شروع کیں تو ان میں سعودی سرزمین پر امریکی

فوجوں کی موجودگی کی مذمت کی گئی تھی۔ نہ صرف یہ کہ اس طرح کے اور اس سے ملتے جلتے اعلانات طالبان کے منہ سے پہلے کبھی بھی نہیں سنے گئے تھے بلکہ یہ اس طرح کے اور اس طرح کے موقف کی ترجمانی کرتے نظر آتے تھے جو طویل عرصہ سے القاعدہ کے حوالے سے ظاہر کیا جاتا رہا تھا اور ایسا لگتا تھا کہ براہ راست القاعدہ کے صحافتی تھیلے سے نکالا گیا ہو۔ یہ اس طرح کے انداز واطوار کو ظاہر نہیں کرتا تھا جن کی آپ طالبان کی قیادت کرنے والی ان سیدھی سادھی اور پسماندہ پشتون شخصیات سے توقع رکھ سکتے ہوں جنہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا گیا ہو۔ آخر ملا عمر کو کیا مصیبت ہے کہ وہ اس بات پر پریشان ہوتا پھرے کہ سعودی حکومت نے اپنی سرزمین پر کس کو اڈے دیئے ہوئے ہیں؟ یہ نہ صرف اس امر کا ثبوت تھا کہ طالبان القاعدہ کے خیالات سے متفق تھے بلکہ یہ بھی کہ بن لادن ملا عمر کے ایک باعزت مہمان سے زیادہ اس کے سیاسی قائد یا رہنما کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی پاکستانی اخبارات میں یہ خبریں بھی آنا شروع ہو گئیں کہ بن لادن نے اپنے ایک بیٹے کی شادی ملا عمر کی بیٹی سے کر دی تھی، یا پھر اس کے الٹ؛ یہ پوری طرح کبھی واضح نہ ہو سکا۔ اگرچہ یہ بات اتنی قابل یقین نظر نہیں آتی کہ ایک امیر اور تعلیم یافتہ سعودی باشندہ اپنے کسی بچے کی شادی کسی ان پڑھ دیہاتی پشتون سے کرنے پر رضامند ہو گیا ہو گا، مگر اس طرح کی افواہوں میں اس وقت کافی صداقت نظر آ رہی تھی۔

صاف ظاہر ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ یہ حقیقت عیاں ہوتی چلی گئی کہ ملا عمر اسامہ بن لادن کا ساتھ ہر حال میں نبھانے پر تلا ہوا تھا خواہ انجام کتنا ہی خوفناک کیوں نہ ہو۔ تاہم اس بات پر کوئی بھی اس وقت تک یقین کرنے کے لئے تیار نہیں تھا جب تک کہ یہ حقیقت نہ بن گئی اور یہی وجہ یہ امریکہ نے دونوں شخصیات کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنے کی کوششیں آخر دم تک جاری رکھیں۔ اور اس امر پر حیرت نہیں ہونی چاہئے کہ اس حوالے سے نہ صرف خود طالبان پر دباؤ ڈالا گیا بلکہ ان کے بنیاد خیر اندیش پاکستان پر بھی۔ مشرقی افریقہ میں کرائے جانے والے بم دھماکوں نے پاکستان کو بھی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ اس نے افغان خانہ جنگی میں طالبان کی حمایت کا فیصلہ کر لیا تھا اور اس کے نتائج بھی خاطر خواہ طور پر اس کے حق میں جا رہے تھے۔ پاکستان کی اچھی خاصی حمایت اور تعاون کی بدولت طالبان تقریباً تقریباً سارے ہی ملک پر اپنا نظم ونسق نافذ کرنے کے قابل ہو گئے تھے۔ اس امر کا اچھا خاصا امکان نظر آ رہا تھا کہ مسعود آخر کار ہتھیار ڈال دے گا اور

پاکستان کے لئے اس تصادم کا انجام اس کی مغربی سرحد پر ایک ایسے دوست ملک کی صورت میں نکلے گا جو بھارت کیساتھ جنگ کی صورت میں اسے وہ چیز عطا کرے گا جیسے وہ تزویری گہرائی (Strategic depth) کہنا پسند کرتا تھا۔ تاہم افغانستان کی سرزمین پر اسامہ بن لادن کی موجودگی ایک انتہائی پیچیدہ عنصر تھا۔ پاکستان کو اس کی موجودگی سے کچھ حاصل ہونے کی بجائے الٹا اچھا خاصا نقصان اٹھانا پڑا۔

مشرقی افریقہ میں ہونے والے بم دھماکوں کے بعد امریکہ نے پاکستان پر دباؤ بڑھانا شروع کر دیا کہ وہ قندھار میں اپنا اثر ورسوخ استعمال کرتے ہوئے بن لادن کو انصاف کے کٹہرے میں لانے میں مدد دے۔ تاہم عملی طور پر اس کا مطلب خالی خولی دھمکیوں سے بڑھ کر کارکردگی کا مظاہرہ کرنا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں امریکہ نے مئی 1998 کے ایٹمی دھماکوں کے جواب میں پاکستان پر پہلے ہی پریسلر ترمیم کے تحت پابندیوں کا دوبارہ نفاذ کرنا شروع کر دیا تھا اور اس کے ترکش میں ابھی کچھ کام کے تیر باقی تھے۔ پاکستان نہ صرف اس سے اچھی طرح آگاہ تھا بلکہ اسے اس امر پر بھی غم وغصہ تھا کہ امریکہ کو اب پھر ایک اور مسئلے کی تکرار کرنے کا موقع ہاتھ آ گیا تھا۔ اس حقیقت سے بھی کہ واشنگٹن نے ابھی حال ہی میں کشمیر میں جہادی تنظیموں کی حمایت کے طعنے دے کر اسے کارگل سے پسپائی پر مجبور کر دیا تھا، ان کے رویے میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ اس عرصے کے دوران میرا پاکستانی حکام کے ساتھ جن موضوعات پر تبادلہ خیال ہوا، ان میں سے افغانستان کا موضوع ایک ایسا موضوع تھا جو انہیں فوراً جوابی بیان دینے پر مجبور کر دیتا۔ مجھے ابھی تک وہ گفتگو اچھی طرح یاد ہے جو میری اس وقت کے ڈائریکٹر جنرل آرمی ملٹری انٹیلی جنس اور بعد ازاں آئی ایس آئی کے سربراہ احسان الحق کے ساتھ ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ ملاقات کا وقت لینا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا تھا کیونکہ اعلیٰ فوجی افسروں معمول کی سرکاری ملاقاتوں کے علاوہ امریکی عہدیداروں سے ملنے میں ہمیشہ ہچکچاہٹ محسوس کرتے تھے۔ اس نے اپنی راولپنڈی والی رہائش گاہ پر میرا استقبال کیا اور ہماری ملاقات اس وقت تک خوشگوار رہی جب تک کہ میں نے بن لادن کا موضوع نہیں چھیڑ دیا۔ اس کے انداز سے جلد ہی جھنجھلاہٹ کی حد تک بے چینی ظاہر ہونے لگی۔ ''سمجھ میں نہیں آتا کہ تم امریکی افغانستان کے حوالے سے اتنے فکر مند کیوں رہتے ہو'' اس نے جواب دیتے ہوئے کہا۔ ایک اور موقع پر پاکستانی فوج میں میرے بہترین شناسا نے، جو کہ پرویز

مشرف سے قریبی تعلقات رکھنے والا ایک ریٹائرڈ جنرل تھا اور فوج اور اس کے مقاصد سے متعلق میرے ساتھ بڑے بے تکلف گفتگو کرتا تھا، مجھے بتایا کہ ان کی سمجھ سے یہ بات بالاتر ہے کہ امریکہ کے سر پر اسامہ بن لادن کا بھوت کیوں سوار ہے۔

یہ محض جھنجھلاہٹ کی بات نہیں تھی۔ ان افسروں کی سمجھ میں یہ نہیں آتا تھا کہ امریکہ بن لادن کو اتنی سنجیدگی سے کیوں لیتا تھا۔ اگرچہ یہ درست تھا کہ القاعدہ امریکہ کے دو سفارت خانوں میں بم دھماکے کرانے میں کامیاب ہوگئی تھی، تاہم یہ ابھی تک نسبتاً ایک چھوٹی سطح کی تنظیم تھی جس سے امریکہ کو کسی طرح کا سنجیدہ خطرہ لاحق نہیں تھا۔ پاکستان کے حکمران طبقوں میں اس ادراک کے ساتھ وسیع پیمانے پر یہ غصہ بھی پایا جاتا تھا کہ امریکہ ایک ایسی چیز کو کھوکھلا کرنے کی کوشش کر رہا تھا جو ان کے نزدیک ان کے ملک کے دفاع کے لئے انتہائی ناگزیر اہمیت کی حامل تھی اور یہ کہ انہوں نے اس کے حصول کے لئے سخت محنت کی تھی۔ ان کے خیال میں افغانستان پر روسی قبضے کے خلاف جدوجہد کے دوران ساری تکلیفیں بھی انہوں نے برداشت کی تھیں اس لئے ان کو یہ حق حاصل ہو گیا تھا کہ کابل میں ان سے دوستانہ تعلقات رکھنے والی حکومت ہو۔ تاہم ان کے سامنے ایک ہر لحاظ سے طاقتور ملک امریکہ موجود تھا جس کی فوری تنقید ہر موڑ پر ان کی منتظر ہوتی، خواہ یہ ان کا ایٹمی پروگرام ہو، کارگل کا معرکہ ہو، جہادیوں کی تربیت اور انہیں کشمیر کے اندر سرایت کر جانے میں مدد دینے کا معاملہ ہو، اور اب ایک نئے مسئلے کی شکل میں ان کے لئے باعث تکلیف بنا ہوا تھا۔

یہ امر واضح نہیں ہے کہ پاکستانیوں نے بن لادن کے معاملے میں طالبان پر کس حد تک دباؤ ڈالا تھا۔ افغانستان میں طالبان کے ساتھ آئی ایس آئی کے افسروں کی اچھی خاصی تعداد کام کر رہی تھی، اور اگر وہ چاہتے تو القاعدہ کے قائد تک رسائی حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کر سکتے تھے۔ کارگل بحران کے سر ابھارنے کے بعد، نواز شریف، مبینہ طور پر، اس امر پر راضی ہو گیا تھا کہ بن لادن کا تعاقب کرنے کے لئے ایک عدد کمانڈو یونٹ کی تشکیل کی جائے، تاہم قبل اس کے کہ اس کے خلوص کی آزمائش کی جاتی، مشرف نے بغاوت کے ذریعے اس کا تختہ الٹ کر رکھ دیا۔ اس حوالے سے رضامندی ظاہر کرنے کے باوجود بغیر کسی تکلف کے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایسا مشکوک لگ رہا تھا کہ پاکستان اصل میں بن لادن کی کھوج لگانے کی کوشش کرتا کیونکہ اس طرح ان کے طالبان کے ساتھ تعلقات شدید تناؤ کا شکار ہو سکتے تھے۔ بن لادن اور کچھ ہو

یا نہ ہو مگر ان کا معزز مہمان ضرور تھا۔ وہ پاکستانیوں کی طرف سے اسے ان کی سرزمین پر قتل کر دینے یا پھر ان کے ہاتھ سے بڑے بے ربط انداز میں چھین کر لے جانے کے عمل کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتے تھے۔ اگر چہ طالبان اس مشکل پر قابو پانے میں کامیاب ہو سکتے تھے، کیونکہ آخر کار ان کو اور کہیں سے بھی تعاون و امداد ملنے کا امکان نہیں تھا مگر اس کے لئے پاکستان کو ضرورت سے زیادہ خطرہ مول لینا پڑتا۔

تاہم پاکستانی حکام نے ملا عمر پر اسامہ بن لادن کے حوالے سے دباؤ ڈالنے کے لئے قندھار کے دو عدد علی الاعلان دورے کئے: ایک تو اس وقت جب نواز شریف وزیر اعظم تھا اور دوسرا مشرف کی بغاوت کے بعد۔ پہلا دورہ آئی ایس آئی کے چیف ضیاء الدین کی طرف سے اور دوسرا اس کے جانشین اور دوبارہ شدت پسند مذہبی نظریات اپنا لینے والے فوجی محمود احمد کی طرف سے کیا گیا تھا۔ دونوں جرنیل واشنگٹن کا دورہ کرنے اور امریکی نائب وزیر خارجہ ٹام پکرنگ کی جانب سے جھاڑ پلائے جانے کے بعد تعاون کرنے پر آمادہ ہو گئے تھے۔ دونوں ہی مرتبہ انہیں خالی ہاتھ واپس بھیج دیا گیا، اسی طرح کے پریشان کن اور ناگوار جوابات کے ساتھ جس کے لئے ملا عمر بالکل جائز طور پر مشہور ہوتا جا رہا تھا۔ مگر پاکستان نے معاملے کو آگے بڑھانے سے انکار کر دیا۔ وہ افغانستان میں القاعدہ کی موجودگی کے مسئلے پر طالبان سے کسی طرح ناراضگی مول لینے پر تیار نہیں تھے۔ مجھ پر یہ نکتہ اس وقت واضح ہو چکا تھا کہ بن لادن کے حوالے سے ان کی پالیسی بنیادی طور پر امید پر مبنی تھی۔ پاکستان کو امید تھی کہ القاعدہ امریکہ پر دوبارہ حملہ کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے گا، اور اگر کامیاب ہو بھی گیا تو پھر بھی امریکہ اس طرح کا ردعمل ظاہر نہیں کرے گا جس کے نتیجے میں افغانستان میں طالبان کے عروج کو نقصان پہنچ سکے۔

پاکستان کسی حد تک نقصان سے بچنے میں کامیاب ہو گیا۔1999 کے اواخر میں نئی ہزاروی کی تقریبات قریب آنے کے وقت القاعدہ نے بہت سی سنسنی خیز دہشت گردہ کاروائیاں کرنے کی کوشش کی۔ بن لادن کا ایک تربیت یافتہ کارکن کینڈا سے واشنگٹن داخل ہونے والی کاروں سے لدی ہوئی کشتی پر بارود سے بھری ہوئی گاڑی سمیت پکڑا گیا تھا۔ اس کا منصوبہ یہ تھا کہ گاڑی کو لاس اینجلس کے بین الاقوامی ہوائی اڈے پر دھماکے سے اڑا دے گا۔ اردن کی خفیہ ایجنسی نے عمان میں اس ریڈی سن ہوٹل کو بم سے اڑا دینے کے منصوبے کو برقی رو کوتاہ کر

کے(Short Circuiting) ناکام بنادیا، جہاں نئی ہزاریہ کا جشن منانے کے لئے اسرائیلی اور امریکی سیاح بڑی تعداد میں اکٹھے ہونے کا منصوبہ بنا رہے تھے۔ جنوری 2000 کے اوائل میں القاعدہ نے سلیونز نامی ایک عدد امریکی تباہ کار جہاز(destroyer) کو یمن کی بندرگاہ عدن پر بم سے اڑا دینے کی کوشش کی تھی۔ خوش قسمتی سے بارود سے بھری کشتی اپنے بھاری وزن کی بناء پر ہدف کے ساتھ ٹکرانے سے قبل ہی پانی میں ڈوب گئی۔ یہ حقیقت کہ اس طرح کی کوشش کی گئی تھی کئی برسوں تک نامعلوم ہی رہی۔ اکتوبر 2000 میں بن لادن کے تربیت یافتہ کارکنوں نے آخر کار اس حقیقت کو اس وقت درست طور پر عیاں کر کے رکھ دیا جب انہوں نے اسی طرح کا ایک اور حملہ یو ایس ایس کول پر کرتے ہوئے اس کی ایک سمت میں دھاکے سے بہت بڑا سوراخ کر دیا جس کے نتیجے میں 17 امریکی ملاح ہلاک ہو گئے تھے۔ یہاں بھی پاکستانی خوش قسمت ثابت ہوئے کیونکہ امریکی خفیہ اداروں کے اہلکار اس واقعے کی کڑی یقینی طور پر القاعدہ کے ساتھ ملانے میں ناکام ہو گئے۔ تاہم 11 ستمبر یعنی نائن الیون کو قسمت ان کا ساتھ چھوڑ گئی۔

اگرچہ پاکستان میں میری تعیناتی کے تین برسوں کے دوران طالبان ڈیورنڈ لائن کے اس پار اپنے ہی علاقے تک محدود رہے، تاہم جس چیز کو طالبنائزیشن کہا جاتا ہے وہ آہستہ آہستہ منظر عام پر آنے لگی۔ یہ کوئی ایسی چیز نہیں تھی جو طالبان کر رہے تھے بلکہ پاکستان کے شدت پسند جہادیوں کی طرف سے لوگوں پر اپنے انتہاء پسند نظریات نافذ کرنے کی کوشش تھی۔ ان کا مخصوص طریقہ کار ویڈیو کی دوکانوں یا سینما گھروں اور اس طرح فحاشی کے دوسرے علامتی ٹھکانوں پر حملہ کرنا تھا جو مغربی ثقافت کے اثرات پھیلا رہے تھے۔ اس طرح کی سرگرمیاں ان علاقوں میں خاص طور پر واقع ہو رہی تھیں جہاں انتہاء پسندوں کی مساجد یا مدارس بڑی تندہی سے عوام کے مذہبی نظریات تبدیل کرنے یا پھر ان پر اثر انداز ہونے کا کردار ادا کر رہے تھے۔ پاکستان میں میرے قیام کے دوران یہ مخصوص صورتحال صرف اور صرف صوبہ سرحد تک ہی محدود تھی جہاں اس طرح کی سرگرمیوں کی خبریں مقامی اخبارات کی زینت بنتی رہتی تھیں۔ تاہم مجھے سرائیکی پٹی کے علاقے کے حوالے سے کم از کم ایک خبر ضرور یاد ہے۔ یہ خبر مجھ تک جنوبی پنجاب کے ایک سیاستدان کی وساطت سے پہنچی جس نے مجھے شکایت آمیز لہجے میں بتایا تھا کہ طالبنائزیشن اس کے علاقے میں بھی جڑیں پکڑتی جا رہی ہے۔ میں نے جب اس حوالے سے تفصیل پوچھی تو اس

نے اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ ان سرگرمیوں کا سرا ایک مقامی مدرسے کے طالب علموں سے جا ملنے کا امکان ہے۔ اس کو یہ فکر لاحق تھی کہ ان کی سرگرمیاں مقامی آبادی کے اندر کچھ نہ کچھ مقبولیت حاصل کرنے لگی ہیں۔

طالبنائزیشن کا عمل ان دیوبندی مساجد اور مدارس کے تیزی سے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ زور پکڑتا جا رہا تھا جن کو افغانستان سے روسی افواج کی واپسی کے بعد کسی طرح کے ضوابط کے تحت لانے کی کوشش ہی نہیں کی گئی تھی۔ اگرچہ ان مساجد و مدارس کی زیادہ تعداد صوبہ سرحد اور سرائیکی پٹی کے علاقوں میں تھی، تاہم یہ تقریباً ہر جگہ ہی پائے جانے لگے تھے۔ مجھے قراقرم کے پہاڑوں میں واقع شمالی پاکستان کے دور دراز علاقوں میں ایک انتہائی بارونق سرحد قصبے15 گلگت کا اپنا ایک دورہ آج بھی نہیں بھولا۔ میں اپنے مقامی گائیڈ یا رہبر کے ساتھ شہر کے وسط میں واقع دریائے سندھ کے ایک بڑے پل کے اوپر سے گزر رہا تھا جب اس نے پل کے بالکل آخر میں نظر آنے والی بڑی سی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ ''وہ'' اس نے کہا ''ہماری اساسی نظریات والی مسجد ہے'' مجھے بعد میں پتہ چلا کہ گلگت میں شیعوں کی اکثریت آباد تھی اور یہاں کی تاریخ فرقہ ورانہ فسادات سے پر تھی جس کی وجہ سے فرقہ ورانہ ذہنیت رکھنے والے دیوبندیوں کے لئے یہ علاقہ بہت کشش کا حامل تھا۔ کسی کو بھی یقینی طور پر علم نہیں ہے کہ اس وقت یا اب بھی پاکستان میں ایسی مسجدیں کتنی تعداد میں موجود تھیں یا ہیں کیونکہ اس حوالے سے اب تک کوئی جامع سروے نہیں کیا گیا۔ تاہم اگر انتہاء پسند نظریات فروغ دینے والی مساجد گلگت میں بھی موجود ہیں تو پھر غالباً پاکستان کے کسی بھی بڑے یا چھوٹے شہر میں موجود پائی جاسکتی ہیں۔

یہی صورتحال مدرسوں کی ہے۔2003 میں پاکستانی حکومت کے تخمینے کے مطابق ملک میں دس ہزار سے زیادہ مدارس موجود تھے جن میں اکثریت دیوبندیوں کی تھی۔2005 میں مشرف حکومت نے آخر کار ان کو رجسٹرڈ کروانے کا فیصلہ کر لیا۔2007 تک ایک دعوے کے مطابق 14000 سے زیادہ مدارس و مساجد رجسٹرڈ کر لئے گئے تھے۔ کسی کو بھی یقین نہیں تھا کہ حکومت ایسے تمام مدارس/مساجد کو رجسٹرڈ کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی اور یہ تخمینے عام تھے کہ ان کی تعداد بیس ہزار کے قریب جبکہ بعض دیگر تخمینوں کے مطابق اس سے بھی زیادہ تھی۔ تاہم حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کو بھی ابھی تک صحیح تعداد کا اندازہ نہیں ہے۔ نہ ہی یہ امر واضح ہے کہ کتنے ایسے مدارس ہیں جو انتہاء

پسندی کی ذیل میں آتے ہیں، یعنی جہاں جہاد اور فرقہ ورانہ نفرت کی ترغیب کے ساتھ طلباء کی اس حوالے سے بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے کہ وہ ان جہادی تنظیموں میں شمولیت اختیار کریں جن کی اکثریت ان مساجد/مدارس کے ساتھ منسلک ہوتی ہے۔ عام اعداد و شمار کے مطابق یہ تناسب دس تا پندرہ فیصد تک بنتا ہے، تاہم اسے زیادہ سے زیادہ ایک ماہرانہ اندازہ ہی کہا جا سکتا ہے۔ یہ دیو بندی مدارس کے شدت پسند ذیلی ادارے ہی تھے جو افغانستان میں طالبان کے عروج کے زمانے میں ان کے لئے اور میری تعیناتی کے تین برسوں کے دوران پاکستان کے اندر متحرک جہادی اور فرقہ ورانہ تنظیموں کے لئے بھی بھرتی کے اہم مراکز تھے۔ یہ وہی ملا اور ان اداروں کے فارغ التحصیل طلباء ہی تھے جن کے طاقت اور دھونس پر مبنی حربوں نے صوبہ سرحد کے کچھ علاقوں کے علاوہ سرائیکی پٹی کے علاقوں میں بھی طالبان کی اصلاح کو عمومی سطح پر متعارف کروا دیا تھا۔

پاکستان چلانے والے طبقے کو طالبنائزیشن جیسی چیزوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی، تاہم یہ ان کی اپنی ہی پالیسیوں کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ مدرسوں کی تعداد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہوتا جا رہا تھا مگر سرکاری طور پر ان کی روک تھام کے لئے کسی طرح کے اقدامات نہ کئے گئے۔ کوئی بھی ملا یا دیو بندی تنظیم شدت پسند نظریات کے فروغ کے لئے بلا کسی رکاوٹ یا سرکاری مداخلت کے کوئی بھی مسجد یا مدرسہ جب اور جہاں چاہے قائم کر سکتا ہے سرکاری طور پر ان کے خلاف کسی قسم کی کاروائی کرنے یا حتیٰ کہ انہیں کسی قسم کے ضابطے میں لانے میں بھی کوئی دلچسپی نہیں دکھائی گئی کیوں کہ طالبان اور جہادی تنظیمیں جن کے لئے یہاں سے افرادی قوت فراہم کی جاتی تھی پاکستانی ریاست کے نام نہاد اہم مفادات کی تکمیل کرتی نظر آتی تھیں۔ یہ محض دیو بندی نظریات پر مبنی نظام نہیں تھا۔ لشکر طیبہ کو بھی جو پنجاب اور سندھ کے بازاروں سے سرکاری اسکولوں سے بھاگے ہوئے بچوں کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی تھی، میدان میں اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ ان دو تنظیموں کو قانون کے دائرے میں لانے کی کوئی بھی کوشش پاکستان کے نام نہاد خارجہ پالیسی مقاصد کی تکمیل کے منصوبے کو سبوتاژ کر کے رکھ دینے کے خطرات سے پر تھی۔

تاہم ایک مسئلہ اور بھی تھا۔ وہی انتہاء پسند مسجدیں اور مدرسے جو کشمیر اور افغانستان میں پاکستان کے مفادات کی تکمیل میں معاونت کر رہے تھے، وہ ملک کے اندر فرقہ ورانہ نفرتوں کو بھی ہوا دے رہے تھے۔ ان کے دشمنوں کی فہرست میں نہ صرف وہ طاقتیں شامل تھیں جو ان کے

خیال میں مسلمانوں پر مظالم ڈھا رہی تھیں، مثلاً ہندو، یہودی اور عیسائی وغیرہ، بلکہ وہ نام نہاد مسلمان بھی جو ان کے خیال کے مطابق دراصل مسلمان نہیں تھے، مثلاً شیعہ اور احمدی۔ اگرچہ شدت پسند دیو بندی مدارس سے بہت سے طلباء باہر جہاد کے لئے جا چکے تھے، تاہم پیچھے رہ جانے والے طلباء سپاہ صحابہؓ بلکہ اس کی اور بھی زیادہ تشدد پسند قسم کی شاخ لشکر جھنگوی جیسی تنظیموں میں شامل ہو گئے۔ شروع شروع میں پاکستان حکمران دیو بندی نظریات کے پرچار کو شیعوں کی ان بڑھتی ہوئی سرگرمیوں کے توڑ کے طور پر دیکھ رہے تھے جو ایرانی انقلاب کے بعد منظر عام پر آ رہی تھیں۔ اور اگر بات یہیں تک محدود رہتی کہ ان کے اہداف کا نشانہ صرف انتہاء پسند شیعہ حامی تنظیموں، مثلاً سپاہ سے منسلک شدت پسند ہی ہوتے تو کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ تاہم ان کے لئے برداشت کا جذبہ اس وقت تنفر میں تبدیل ہو گیا جب لشکر جھنگوی نے شیعہ فرقے کی مشہور شخصیات کو ہدف بنانے اور قتل کرنے کے ساتھ ہی ان کے مذہبی جلوسوں اور تقریبات کو بھی نشانہ بنانا شروع کر دیا۔ اس صورتحال نے شیعہ فرقے میں شدید خطرے کا احساس پیدا کر دیا، جن کی اکثریت جاگیردارانہ سیاسی نظام کے اندر اہم حکومتی عہدوں پر فائز تھی۔

ایک خالص عملی نکتہء نظر سے مسئلے کو جڑ سے اکھاڑنا مشکل نظر آتا تھا۔ حکومت پاکستان فرقہ ورانہ تنظیموں کو افرادی قوت فراہم کرنے والی مساجد اور مدرسوں پر دھاوا بولنے کے لئے اس لئے تیار نہیں تھی کیونکہ ان کے کشمیر اور افغانستان میں کام کرنے والی جہادی تنظیموں کے ساتھ روابط تھے۔ صورتحال اس وقت اور بھی پیچیدہ ہو گئی جب سپاہ صحابہ نے افغانستان میں طالبان کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے خود اپنے جہادی روانہ کرنا شروع کر دیئے اور مزید پیچیدہ اس وقت جب جہادی اور فرقہ ورانہ دونوں مقاصد کے بیک وقت فروغ کی خصوصی نیت کے تحت جیشِ محمد بھی تشکیل دے دی گئی۔ جیسا کہ ہم نے باب نمبر 03 میں ملاحظہ کیا سپاہ صحابہ نے انتخابی سیاست میں دلچسپی تقریباً اپنے قیام کے وقت سے ہی لینی شروع کر دی تھی۔ پاکستانی حکام نے اس کے اندر پائے جانے والے انتہاء پسندانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی نہیں کی بلکہ سیاسی سرگرمیوں میں اس کی دلچسپی کی بھرپور حمایت کی۔ سپاہ صحابہؓ کی حوصلہ افزائی کی گئی کہ وہ پنجاب کی صوبائی اسمبلی کے لئے اپنے امیدوار میدان میں لائے اور حتیٰ کہ اس کا ایک کامیاب امیدوار تو اس صوبائی حکومت میں وزارت کا عہدہ حاصل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا جو کہ اس وقت پیپلز پارٹی کے ہاتھوں میں

تھی۔ مگر اس کے ساتھ ہی حکومت نے لشکر جھنگوی کے خلاف سخت کاروائی کا آغاز کر دیا کیونکہ اس نے شیعہ فرقے کے خلاف اپنی پر تشدد مہم روکنے سے صاف انکار کر دیا تھا۔

میرے پاکستان پہنچنے تک لشکر جھنگوی کے خلاف کاروائی اپنے عروج پر تھی۔ اخبارات میں اس طرح کی خبریں وقتاً فوقتاً شائع ہوتی رہتی تھیں کہ لشکر کا فلاں کارکن پولیس کی تحویل سے فرار ہوتے ہوئے گولی کا نشانہ بن گیا۔ یہ واقعات اتنے عام ہو گئے تھے کہ ذرائع ابلاغ میں ان کو ''جعلی مقابلوں'' کا نام دیا جانے لگا۔ لشکر جھنگوی کا جو تصور ابھر کر سامنے آیا اس کے مطابق وہ سپاہ صحابہؓ کے ایک سابقہ جنونی قاتل ریاض بسرہ کی قیادت میں متحرک ایک چھوٹی مگر بے رحم تنظیم تھی۔ جو صورتحال بعد کے برسوں میں ایک جانی پہچانی حقیقت بن کر رہ گئی تھی اس کے مطابق لشکر نے حکومت کے جانب سے اپنی سرگرمیوں کو محدود تر کر کے رکھ دینے کی کوششوں کے جواب میں ریاست مخالف کاروائیاں شروع کر دیں۔ اس نے تنظیم کے ارکان کا پیچھا کر کے انہیں مار ڈالنے کی دھمکیاں دے دیں، اور بعض صورتوں میں تو ان دھمکیوں پر عمل بھی کر ڈالا تھا۔ لشکر نے اعلیٰ سطح کے سرکاری افسروں و تنصیبات کو بھی نشانہ بنانے سے دریغ نہ کیا۔ جنوری 1999 میں وزیر اعظم نواز شریف لشکر کے ہاتھوں قتل ہونے سے بال بال بچ گئے۔ ریاض بسرا فرار ہو کر افغانستان پہنچ گیا اور وہاں کچھ عرصہ تک روپوش رہنے کے بعد واپس پاکستان آ گیا اور آخر کار اسے تلاش کرنے کے بعد مئی 2002 میں پولیس کے ہاتھوں ایک اور جعلی مقابلے میں مارا گیا۔

لشکر جھنگوی کے خلاف کی جانے والی سخت کاروائیوں کا مقصد بظاہر اچھی اور بری انتہا پسند تنظیموں کے درمیان تفریق کرنے کی پاکستانی کوشش تھی۔ اچھی تنظیمیں وہ تھیں جو ملک کے خارجہ پالیسی مقاصد کی تکمیل میں معاون تھیں، مثلاً لشکر طیبہ اور جیشِ محمد۔ اگرچہ جیشِ محمد خود پاکستان کے اندر شیعہ اہداف کو اکثر و بیشتر فرقہ ورانہ حملوں کا نشانہ بناتی رہتی تھی مگر حکام بالا یہ سب کچھ اس لئے نظر انداز کر رہے تھے کیونکہ وہ کشمیر کے جہاد میں شریک عمل تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آئی ایس آئی وقتاً فوقتاً مسعود اظہر کے ساتھ گفتگو کرتی رہتی تھی اور اس کے نزدیک اتنا ہی کافی تھا۔ دوسری جانب بری تنظیمیں وہ تھیں جو پاکستان کے خارجہ پالیسی کے مقاصد کی راہ میں حائل تھیں یا پھر ویسے ہی ریاست کے لئے نقصان دہ متصور کی جاتی تھیں۔ لشکر جھنگوی اس زمرے میں آنے والی اولین تنظیم تھی، مگر یہ آخری نہیں ثابت ہونے والی تھی۔ ایک عنصر جو مستقل تھا وہ حکام

کی طرف سے ایسی تمام مساجد و مدارس کے خلاف کاروائی سے ہچکچاہٹ کا اظہار تھا جو اچھی اور بری دونوں تنظیموں کے لئے افرادی قوت کی فراہمی کا وسیلہ تھے۔ جیسا کہ ہم باب نمبر07 میں ملاحظہ کریں گے اس حوالے سے ایک اہم استثنیٰ 2007 کی گرمیوں میں اسلام آباد کے مرکز میں واقع لال مسجد اور اس کے ساتھ متصل مدرسے پر حکومت کی طرف سے کی جانے والی وہ عظیم کاروائی تھی جس کا نتیجہ بہت سے افراد کی ہلاکتوں اور تعلقات عامہ کے عمل میں شدید بگاڑ کی صورت میں نکلا۔ اس طرح کی کاروائی پھر کبھی نہیں دہرائی گئی، محض اس لئے نہیں کہ ایسا کرنے کا نتیجہ مزید پرتشدد کاروائیوں کی صورت میں نکلے گا اور وہ بھی ممکنہ طور پر وسیع پیمانے پر اگر بیک وقت بہت سے اہداف کو نشانہ بنایا جاتا، بلکہ اس لئے کہ اس طرح انہیں فراہم کئے جانے والے اچھے جہادیوں کی رسد روک دی جائے گی۔ پاکستان کو یہ سمجھنے میں بہت مشکل پیش آئی کہ اچھی چیز کے ساتھ بری چیز بھی لینی پڑتی ہے۔

میرے پاکستان میں قیام کے برسوں کے دوران طالبنائزیشن کے حوالے سے وقتاً فوقتاً سامنے آنے والی خبروں سے یہ تاثر ملتا تھا کہ شدت پسند نظریات رکھنے والے دیوبندی مدرسوں کے طلباء مغربی ثقافتی اثرات رکھنے والی قریبی آبادیوں کا صفایا کرنے کی بے ساختہ کوششیں کر رہے تھے۔ تاہم وہ پاکستان میں دیوبندی نظریات سے مماثل شرعی حکمرانی کی باقاعدہ وسیع اور منظّم کوششوں کا حصہ نہیں تھے، کیونکہ اس وقت ایسی کسی چیز کا وجود نہیں تھا۔ اس حوالے سے واحد استثنیٰ صوبہ سرحد میں وادی سوات تھی۔ یہاں 1989 میں جماعت اسلامی کے صوفی محمّد نام کے کے ایک منحرف نے ایک تنظیم کی بنیاد رکھ دی تھی۔ صوفی محمد جماعت کی طرف سے نظام کے اندر رہ کر بنیادی تبدیلی لانے کے فلسفے سے دلبرداشتہ ہو چکا تھا۔ وہ ٹی این ایس ایم کو استعمال کرتے ہوئے سوات کے اندر شریعت کی حکمرانی دوبارہ بحال کرنے پر تیار ہو چکا تھا، چاہے اس کے لئے طاقت کا استعمال ہی کیوں نہ کرنا پڑے۔ مگر ایسا کہنا کرنے کی نسبت آسان تھا؛ سوات وقت محض ایک اور وادی نہیں تھی۔ قدیم درختوں پر مشتمل خوبصورت جنگلات اور ایلپس کی طرح کے دلکش پہاڑوں میں گھری یہ حسین وادی پاکستان کے عوام کے لئے عموماً اور جاگیرداروں کے لئے خصوصاً انتہائی مقبول تفریحی مقام کی حیثیت رکھتی تھی۔

1970 میں مکمل طور پر صوبہ سرحد کے اندر ضم ہونے سے قبل سوات کے صوبائی انتظام

میں آنے والے قبائلی علاقوں (PATA) میں نافذ کردہ عدالتی نظام دراصل شرعی قوانین کے تابع تھا۔1994 میں صوفی محمد نے ایک عدد اعلامیہ جاری کرتے ہوئے یہ مطالبہ کر دیا کہ شریعت نہ صرف وہاں بلکہ پورے مالاکنڈ ڈویژن میں دوبارہ نافذ کر دی جائے کہ سوات کا ایک نسبتاً چھوٹا سا حصہ تھا۔ جب اس مطالبے کو پاکستانی حکام کی طرف سے کوئی پذیرائی نہیں ملی تو اس نے معاملات اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے اپنے پیروکاروں کو حکم دیا کہ وادی کے اندر سرکاری عمارتوں پر قبضہ کر لیا جائے۔ حیران و پریشان حکام بالا نے قبضہ چھڑانے کے لئے وہاں سرکاری نفری روانہ کر دی، مگر وہ طویل عرصہ تک لڑنے کی صلاحیت سے محروم تھے۔ اس کی بجائے انہوں نے صوفی محمد کے شریعت کی بحالی کی بنیادی مطالبے کو تسلیم کرتے ہوئے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ یہ آنے والے برسوں میں حکومت پاکستان کی طرف سے انتہاء پسندوں کے ساتھ کئے جانے والے ان بے شمار معاہدوں میں سے پہلا معاہدہ تھا جن میں وہ بنیاد پرستوں کے مطالبات کے آگے سر تسلیم خم کرتے رہے اور یوں اس طرز عمل کا نتیجہ متعلقہ علاقوں میں ریاستی اختیار کے کمزور ہو جانے کی صورت میں نکلا کیونکہ حکومت لڑائی سے احتراز کرنا چاہتی تھی۔

جب میں پاکستان میں خدمات سرانجام دے رہا تھا تو ٹی این ایس ایم مقتدرہ حلقوں کے لئے دردسر بنی ہوئی تھی، مگر اس سے زیادہ کچھ نہیں نفاذ شریعت کے معاہدے کے بعد آئی ایس کو یہ فریضہ سونپ دیا گیا کہ وہ صوفی محمد کی نگرانی کرنے کے ساتھ ہی اس کے ضرورت سے زیادہ بلند عزائم کی شدت میں بھی کچھ کمی لائے۔ اس عرصے کے دوران ایک موقع پر تو اس نے اسلام آباد کی طرف پیش قدمی کا اعلان بھی کر دیا۔ میں نے اپنے ایک انتہائی باخبر شناسا، سابقہ اعلیٰ فوجی افسر سے سوال کیا کہ سرکاری طور اس صورتحال سے نمٹنے کے لئے کیا اقدامات کئے جا رہے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ آئی ایس آئی صوفی محمد سے پردے کے پیچھے ملاقات کرے گی اور اسے قائل کرے گی کہ اس طرح کی پیش قدمی کرنا اس کے مفاد میں نہیں ہے۔ اسے بہت سی دھمکیوں کا سامنا کرنا پڑے گا یا پھر اس کا اشارہ دے دیا جائے گا۔ میں نے پوچھا کہ اگر ٹی این ایس ایم کے قائد نے ان دھمکیوں کی پرواہ بھی نہ کی اور اپنے پیش قدمی کے منصوبے پر ڈٹا رہا تو پھر کیا ہوگا۔ جنرل مسکرایا اور بولا کہ ساری بات یہیں آ کر ختم ہوتی ہے کہ اس پیش قدمی کو ہر صورت روک دیا جائے۔ یہ تھا آئی ایس آئی کا طریقہ کار۔ اگر پیش قدمی ہو جاتی تو اس کا مطلب تھا کہ فوج

صورتحال سے نمٹنے میں ناکام ہوجاتی۔

مفروضہ طور پر آئی ایس آئی کامیاب ہوگئی تھی کیونکہ یہ پیش قدمی عمل میں نہ آئی۔ سوات کے معاملے کو گیارستمبر کے حملوں تک زیادہ اہمیت نہ دی گئی۔ یہ وہ دن تھا جس دن صوفی محمد نے امریکہ کے بڑھتے ہوئے حملوں کے مقابلے میں طالبان کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے اپنے 7000 پیروکار افغانستان روانہ کردیئے تھے۔ ان میں سے اکثر بعد میں ہونے والی لڑائی کے دوران ہلاک یا قید کردیئے گئے تھے۔ صوفی محمد خود زندہ سلامت رہا، مگر پاکستان حکام نے اس کی پاکستان واپسی پر اسے گرفتار کرنے کا فیصلہ کرلیا اور بعدازاں سوات اور مالاکنڈ کے باقی علاقوں پر بھی اپنا انتظامی اختیار بحال کرنے میں کامیابی حاصل کرلی گئی۔ سوات میں شریعت کی حکمرانی نافذ کروانے کی کوشش میں صوفی محمد بھی لشکر جھنگوی کی طرح ریاست کے خلاف ہوگیا تھا۔ افغانستان میں اپنے جہادی بھیج کر اس نے پاکستانی حکام کو اپنے خلاف کاروائی کا بہانہ فراہم کردیا تھا۔ اس طرح سے وہ نہ صرف ایک درد سے نجات حاصل کرنے کے قابل ہوگئے بلکہ اس طرح سے امریکہ کو ابتدائی طور پر یہ ثبوت بھی فراہم کردیا گیا کہ وہ دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کے ساتھ تعاون کرنے میں سنجیدہ تھے۔ کہانی یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی، اگرچہ صوفی محمد خود تو جیل میں چلا گیا تھا مگر اس کے داماد ملا فضل اللہ نے اس کی غیرموجودگی میں ٹی این ایس ایم کو ازسرنو استوار کرنے کے بعد پاکستانی طالبان کے ساتھ اتحاد کرلیا۔

اگرچہ آئی ایس آئی صوفی محمد کو اسلام آباد کی طرف پیش قدمی نہ کرنے کی ترغیب دینے میں کامیاب ہوتا جارہا تھا کہ یہ شدت پسند مذہبی نظریات رکھنے والوں کو جب بھی چاہے اپنی مرضی کے تابع نہیں کرسکتی تھی۔ طالبان اور القاعدہ کی مثالیں پہلے ہی سامنے آچکی تھیں۔ پاکستان کی طرف سے ملا عمر کو اس بات پر آمادہ کرنے کی کوششیں کہ وہ اسامہ بن لادن کو اس کے حوالے کردے، پہلے ہی ناکام ہوچکی تھیں۔ خود پاکستان کے اندر لشکر طیبہ اور جیش محمد کو پروان چڑھانے کے لئے ان کی ہرطرح سے حوصلہ افزائی کی گئی تھی، مگر جلد ہی یہ ثابت ہوگیا تھا کہ یہ کسی طرح بھی مکمل طور پر اپنے سرپرستوں کے تابع فرمان نہیں تھیں۔ یہ جہادی تنظیمیں جس واحد مقصد پر اپنے سرکاری سرپرستوں سے متفق ہوتی نظر آتی تھیں وہ کشمیر کو بھارتی تسلط سے نجات دلانے کی خواہش تھی۔ لشکر طیبہ خاص طور پر اپنے حجم اور طاقت دونوں میں تیزی سے اضافہ کرتی نظر آرہی تھی؛ مجھے

حیرت ہوتی تھی کہ اگر یہ تنظیم کبھی ریاست کی مخالفت پر اتر آئی تو اس کے کیا نتائج برآمد ہوں گے۔ پھر ایسی فرقہ ورانہ تنظیمیں بھی موجود تھیں جو مسلسل نفرت پھیلانے کے کام میں مصروف تھیں اور جس کے لئے وہ بندوق کا استعمال کرنے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھیں۔ وہ ایک ایسے پاکستان کے ساتھ کس طرح مستقل امن سے رہ سکتی تھیں جہاں رواداری اور عدم تشدد جیسی خصوصیات سے مالا مال صوفی اسلام کے پیروکاروں کی اکثریت کے لئے توپ کے چارے کے طور پر افرادی قوت فراہم کرنے والی انتہاء پسند نظریات کی حامل مساجد اور مدارس کس قسم کی روک تھام اور ریاستی قوانین کی پابندیوں سے آزاد یونہی پروان چڑھتے رہے تو ایک یا دو پھر تین عشروں کے بعد کیا صورتحال ہوگی؟

اسلام آباد میں ایک امریکی سفارت کار کے طور پر رہتے ہوئے مجھے ایک نمایاں خطرے کا احساس لاحق رہتا تھا۔ ایک موقع پر، اپنے گھر پر منعقد کی جانے والی ایک بڑی استقبالیہ تقریب کے بعد، ایک اخباری نمائندے نے جو کہ اس تقریب سے روانہ ہوتے وقت بہت نشے کی حالت میں تھا، اپنے دفتر واپس پہنچ کر اس تقریب کے حوالے سے روئداد بیان کرتے ہوئے نہ صرف میرے گھر کا پتہ بیان کر دیا بلکہ اس حقیقت کی طرف بھی توجہ دلا دی کہ میرا اسسٹنٹ ٹامس پکرنگ اس وقت امریکی محکمہ خارجہ میں تیسرے اہم عہدے پر فائز تھا۔ اس اہم انکشاف پر مجھے اور میری بیوی دونوں کو سخت خطرے کا احساس ہوا کیونکہ اس طرح نہ صرف ہمارے گھر کے محل وقوع کا ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا تھا بلکہ القاعدہ یا حرکت المجاہدین یا اس طرح کی کسی اور تنظیم کو ہمارے گھر پر حملہ کرنے کی اضافی ترغیب بھی دے دی گئی تھی۔ ہماری حفاظت پر مامور سفارت خانے کے حفاظتی عملے کو بھی ہمارے گھر کے ساتھ ملحق علاقوں کی طرف روانہ ہونے دیا گیا تا کہ کسی ممکنہ طور پر مشکوک سرگرمی کا پتہ چلا سکیں۔ انہیں فوری طور پر کسی ایسی سرگرمی کی توقع تو نہیں تھی مگر یہ دیکھ کر انہیں شدید حیرت و پریشانی ہوئی کہ بہت سے لوگ ہماری رہائش گاہ کا جائزہ لیتے نظر آ رہے تھے۔ میں اور میرے اہل خانہ فوری طور پر سفارت خانے کے احاطے میں واقع ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں منتقل ہو گئے جبکہ ہماری حفاظت پر مامور عملہ مشکوک اشخاص کی تصدیق کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گیا۔ اس سوال کا جواب حاصل کرنے میں انہیں پانچ ہفتے لگ گئے۔ پاکستانی حکام نے آخر کار انکشاف کرتے ہوئے بتایا کہ مجرم دراصل طالبان کے سفارت خانے پر

متعین محافظ تھے جن کو ہمارے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ وہ تو خود بھی اس امر کی کھوج لگانے کی کوشش کر رہے تھے کہ کہیں ان کا اپنا سفارت خانہ بھی مشکوک افراد کی زد میں تو نہیں تھا۔ چنانچہ یہ جان کر مجھے یہ احساس ہونا شروع ہوا کہ میں غالباً اسلام آباد کی ایک محفوظ ترین سٹریٹ میں رہ رہا تھا، یعنی ایک ایسی جگہ جہاں ہر کوئی ایک دوسرے پر نگاہ رکھے ہوئے تھا۔

یہ تھا وہ پس منظر جس کے ساتھ میں اس امر کی تحقیق کرنے بیٹھ گیا جسے کہ ملک سے باہر خدمات انجام دینے والے محکمہء خارجہ کے کسی بھی افسر کی طرف سے واشنگٹن بھیجے جانے والے طویل ترین برقی مراسلوں میں سے غالباً ایک مراسلہ کہا جا سکتا تھا، اور جس میں پاکستان کے اندر انتہا پسند اسلامی نظریات کے فروغ اور اس کے نتیجے میں ریاست کو لاحق خطرات سے متعلق اندازوں کا بیان کیا گیا تھا۔ اور حالات مجھے اس وقت بھی ایسے ہی محسوس ہو رہے تھے جیسے کہ اب نظر آتے ہیں۔ پاکستان کے مقتدر سیاسی حلقوں نے، سویلین اور فوجی دونوں، انتہاء پسند اسلامی جہادیوں کو ریاستی مقاصد کی تکمیل کے لئے پھلنے پھولنے کی اجازت دی تھی۔ ان کے خیال میں انتہاء پسند مذہبی عناصر خارجہ پالیسی مفادات کے حصول کا، خاص طور پر انڈیا کے حوالے سے، ایک سستا اور بظاہر انتہائی موثر وسیلہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ ان کے تابع فرمان رہیں گے، اگر چہ اس کے برعکس صورتحال کی ابتدائی علامات پہلے سے ہی ظاہر ہو چکی تھیں۔ اگر چہ یہ جہادی قوتیں پاکستان کے مقتدر حلقوں کے ساتھ بعض مشترکہ مقاصد کی پیروی پر متفق نظر آتی تھیں مگر ان کا باہمی اتحاد بہت کمزور بنیادوں پر قائم تھا جو کہ ہر وقت ٹوٹنے کے خطرے سے دوچار تھا، جیسا کہ اس سے قبل لشکر جھنگوی کے ساتھ ہو چکا تھا۔ ریاست کی طرف سے ان کو پروان چڑھنے یا پھلنے پھولنے کی جتنی زیادہ کھلی چھٹی ملتی جا رہی تھی انہیں تابع فرمان رکھنا اتنا ہی مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے اس طرح کے کوئی قابل فہم آثار نظر نہیں آ رہے تھے کہ دکھ کے مارے ہوئے سویلین دفاعی اہلکار، خصوصاً پولیس اس طرح کے کسی خطرے سے نمٹنے کے اہل ہو سکیں گے۔ آخر کار یہ ذمہ داری فوج پر ہی آنی تھی، جو پاکستان کا پیشہ ورانہ بنیادوں پر استوار واحد قومی ادارہ ہے، اور جسے اپنے گھمنڈ میں یہ یقین تھا کہ وہ ان ساری طاقتوں کو کنٹرول کر سکتی تھی مگر اسے گرد منڈلاتے خطرات کی مناسبت سے موقع کی نزاکت کا احساس نہ ہو سکا۔

اگر پیچھے مڑ کر دیکھا جائے تو اس برقی مراسلے کا سب سے دلچسپ پہلو یہ تھا کہ یہ ایسے

وقت میں تحریر کیا گیا تھا جب کہ طالبان یا القاعدہ کا ایک بھی تربیت یافتہ کارکن پاکستانی سرزمین پر موجود نہیں تھا۔ مستقبل کی پیشین گوئی نہ کی گئی تھی نہ کی جاسکتی تھی میرے تجزیئے کے پس پردہ یہ مفروضہ کارفرما تھا کہ طالبان اور القاعدہ محض افغانستان تک محدود رہ جانے والی قوتیں ثابت ہوں گی۔ مجھے خطرے کا جو احساس ہو رہا تھا اس کا ان سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ اس کا محور محض وہ طاقتیں تھیں جنہوں نے پاکستان کی سرزمین سے ہی جنم لیا تھا اور یہاں پر پہلے سے ہی متحرک تھیں۔ جب میں جولائی 2001 میں اپنے وطن واپس لوٹ آیا، ایک مسحور کن ملک کو چھوڑتے ہوئے اداس مگر ساتھ ہی زندہ سلامت واپس پہنچ جانے کی خوشی کے ساتھ، تو مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ صورتحال بدتر ہونے لگی ہے۔ بہت ہی زیادہ بدتر۔

MashalBooks.org

6

قبائلی علاقہ جات نائن الیون، اور پاکستانی طالبان کا ظہور

مقامات تبدیل ہوتے ہیں۔ جب میں پاکستان میں خدمات انجام دے رہا تھا تو قبائلی علاقہ جات سیاسی لحاظ سے بالکل غیر اہم تھے۔ وہاں کوئی خاص سرگرمی نہیں دیکھی جا رہی تھی، کم سے کم واشنگٹن کی توجہ کے قابل تو بالکل نہیں۔ اسلام آباد میں میرے قیام کے تین برسوں کے دوران، سفارت خانے کے سیاسی شعبے نے اس علاقے میں ہونے والے واقعات کے حوالے سے صرف اور صرف ایک ہی ٹیلی گرام تیار کر کے بھجوایا تھا۔ اس میں کرم ایجنسی میں فرقہ ورانہ کشیدگی کی صورتحال کا بیان تھا جہاں کہ شیعوں کی ایک بڑی تعداد اس سنّی اکثریت پر مشتمل آبادی کے درمیان رہ رہی تھی جن میں زیادہ تر دیوبندی نظریئے کے پیروکار شامل تھے۔ جیسا کہ پہلے یہ نکتہ عیاں کیا جا چکا ہے کہ برطانیہ نے قبائلی علاقہ جات بنیادی طور پر اس نکتہ نظر سے تشکیل دیئے تھے تا کہ یہ برطانوی سلطنت اور افغانستان کے درمیان ایک حتمی حفاظتی ڈھال (Buffer zone) کا کام کر سکیں۔ برطانیہ اس علاقے کا انتظام ایک سیاسی نمائندے یا پولیٹیکل ایجنٹ کے ذریعے چلاتا تھا، تاہم مقامی پشتونوں کو بڑی حد تک نظریہ و عمل کی آزادی عطا کرتے ہوئے انہیں یہ اختیار دے دیا گیا کہ وہ اپنے معاملات کا تعین مقامی قبائلی کونسلوں کے ذریعے کر سکیں۔ یہ رواج وہاں صدیوں سے چلا آ رہا تھا، جب پاکستان کا قیام عمل میں آیا تو پاکستانی حکام نے برطانوی پالیسیوں کا تسلسل جاری رکھا۔ قبائل کے ساتھ ہونے والے معاہدے کے تحت وہاں باقاعدہ پاکستانی فوج تعینات نہ کی گئی۔ علاقائی حدود کے دفاع کی ذمہ داری ایک ناقص تربیت یافتہ، مقامی طور پر بھرتی کردہ اس پیرا ملٹری فورس کے سپرد کر دی گئی جسے فرنٹیئر کور (ایف سی) کا نام دیا گیا۔ تاہم اس کے افسروں کا

تقرر با قاعدہ فوج کے اندر سے کیا جاتا جس کی صفوں کے اندر اس طرح کی تقرری کے احکامات کو پیشہ ورانہ ترقی کے مواقع کی موت تصور کیا جاتا تھا۔

میں نے دو مرتبہ قبائلی علاقہ جات کا دورہ کیا اور دونوں مرتبہ یہ دورہ تفریح کے طور پر نہایت پتھریلے اور ناہموار راستوں پر مشتمل تاریخی درہ خیبر سے گزرتے ہوئے کیا۔ اپنے پہلے تفریحی دورے کے دوران جو کہ 1999 کے اوائل کی بات ہے، ہم لوگ مچنی پوائنٹ تک گئے تھے جو کہ طورخم کے اس پار افغان سرحد کے اوپر اچٹتی نگاہ ڈالتی ہوئی ایک راس کوہی (promontory) پر واقع ایف سی کی ایک چھوٹی سی سرحدی چوکی ہے، جہاں سے کہ دوسری طرف واقع پتھریلے، پہاڑی افغان دیہاتوں کا خوبصورت منظر صاف دکھائی دیتا ہے۔ یہ ایک خاموش اور پرسکون مقام ہے، طالبان سرحد سے بہت دور مصروف عمل تھے اور پاکستان ان کا سب سے قریبی حلیف تھا۔ اپنی نوعیت کا واحد اہم واقعہ اس وقت پیش آیا جب ہم واپس پشاور کی جانب گامزن تھے۔ ہم جیسے ہی تیزی سے اترتی اور چڑھتی ہوئی سڑک پر درے سے نیچے اترے تو مجھے وہ چیز نظر آئی جو بالکل ایسے لگ رہی تھی جیسے دور افق کے اس پار چیونٹیوں کی کوئی قطار چل رہی ہو۔ ہم جیسے ہی نزدیک آئے تو آخر کار واضح ہو گیا کہ وہ مرد تھے، سینکڑوں کی تعداد میں ایک ہی قطار میں دور اتنے فاصلے تک پھیلتے ہوئے جہاں تک نگاہ جا سکتی تھی، اس پہاڑی سلسلے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے جو ہماری سڑک تک آملتا تھا۔

اپنی انتہائی وسیع تعداد کے علاوہ، ان کی موجودگی کو جو ایک اور چیز نمایاں بنا رہی تھی وہ ایک ایسی چیز تھی جسے وہ اپنے ساتھ، زیادہ تر پیٹھ پر باندھ کر، اٹھائے چل رہے تھے۔ یہ ایک پورا کا پورا چلتا پھرتا شعبہ جاتی سٹور تھا۔ بالکل نیا سٹیریو ساز و سامان، اچھے سائز کے ٹی۔وی سیٹ، مخصوص قسم کے ویڈیو ریکارڈر، اور حتیٰ کہ چھوٹے سائز کے یورپین ریفریجریٹرز کا بیڑہ۔ ہم بہت سے سائیکل سواروں کے پاس سے بھی گزرے جن میں سے ایک نے تین یا چار اضافی سائیکلیں اپنی سائیکل کے اطراف اس طرح سے باندھی ہوئی تھیں کہ ان پہیئے بھی زمین پر ساتھ ساتھ حرکت کر رہے تھے۔ وہ سب اسمگلر تھے جو کہ ان بازاروں کی طرف بڑھ رہے تھے جو پشاور خیبر ٹرائیل ایجنسی کے درمیان والی سڑک کے ساتھ ساتھ قطار میں لگے ہوئے افغان پناہ گزین خیموں کے اندر اچانک نمودار ہو گئے تھے۔ میں نے کبھی بھی اس بات کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی کہ یہ

سب سامان کہاں سے آیا تھا، اگرچہ افغانستان کے اندر کوئی گروہ، مفروضہ طور پر طالبان یقیناً اس سارے کاروبار پر منافع کما رہے ہوں گے۔ یہ پہلو اس حقیقت سے واضح ہوتا تھا کہ پاکستانی حکام کو، وہ فریق جو یقیناً کوئی پیسے نہیں کما رہا تھا، اسے روکنے کی کوششوں سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

افغانستان پر روسی قبضے کے دوران قبائلی علاقہ جات بالکل ہی مختلف نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس دور میں سخت پتھریلے راستوں سے گزرتے ہوئے مرد ریفریجریٹرز کی بجائے رائفلیں اٹھائے الٹی سمت میں رواں دواں ہوتے تھے۔ ڈیورنڈ لائن کے اس پار سوویت فوجوں کی موجودگی کے باوجود مجاہدین کو افغانستان کے اندر گھستے ہوئے کسی قسم کی کوئی رکاوٹ پیش نہیں آئی تھی کیونکہ دونوں ممالک کے درمیان سرحد اتنی مسام دار تھی جیسے کہ چھلنی۔ دو اہم چوکیوں کے علاوہ، ایک طور خم پر اور دوسری بلوچستان میں چمن کے مقام پر کوئٹہ سے قندھار جانے والی بڑی شاہراہ کے کنارے، بیس ایسے مقامات سے گزرنا پڑتا ہے جہاں کسٹم اور پولیس کے حکام سے واسطہ پڑتا ہے۔ اگرچہ راستے میں سرکاری چوکیاں بھی آتی ہیں، مگر سرحدی علاقے کے شمال کی طرف 111 عدد جانے پہچانے مگر بغیر کسی عملے کے ایسے مقامات بھی آتے ہیں جہاں سے آپ کو گزر کر دوسرے علاقے میں داخل ہونا ہوتا ہے اور جو شمالی قبائلی علاقہ جات اور صوبہ سرحد کا احاطہ کرتے ہیں۔ اور اسی طرح جنوبی قبائلی علاقہ جات اور بلوچستان کا احاطہ کرنے والے مزید 229 مقامات ایسے ہیں جہاں پر آپ کو ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں داخل ہونا ہوتا ہے۔ راستے میں عملی طور پر تقریباً سینکڑوں فٹ پاتھ اور بکریوں کی گزرگاہیں ایسی آتی ہیں جو آڑی ترچھی ہو کر سرحد کے آر پار ہوتی ہیں، جن کو زیادہ تر وہ مقامی پشتون استعمال کرتے ہیں جن کے لئے ڈیورنڈ لائن محض ایک تصوراتی چیز ہے۔ گیارہ ستمبر کے حملوں کے فوری بعد آنے والے مہینوں کے دوران مسلح افراد اچھی خاصی تعداد میں آپ کو ایک بار پھر انہیں راستوں اور پگڈنڈیوں پر چلتے نظر آتے ہیں۔ مگر یہ وہ لوگ تھے جو اپنی جانیں بچانے کے لئے بھاگ رہے تھے۔

کینیڈی ایسوسی ایشن کی طرح بہت سے امریکیوں کو یاد ہے کہ جب ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ساتھ طیارے ٹکرائے گئے تھے تو اس وقت وہ کیا کر رہے تھے۔ میں محکمہ خارجہ کے کانفرنس روم میں ایک سٹاف میٹنگ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ میں نیٹو (NATO) کے ایک دفتر کا انتظام سنبھالنے کے لئے واشنگٹن واپس آ گیا تھا اور یورپین بیورو آفس کے اپنے ساتھی ڈائریکٹرز کے

ساتھ بڑے صبر کے ساتھ بیٹھے ہوئے نائب وزیر خارجہ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کئی منٹ کی تاخیر سے آئی اور معذرت کرتے ہوئے کہنے لگی کہ وہ اس لئے دیر سے آئی تھی کیونکہ اسے خبر ملی تھی کہ ایک طیارہ ابھی ابھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرا گیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ آیا یہ دہشت گردی تھی تو اس نے جواب دیا کہ اسے نہیں معلوم۔ ہم نے اپنا اجلاس جاری رکھا اور یہ ابھی اختتام کے قریب ہی تھا کہ ایک بیورو سیکرٹری بھاگتا ہوا آیا اور کہنے لگا کہ ایک اور جہاز بھی ورلڈ ٹریڈ سنٹر سے ٹکرا گیا ہے اور یہ کہ پینٹاگون بھی حملے کی زد میں آ گیا ہے۔ تقریباً جیسے کوئی اشارہ پا کر لاؤڈ سپیکر میں جیسے اچانک جان پڑ گئی اور ہمیں حکم دیا گیا کہ ہم فوراً ہی عمارت سے باہر نکل جائیں۔

یہ ایک حیرت انگیز اتفاق تھا کہ آئی ایس آئی کا سربراہ جنرل محمود بھی اس انتہائی دہشتناک دن کسی مشاورت کے سلسلے میں واشنگٹن آیا ہوا تھا۔ اس صبح کو وہ سینٹ انٹیلی جنس کمیٹی کے ارکان کے ساتھ اجلاس کے لئے کیپیٹل ہل میں موجود تھا۔ وہ عمارتیں خالی کرنے کے لئے خبردار کرنے والے اعلانات سے جو کہ اس صبح واشنگٹن کی تمام سرکاری عمارتوں میں سنائی دے رہے تھے، سراسیمہ ہو کر باقی ماندہ وفاقی حکام کے ساتھ کہیں بھاگ گیا تھا۔ اسے اگلی صبح ہی وزارت خارجہ کی طرف سے ڈپٹی وزیر خارجہ رچرڈ آرمیٹج کے ساتھ ایک ملاقات کے لئے طلب کر لیا گیا۔ اگرچہ اس ملاقات کے حوالے سے دیئے گئے بعض بیانات کے مطابق آرمیٹج نے محمود کو واضح طور پر بتا دیا تھا کہ پاکستان کو یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ آیا وہ امریکہ کے ساتھ ہے یا اس کے خلاف، یا پھر اس نے دھمکی دی تھی کہ پاکستان پر بمباری کر کے اسے پتھر کے دور میں پہنچا دیا جائے گا، تاہم اس ملاقات کا براہ راست علم رکھنے والے ایک پاکستانی ذریعے کے مطابق ماحول بہت المناک دکھائی دیتا تھا اور آرمیٹج نے بس یہی کہا تھا کہ امریکہ مدد کے لئے اپنے دوستوں کی طرف رجوع کرے گا۔ سیکرٹری کولن پاول نے بھی یہی پیغام دینے کے لئے اسی دن مشرف سے رابطہ کیا تھا۔

اس ملاقات کے دوران جو کچھ بھی کہا گیا، تاہم پاکستان نے تعاون کرنے کے فیصلے میں دیر نہیں لگائی۔ ورلڈ ٹریڈ سنٹر پر حملہ تاریخ کا سب سے ڈرامائی دہشت گرد حملہ تھا۔ مشرف کو فوراً احساس ہو گیا تھا کہ امریکہ کا ردعمل فوری اور انتقامی ہو سکتا ہے۔ یہ بھی واضح تھا کہ افغانستان پر پاکستان کا موقف جو کہ طالبان کی حمایت پر مبنی تھا، مستقل خطرے سے دوچار ہو چکا تھا۔ اگر تو طالبان بن لادن کو فوری طور پر امریکہ کے حوالے کرنے پر تیار نہیں ہو جاتے تو اس بات کا پورا

خطرہ موجود تھا کہ امریکہ جنگ کا آغاز کر دے گا۔ اس امر کا امکان کہ پاکستان نے طالبان پر جو سات سال تک طویل سرمایہ کاری کی تھی وہ ساری کی ساتھ ضائع ہو سکتی تھی کافی خوفناک لگتا تھا۔ تاہم امریکہ پاکستان کا دشمن بن جائے یہ اس سے بھی بدتر امکان تھا۔ مشرف نے اپنی یادداشتوں میں اس امر کا اعتراف کیا ہے کہ اسے یقین تھا کہ امریکہ درحقیقت پاکستان پر حملہ کر بھی سکتا تھا۔ تاہم اگر امریکہ نے پاکستان کو بمباری کر کے پتھر کے زمانے میں پہنچا دینے کی کوشش نہیں بھی کی تو اس کے پاس بہت سے متبادل طریقے خود پر دہشت گرد ریاست کا ٹھپہ لگوانے یا بین الاقوامی مالیاتی اداروں سے اپنی امداد رکوا دینے کا کوئی شوق نہیں تھا۔ اس کے علاوہ اس صورتحال میں بھارتی عنصر کو بھی سامنے رکھنا تھا۔ نیو دہلی نے امریکہ کو افغانستان پر حملے کرنے کے لئے اپنے فوجی اڈے استعمال کرنے کی پیش کش کرنے میں ذرا بھی دیر نہیں لگائی۔ پاکستان کو اس امکان سے بھی یقیناً شدید پریشانی لاحق تھی کہ ہوسکتا ہے امریکہ بھارت کے ساتھ مل کر پاکستان کے خلاف مشترکہ موقف یا حکمت عملی اپنا لے۔ اس لئے اس کے نزدیک بہتر یہی تھا کہ اس انتہائی بدتر صورتحال سے بہترین طور پر استفادہ کرنے کے لئے امریکہ کا ساتھ دے دیا جائے۔

پاکستان کو 13 ستمبر کے روز پیش کی جانے والی مطالبات کی فہرست سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ امریکہ کاروائی میں کتنا سنجیدہ تھا۔ پاکستان سے مطالبہ کر دیا گیا تھا کہ وہ امریکہ کو اپنے علاقے کے اوپر سے پرواز کر کے گزر جانے کے بلا استثناء حقوق دے دے۔ امریکہ نے پاکستان سے درخواست کی تھی کہ وہ اسے اپنی بندرگاہوں، ہوائی اڈوں، اور کلیدی نوعیت کی سرحدی چوکیوں تک رسائی فراہم کر دے۔ پاکستان کو بتا دیا گیا تھا کہ اسے طالبان سے تعلقات منقطع کرنے پڑیں گے اور مدارس کے طلباء کو افغانستان کے اندر گھس کر سرحد کے اس پار طالبان کی صفوں میں شامل ہونے سے روکنا ہوگا۔ امریکہ نے مطالبہ کیا تھا کہ پاکستان القاعدہ کے لئے اپنی سرحدیں بند کر دے اور اس تنظیم کو ہر طرح کی رسد کی فراہمی روک دے۔ یہ آخری مطالبہ جس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان ہمیشہ سے ہی القاعدہ کی بڑھ چڑھ کر حمایت کرتا رہا ہے، اس امر کی طرف اشارہ کر رہا تھا کہ اس وقت امریکہ پاکستان کے ارادوں اور طرز عمل کو کس طرح شک کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ جیسا کہ میں نے گزشتہ باب میں دلیل دی ہے یہ شک تقریباً یقینی طور پر کسی بھی بنیاد سے محروم تھا۔ نائن الیون سے قبل پاکستان کے پاس ہر طرح سے یہ جواز موجود

تھا کہ وہ بن لادن سے دور رہے کیوں کہ امریکہ کے خلاف القاعدہ کے منصوبے اور عزائم کوئی راز نہیں تھے، اور اگر ان پر عملدرآمد ہو جاتا تو اس سے افغانستان کے اندر پاکستان کا مفاد بھی یقیناً مجروح ہو جاتا تھا۔

پاکستان بعض انتہائی شدید نوعیت کے امریکی مطالبات، خاص طور پر اس کی فضائی حدود میں آزادانہ پرواز اور اڈوں کی سہولت جیسی فرمائشوں سے چکرا کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اس کے جواب میں ذرا محدود تر مگر ابھی بھی فراخدلانہ سہولتوں کی پیش کش کر دی گئی جن پر امریکہ نے فوراً ہی آمادگی ظاہر کر دی۔ تاہم مشرف حیرت انگیز طور پر ایک نکتے پر مسلسل بضد رہا: امریکہ اس وقت تک حملے کا آغاز نہ کرے جب تک پاکستان اسامہ بن لادن کو حوالے کرنے کے لئے ملا عمر کو آمادہ کرنے کا ایک آخری موقع حاصل نہیں کر لیتا۔ چنانچہ یہ موقع فراہم کر دیا گیا اور پاکستان واپسی پر مشرف کو ایک بار پھر قندھار روانہ کر دیا گیا۔ ماضی کی طرح اس بھی کوئی نتیجہ برآمد نہ ہوا۔ اس مرتبہ ملا عمر نے حملوں میں القاعدہ کے ملوث ہونے کا ثبوت طلب کر لیا تھا اور یوں ایک مرتبہ پھر وقت کا ضیاع دیکھنے میں آیا۔ ستمبر کے آخر میں ایک دوسری اور حتمی کوشش بھی ناکام ہو گئی۔ پاکستانی صحافی احمد رشید کے خیال کے مطابق محمود نے، جو کہ دوبارہ بنیاد پرستی کے راستے پر چل پڑا تھا، دراصل ملا عمر کو ثابت قدم رہنے کی تلقین کی تھی، تاہم اس امر کا امکان اس لئے نہیں تھا کیونکہ محمود کو بھی یہ علم تھا کہ اگر طالبان اپنی راہیں القاعدہ سے جدا کر لیتے تو اس سے پاکستان کو بہت فائدہ ہوتا اور اس کے برعکس صورت میں اچھا خاصا نقصان۔ بہرحال اصل میں جو کچھ بھی ہوا، تاہم یہ ایک حقیقت تھی کہ ملا عمر نے اسامہ بن لادن کا تکلیف دہ انجام تک ساتھ دینے کا فیصلہ کر لیا تھا اور یوں امریکہ کے لئے طالبان حکومت پر حملے کی راہ ہموار ہو گئی جو 7 اکتوبر کو نائن الیون کے واقعے کے ایک ماہ مکمل ہونے سے پہلے ہی شروع کر دیا گیا۔

جیسے جیسے آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کے مراحل طے ہونے لگے، یہ امر واضح ہوتا چلا گیا کہ امریکہ دراصل شمالی اتحاد کے فضائی دستے کے طور پر کام کرتے ہوئے طالبان کے سامنے کے محاذوں پر تباہ کن حملے کرتا جا رہا تھا جن کی زد میں آ کر طالبان کے قدم اکھڑنے لگے تھے۔ یہ نکتہ ذہن میں رہے کہ اس وقت طالبان ایک میدانی فوج کی طرح تھے یا پھر جیسا کہ وہ بعد ازاں جلد ہی بن گئے تھے۔ 9 نومبر تک مزار شریف کا شمال مغربی کلیدی محاذ بھی پسپائی اختیار کر گیا۔ تین

روز بعد کابل بھی طالبان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ 7 دسمبر کو قندھار میں بھی ہتھیار ڈال دیئے گئے تھے اور اس سے اگلے ماہ خود ملا عمر بھی گرفتاری سے بال بال بچتے ہوئے صوبہ ہلمند کے پہاڑوں میں واقع اپنے خفیہ ٹھکانے سے موٹر سائیکل پر بیٹھ کر فرار ہو گیا۔ اس دوران وہ شخص جس کی وجہ اسے اقتدار سے محروم ہونا پڑا تھا خود بھی اپنی زندگی بچانے کے لئے بھاگ رہا تھا۔ اسامہ بن لادن شمالی اتحاد کی فوج کے قریب آتے وقت افغانستان کے شمالی شہر جلال آباد میں مقیم تھا۔ وہ اور اس کے کچھ ساتھی، اپنے طالبان محافظوں کی نگرانی میں جنوب کی طرف واقع تورا بورا کے نام سے معروف پہاڑی غاروں کے ایک وسیع سلسلے کی طرف پسپا ہو گئے۔ جلد ہی شمالی اتحاد نے اس جگہ کا محاصرہ کر لیا اور امریکی جنگی جہازوں سے بھسم کر کے رکھ دینے والی بمباری شروع کر دی گئی۔ ایک موقع پر تو 15000 پاؤنڈ وزنی بم سی-130 کار گو طیارے کی پچھلی جانب سے لڑھکا کر پھینک دیا گیا۔ بن لادن یقیناً اپنے انجام کو پہنچ گیا تھا۔ مگر جب دو ہفتوں کی تابڑ توڑ بمباری کے بعد آخر کار دھواں صاف ہو گیا اور محصور لوگ غاروں سے باہر نکل آئے تو بن لادن کا کوئی نام و نشان بھی نہیں تھا۔

پسپائی اختیار کرتے ہوئے بعض طالبان جنوبی افغانستان کے دور دراز پہاڑی مورچوں میں پناہ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ تاہم زیادہ تر طالبان اور القاعدہ جہادی ڈیورنڈ لائن کی طرف جنوب اور مشرق کے علاقوں میں فرار ہو گئے۔ تاہم جو بات پوری طرح واضح نہیں ہو سکی وہ یہ ہے کہ اس طرف کونسی چیز یا طاقت ان کی منتظر تھی۔ اس امر کا کچھ ثبوت موجود ہے کہ اس عرصے کے دوران پاکستان نے قبائلی علاقوں کی طرف کچھ فوجیں روانہ کی تھیں جن کا واضح مقصد سرحدوں کی نگرانی کرنا تھا اگرچہ تعینات کردہ فوجیوں کی تعداد کے حوالے سے شدید اختلافات پایا جاتا ہے۔ تاہم تعداد کچھ بھی تھی، وہ اپنے مقصد میں بظاہر اتنی کامیابی حاصل نہیں کر سکے تھے۔ احمد رشید کا دعویٰ ہے کہ اگرچہ القاعدہ کے چند ایک سپاہیوں کو قید کر لیا گیا تھا، تاہم فرار ہوتے ہوئے طالبان فوجیوں کو بغیر نقصان پہنچائے جانے دیا گیا تھا۔ افغانستان میں تعینات امریکی افسروں نے اسے کچھ عرصہ بعد بتایا تھا کہ ان کو یقین تھا کہ پاکستان نے زیادہ تر سرحد جان بوجھ کر نگرانی کے بغیر چھوڑ دی تھی۔ تاہم یو۔ ایس سنٹرل کمانڈ نے اس وقت پاکستان کی طرف سے کی جانے والی کوششوں کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا تھا اور سنٹرل کمانڈ کے اسلام آباد میں متعین رابطہ افسر نے

پاکستان کی طرف سے تعاون کی کوششوں کا بہت ہی ستائشی احوال میرین کور گزٹ (Marine Corps Gazwtte) میں ''پاکستان۔این اینڈیورنگ فرینڈ'' کے عنوان سے پیش کیا تھا۔افغانستان کے لئے ان کی نگرانی کا کام جوئے شیر لانے سے کم نہیں تھا۔تاہم پاکستان کے تعاون کے حوالے سے امریکہ کی طرف سے قبل از وقت مبالغہ آرائی کے باوجود اس امر کا کوئی ٹھوس ثبوت نہیں ملتا کہ پاکستان نے ہرکولیس کی طرح کی کوئی معمولی سی کوشش بھی کی ہوگی۔

شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسامہ بن لادن تورا بورا سے فرار ہوکر جنوب کی طرف کچھ میل کے فاصلے پر ڈیورنڈ لائن کے دوسری طرف کرم ایجنسی میں چلا گیا ہوگا۔بعض واقعات کے مطابق وہ کچھ دیر کے لئے دوبارہ افغانستان داخل ہوکر وہاں سے شمالی وزیرستان چلا گیا تھا جہاں اس پر مقدمہ کی کاروائی بالکل ہی سرد خانے کی نذر ہوکر رہ گئی۔القاعدہ کے دیگر اہم تربیت یافتہ کارکن بھی ڈیورنڈ لائن کے دوسری طرف چلے گئے تھے،تاہم لگتا ہے کہ وہ قبائلی علاقہ میں زیادہ عرصہ قیام پذیر نہیں رہے تھے۔اس کی بجائے وہ پاکستان کے اندر نمایاں مقامات کی طرف چلے گئے اور آخر کار اپنے فطری انجام یعنی انصاف کے کٹہرے میں لائے گئے۔القاعدہ کے اندرونی حلقوں کا اہم رکن ابوزبیدہ زیر حراست لیا جانے والا پہلا شخص تھا۔وہ پنجاب کے شہر فیصل آباد میں مارچ 2002 میں فائرنگ کے تبادلے میں شدید زخمی ہوگیا تھا۔یو۔ایس ایس کول پر ہونے والے بم دھماکے کے ایک اہم مشتبہ کردار خالد العطش کو اس سے اگلے ماہ کراچی سے گرفتار کرلیا گیا۔ القاعدہ رہنما رمزی بن الشبھ ستمبر میں کراچی سے پکڑا گیا۔سب سے بڑی مچھلی اور القاعدہ کی تیسری اہم شخصیت خالد شیخ محمد کا جو کہ گیارہ ستمبر کے حملوں کی منصوبہ بندی میں پیش پیش تھا۔آنے والے مارچ میں اسلام آباد سے آتے ہوئے راولپنڈی میں تلاش بسیار کے بعد اس وقت سراغ مل گیا جب اسے اس کے بستر سے یک لخت اٹھا لیا گیا۔ بعد ازاں پاکستان حکام نے ان کو اور درجنوں اور کم اہم القاعدہ جہادیوں کو جو کہ ان کے ساتھ ہی گرفتار کئے گئے تھے امریکہ کے حوالے کردیا تھا۔

یہ گرفتاریاں بظاہر ایسا لگتا ہے کہ پاکستانی حکام کے مکمل تعاون سے عمل میں لائی گئی تھیں۔وہ غالباً کم سے کم یہی کچھ کرسکتے تھے اور ابھی تک اپنے امریکی سرپرستوں کو یہ یقین دلاتے رہتے ہیں کہ وہ دہشت گردی کے خلاف عالمی جنگ میں ان کے ساتھ تعاون کررہے تھے۔ان

سب گرفتاریوں کو جو حقیقت ایک ہی کڑی میں منسلک کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ یہ سب گرفتاریاں خود پاکستان کے اندر، کراچی اور پنجاب کے دیگر بڑے شہروں سے کی گئی تھیں۔ القاعدہ کے بعض اہم عہدیدار یا کارکن ان بڑے شہری علاقوں کی طرف اس لئے کھنچے چلے آئے تھے کیونکہ ان کا خیال تھا اس طرح باہر کی دنیا سے ان کا رابطہ بھی زیادہ تیزی سے ممکن ہوگا اور دوسرے ان کو غالباً یہ غلط فہمی تھی، جیسا کہ بعد میں ثابت ہوا، کہ یہ چھپنے کے لئے محفوظ پناہ گاہیں تھیں۔ وہاں ان کی مدد کے لئے باہمی تائید و تعاون کا ایک بظاہر مربوط سلسلہ عمل موجود تھا پاکستان میں میرے قیام کے تین برسوں کے دوران ایک یہ مفروضہ بھی عام تھا کہ القاعدہ کے تربیت یافتہ کارکنان جب بھی چاہیں بلا روک ٹوک یہاں آجا سکتے ہیں۔ یہ پریشانی بھی رہتی تھی کہ القاعدہ اگست1998 میں اپنے ٹھکانے پر ہونے والے کروز میزائل کے اس حملے کے جواب میں پاکستان میں امریکی سفارت کاروں کو انتقامی کاروائی کا نشانہ بنا سکتی ہے جس نے واشنگٹن کو حملے سے کچھ عرصہ پہلے اپنا سفارت خانہ اور قونصل خانے کی عمارتیں خالی کروانے پر مجبور کر دیا تھا۔ یہ پریشانی بھی تھی کہ القاعدہ اس ایئر فورس ون طیارے کو گرانے کی کوشش بھی کر سکتی ہے جو مارچ2000 میں صدر کلنٹن کے دورۂ اسلام آباد کے موقع پر بہت سے طیاروں کو بیک وقت لے جانے کی حکمت عملی یا چال پر مبنی تفصیلی منصوبے پر عملدر آمد کرنے والی سیکرٹ سروس کی قیادت کر رہا تھا۔ اس کا کوئی رسمی یا غیر رسمی تنظیمی سلسلہ عمل موجود تھا یا نہیں، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ القاعدہ نے نائن الیون والے وقوعے والے برس میں خوست کی تربیتی مرکز جیسی جگہوں پر پاکستانی جہادیوں سے استوار ہونے والے تعلقات کا اچھا خاصا فائدہ اٹھایا تھا۔ القاعدہ اور طالبان کے درمیان جن کی صفوں میں بہت سے پاکستانی بھی شامل تھے، قریبی ربط کی بناء پر القاعدہ کو خود پاکستان کے اندر موجود بنیاد پرست دیوبندی مساجد اور مدارس کے ایک وسیع سلسلے تک رسائی حاصل ہوگئی تھی۔

نائن الیون کے بعد پاکستان کے شہری علاقوں کی طرف فرار ہونے والے القاعدہ کے تربیت یافتہ کارکنوں نے محض یہاں آرام سے بیٹھ جانے پر اکتفا نہیں کیا۔ انہوں نے ملک کے اندر مغربی ممالک کی عمارتوں/دفاتر، شخصیات کو نشانہ بنانے کی منصوبہ بندی شروع کر دی تھی۔ ان کا پہلا اور انتہائی بدنام زمانہ شکار امریکی صحافی ڈینیئل پرل تھا جسے فروری2002 میں کراچی سے اغواء کیا گیا تھا۔ خالد شیخ محمد جیسا خطرناک آدمی اس منصوبے میں براہ راست ملوث تھا اور کئی برس

بعد امریکہ کی ایک خصوصی فوجی عدالت میں بیان دیتے ہوئے اس نے بڑے فخریہ انداز میں کہا تھا کہ اس نے پرل کا سر ''اپنے اس خوش نصیب دائیں ہاتھ'' سے خود تن سے جدا کیا تھا۔ مگر یہ سب کچھ محض القاعدہ کی کارروائی نہیں تھی۔ مقامی جہادیوں اور فرقہ ورانہ تنظیموں کے ساتھ اپنے روابط کی بناء پر اس اور اسی طرح کے دوسرے حملوں میں پاکستان کا ہاتھ بھی تھا۔ برطانوی نژاد عمر شیخ جس کے جیشِ محمد کے بانی مسعود اظہر کے ساتھ قریبی روابط تھے، اسے اغواء کا ایک اہم فریق تھا اور اسی طرح اجمل فاروقی بھی جو جیش کا ایک اور کارکن تھا۔

پرل کے اغواء کے بعد کے مہینوں میں مغربی ممالک کی عمارتیں اور عملہ اضافی حملوں کی زد میں تھے۔ مارچ کے مہینے میں امریکی سفارت خانے کے قریب واقع ایک پروٹسٹنٹ چرچ پر کیے گئے گرینڈ حملے میں پانچ افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ ہلاک شدگان میں سے دو افراد، ایک ماں اور اس کی نوجوان بیٹی کا تعلق امریکی سفارت خانے کے ملازم کے خاندان سے تھا؛ اس کے علاوہ ایک باپ اور اس کا نوجوان بیٹا حملے میں زخمی ہو گئے تھے۔ اس واقعے نے امریکہ کے تمام سفارتی عملے اور ان کے اہل خانہ میں خوف کی لہر دوڑا دی تھی۔ امریکہ محکمہ خارجہ نے اگرچہ نائن الیون کے واقعے کے فوری بعد عملے کے اہل خانہ کو وہاں سے نکلوا لیا تھا، مگر تھوڑا ہی عرصہ گزرنے کے بعد انہیں بازی میں واپس جانے کی اجازت دے دی تھی۔ چرچ حملے کے بعد انہیں ایک مرتبہ پھر واپس ملوا لیا گیا تھا اور اس کے بعد وہ لوٹ کر نہیں آئے محکمہ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ پاکستان کے اندر اپنی تمام سفارتی سہولتوں کو غیر ہمراہ تقرریاں (Unaccompanied posts) قرار دے دے، جس کا مطلب یہ تھا کہ عملے کے ساتھ اہل خانہ کو جانے کی اجازت نہیں ہوگی اور یہی صورتحال ابھی تک برقرار چلی آ رہی ہے۔ تاہم القاعدہ کے تخلیق کردہ منصوبوں کا نشانہ صرف امریکی سفارت خانے کا عملہ ہی نہیں تھا۔ چرچ پر حملے کے صرف دو ماہ بعد کراچی میں ایک کار بم دھماکے میں فرانسیسی بحری عملے کے گیارہ ارکان ہلاک ہو گئے تھے۔ اس سے اگلے ماہ کراچی میں امریکی قونصل خانے کے باہر ہونے والے ایک بم دھماکے میں راستے سے گزرنے والے 12 پاکستانی ہلاک ہو گئے تھے۔ اگست میں اسلام آباد سے قریب واقع برطانوی حکومت کے دور میں موسم سرما کے لئے بنائے جانے والے عارضی پہاڑی دارلحکومت مری میں غیر ملکی طلباء کے مشنری اسکول میں چھ عدد پاکستانی ملازمین مارے گئے تھے۔

یہ حقیقت کہ ان حملوں میں پاکستانی بھی ملوث تھے حکام کے لئے باعث ندامت تھی۔

اس سے بھی زیادہ شرمناک یہ حقیقت تھی کہ ان میں سے اکثریت کا تعلق جیشِ محمد جیسی ان تنظیموں سے تھا جو کشمیر میں پاکستانی مفادات کی پیروی میں مصروف تھیں۔ اپنی حلیف تنظیموں سے توجہ ہٹانے کے لئے حکومت نے ان حملوں کی ذمہ داری لشکر جھنگوی پر عائد کردی تھی، جس کے ساتھ وہ طویل عرصہ سے حالت جنگ میں تھی اور جس پر اس نے نائن الیون سے قبل رسمی پابندی بھی عائد کر دی تھی۔ اگرچہ یہ درست ہے کہ مشرف نے بھی جیشِ محمد اور لشکر طیبہ پر جنوری 2002 میں پابندی عائد کردی تھی مگر اس کا مغربی اہداف پر القاعدہ کے ان حملوں سے کوئی تعلق نہیں تھا جو ابھی شروع ہی نہیں ہوئے تھے، پرل کے اغواء کا واقعہ ایک ماہ بعد پیش آیا تھا، بلکہ یہ ایک ماہ پہلے نیو دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ ہونے والے فدائین حملوں کے جواب میں عائد کی گئی تھی۔ جیسا کہ ہم نے باب نمبر 4 میں ملاحظہ کیا، ان تنظیموں پر پابندی ایک خالصتاً نمائشی اقدام تھا جس کا مقصد واشنگٹن میں مشرف کے نئے حلیفوں کو خوش کرنا تھا۔ وہ یہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ وہ مذہبی شدت پسندی کے خلاف تھا جبکہ ساتھ ساتھ اپنی پسندیدہ اسلامی انتہاء پسند تنظیموں بشمول جیش کی حمایت بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس وقت سپاہ صحابہؓ پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ اگرچہ اس کے قائد اعظم طارق کو گھر کے اندر ہی نظر بند کر دیا گیا تھا، تاہم اسے کئی ماہ بعد رہا کر دیا گیا اور ساتھ ہی قومی اسمبلی کی ایک نشست پر مقابلہ کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی جو اس نے جیت لی تھی۔

تاہم امریکہ کی حمایت کی قیمت بھی چکانی تھی۔ مشرف حکومت کو جماعت اسلامی اور جے یو آئی کے زیر اہتمام کئے جانے والے مظاہروں میں بتدریج آنے والی تیزی کا سامنا بھی تھا۔ اسے القاعدہ سے بھی نمٹنا تھا۔ تنظیم کے بہت سے اعلیٰ عہدیداروں کی گرفتاری میں حکومت پاکستان کا کردار اس کی نظروں سے پوشیدہ نہیں تھا اور مارچ 2003 میں خالد شیخ محمد کی گرفتاری اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا نظر آ رہی تھی۔ اب القاعدہ اور اس کے پاکستانی حلیفوں نے اپنا ہدف مغربی ٹھکانوں/شخصیات کی بجائے بڑے بڑے پاکستانی عہدیداروں کو بنانا شروع کر دیا۔ دسمبر 2003 میں پرویز مشرف پر دو علیحدہ علیحدہ قاتلانہ حملے کئے گئے۔ پہلا حملہ جیشِ محمد سے منسلک جہادیوں نے کیا تھا۔ دوسرے کی منصوبہ بندی ابوفراج اللبی نے کی تھی جو کہ خالد شیخ محمد کے جانشین کے طور پر القاعدہ میں تیسرے نمبر کا عہدیدار بن گیا تھا۔ اس کا سب سے اہم شریک کار

امجد فاروقی تھا، جو کہ جیش کا وہ رکن تھا جس نے پرل کے اغواء میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جون 2004 میں کور کمانڈر کراچی لیفٹیننٹ جنرل احسن حیات پر القاعدہ سے تعلق رکھنے والی ایک چھوٹی سی تنظیم بنام جنداللہ کی طرف سے حملہ کیا گیا۔ اس کے ایک ماہ بعد جیش سے تعلق رکھنے والے ایک خودکش بمبار نے وزیراعظم شوکت عزیز کو قتل کرنے کی کوشش کی۔

اگرچہ ان حملوں میں ملوث بہت سے پاکستانی جیشِ محمد سے تعلق رکھتے تھے، تاہم نہ تو اس وقت اور نہ ہی پھر کبھی اس تنظیم کے خلاف بحثیت مجموعی کوئی کارروائی کی گئی ہے۔ سپاہ صحابہؓ کے اعظم طارق کی طرح، جیشِ محمد کے قائد مسعود اظہر کو بھی اس کے گھر میں اس وقت نظر بند کر دیا گیا تھا جب مشرف نے جنوری 2002 میں شدت پسند اسلامی تنظیموں پر نام نہاد پابندی عائد کر دی تھی۔ تاہم مسعود اظہر پر پابندیاں بعد ازاں اسی سال ختم کر دی گئیں اور اسے مشرف اور دیگر کے خلاف قتل کے واقعہ میں بھی ذاتی طور پر کبھی ملوث نہیں کیا گیا۔ اس کی تنظیم کشمیر میں آج بھی فعال و سرگرم ہے۔ اصل میں بظاہر یہی ہوا کہ جیش محمد کے کچھ ارکان نے جیسا کہ امجد فاروقی کی مثال سے ثابت ہوتا ہے، اپنی وفاداریوں کا رخ اپنی بانی تنظیم سے موڑ کر القاعدہ کی طرف کر دیا۔ اس کی وجہ معلوم کرنا کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ پاکستان کی جہادی قوتیں نظریاتی طور پر پاکستان کے مقتدر حلقوں کی نسبت خود کو القاعدہ سے زیادہ قریب متصور کرتی تھیں۔ پاکستانی حکومت کے ساتھ ان کا تعاون بس اس حد تک تھا جس حد تک وہ اس کے ساتھ کشمیر کو انڈیا کے شکنجے سے آزاد کروانے پر اتفاق کرتی تھیں۔ تاہم جیش محمد اور اس کی طرح کی دوسری تنظیموں کے ارکان کے نزدیک پاکستان کی طرف سے امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ اور بعد ازاں القاعدہ کے بعض اعلیٰ عہدیداروں کو پکڑنے کی کوششوں نے ان کو حکومت پاکستان سے اور بھی دور کر دیا تھا۔ اپنی بانی تنظیموں اور آئی ایس آئی کے درمیان جاری وساری تعاون پر ناخوش ہو کر انہوں نے اپنی وفاداریاں تبدیل کر دیں اور ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھا لیے۔

اگرچہ شہری علاقوں میں القاعدہ کے روپوش ارکان کی کھوج لگانے میں امریکہ کہ مدد کرتے ہوئے پاکستان بہت خوش نظر آ رہا تھا، تاہم قبائلی علاقوں میں اس طرح کی کوشش یا تعاون مفقود تھا۔ اور القاعدہ کے ارکان کی اکثریت انہیں علاقوں میں روپوش تھی، مگر یہاں پر وہ ان طالبانی جہادیوں کے ساتھ گھل مل چکے تھے جو خود بھی مفرور ہو کر یہاں چھپے ہوئے تھے۔ قبائلی

علاقوں میں القاعدہ کے ارکان کی تلاش میں یہ خطرہ مضمر میں تھا کہ اس طرح سابقہ حلیفوں کے ساتھ دست بدست لڑائی ہو جاتی جس سے کہ پاکستان احتراز کرنا چاہتا تھا۔ ان کے نزدیک دہشت گردی کے خلاف جنگ میں ان کا کردار یہ تھا کہ وہ القاعدہ کے رہنماؤں کی گرفتاری میں امریکہ کی مدد کریں۔ اور یہ کردار وہ پاکستان کے شہری علاقوں میں ادا کر رہے تھے۔ طالبان کے ساتھ مسلح تصادم اس معاہدے کا حصہ نہیں تھا۔ نہ ہی یہ محض ان کی اپنی تفسیر تھی۔ امریکہ پاکستان طالبان سے ہر طرح کے روابط ختم کر ڈالے اور ان کی مادی امداد کا سلسلہ بھی منقطع کر دے۔ جیسا کہ ہم نے ملاحظہ کیا ہے، آپریشن اینڈیورنگ کے ابتدائی مراحل میں سنٹرل کمانڈ پاکستان پر داد و تحسین کے ڈونگرے برسا رہا تھا۔ حتیٰ کہ اس کی طرف سے ان مشکلات کا ذکر بھی کیا گیا جو پاکستان کو القاعدہ اور طالبان کے فرار ہوتے ہوئے ارکان کو اپنی حدود میں داخل ہونے سے روکنے پر پیش آ رہی تھیں۔ طالبان کے حوالے سے امریکہ کے بے فکری پر مبنی رویے کے پس پردہ کسی حد تک یہ یقین کارفرما تھا کہ طالبان پہلے سے ہی ایک شکست خوردہ تنظیم تھی۔ امریکہ کے اعصاب پر سب سے زیادہ القاعدہ کا خوف سوار تھا۔ جب تک پاکستان اس حوالے سے نتائج ظاہر کر رہا تھا اس وقت تک مزید کارکردگی دکھانے کا مطالبہ بے جواز تھا۔

پاکستان کے پاس طالبان کے ساتھ دشمنی کی خواہش نہ رکھنے کے بہت مناسب جواز موجود تھے۔ سب سے پہلا جواز تو یہ تھا کہ طالبان محض ایک افغان طاقت کی نمائندگی نہیں کر رہے تھے۔ بہت سے پاکستانی رضا کار بھی، جن میں اکثریت پشتونوں کی تھی، کئی برسوں سے ان کی صفوں میں شمولیت اختیار کرتے چلے آ رہے تھے اور آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کے ابتدائی مراحل کے دوران یہ سب بھاگ کر واپس اپنے وطن کی سرزمین پر پہنچ گئے تھے۔ چنانچہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف ہتھیار اٹھانا انتہائی ناپسندیدہ فعل ثابت ہو سکتا تھا، نہ صرف فوج کی نگاہ میں جسے کہ یہ لڑائی لڑنی تھی بلکہ عوام کی نظروں میں بھی۔ افغان طالبان بھی پاکستانی عوام میں بہت مقبول تھے جو کہ انہیں طویل عرصہ سے اپنا قابل اعتماد ساتھ سمجھتے چلے آ رہے تھے۔ القاعدہ کے خلاف کاروائی کرنا ایک چیز تھی؛ جبکہ طالبان کے ساتھ ٹکر لینا ایک اور ہی معاملہ تھا۔ طالبان کو سب سے زیادہ مقبولیت اپنے ساتھی، پشتونوں میں حاصل تھی، اس حد تک کہ امریکہ اور شمالی اتحاد کے ہاتھوں ان کی شکست کا صوبہ سرحد میں اکتوبر 2002 میں منعقد ہونے والے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں

شدید ردعمل دیکھنے میں آیا۔ جے یو آئی نے جس کے مدرسوں سے اتنے زیادہ طالبان نکل کر آئے تھے، زبردست فتح حاصل کرتے ہوئے اپنی روایتی صوبائی حریف اور صوبے کی بڑی سیکولر جماعت عوامی نیشنل پارٹی کو بری طرح رگید ڈالا۔ یہ کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے کہ جے یو آئی کی نئی صوبائی حکومت کو تو طالبان سے محاذ آرائی کرنے میں مشرف سے بھی کم دلچسپی تھی۔

تاہم پاکستان کو تحریک دینے والا بنیادی عنصر افغانستان کے مستقبل کے حوالے سے لاحق پریشانی تھی۔ اگرچہ طالبان قابل بھروسہ ثابت نہیں ہوئے تھے، مگر وہ کم سے کم حلیف ضرور تھے۔ یہ بات شمالی اتحاد کے قائدین کے لئے نہیں کہی جاسکتی تھی، جو اس وقت کابل میں اقتدار کے مزے لوٹ رہے تھے۔ انہوں نے اپنے مخالفین پہلے پہل حکمت یار اور پھر طالبان کے لئے پاکستانی حمایت کے ردعمل کے طور پر افغان خانہ جنگی کے دوران اپنا سارا وزن انڈیا کے پلڑے میں ڈال دیا تھا۔ جب انڈیا نے افغانستان میں جگہ بناتے ہوئے اچھی خاصی تعداد میں اپنی موجودگی کا احساس دلانا شروع کر دیا تو پاکستان کی تفکرات میں اضافہ ہونے لگا۔ انہوں نے نہ صرف کابل میں اپنا سفارت خانہ کھول لیا بلکہ دارالحکومت سے باہر بھی چار اہم صوبائی مراکز (جلال آباد، قندھار، ہرات اور مزار شریف) میں اپنے قونصل خانے قائم کر لئے تھے۔ وہ واحد دوسرا ملک جہاں انڈیا نے اتنی تعداد میں سفارتی چوکیاں قائم کی ہوئی تھیں امریکہ تھا۔ پاکستانیوں کا یقین تھا کہ انڈیا قندھار میں اپنی سفارتی سرگرمیوں کے ذریعے بلوچستان کے ان باغی قبائل کو امداد فراہم کر رہا، تھا جو اپنے علاقے میں قدرتی وسائل کی تقسیم پر طویل عرصہ سے حکومت پاکستان کے ساتھ حالت جنگ میں تھے۔ افغانستان میں اچھی خاصی سفارتی سرگرمیوں کے ساتھ ہی بھارت نے مالی امداد کی پیش کش بھی کر دی جو کہ حقیقت میں ایک ارب ڈالر پر پہنچ گئی تھی۔ نائین الیون کے واقعے کے اگلے برس بھارت نے افغانستان کو دس لاکھ ٹن گندم عطیہ کر دی، جو کہ ورلڈ فوڈ پروگرام کی تاریخ کا سب سے بڑا عطیہ تھا۔ اس کے بعد آنے والے کئی برسوں میں اس نے وہاں سڑکیں، بجلی کے کارخانے، سیٹلائیٹ ٹرانسمٹرز اور حتیٰ کہ کابل میں پارلیمنٹ کی نئی عمارت بھی تعمیر کر کے دے دی۔ جہاں تک پاکستانیوں کا تعلق تھا، اس ساری بھارتی سخاوت کا واحد ممکنہ محرک پاکستان دشمنی تھی۔ وہ افغانستان میں اپنے اثر و رسوخ میں اضافے کی چالیں چل رہے تھے اور ان کا سفارت خانہ اور چاروں قونصل خانے جاسوسوں کے گڑھ تھے۔

حامد کرزئی کے افغان صدر کی حیثیت سے منظر عام پر آنے سے بھی ان کے لئے امید کا کوئی سبب پیدا نہ ہو سکا۔ کرزئی ایک نسلی پشتون تھا، یہ ایک حقیقت تھی، اور اس کے ساتھ ہی ملک کے ایک بڑے پشتون قبیلے کا قائد بھی۔ قندھار سے تعلق رکھنے کی بناء پر وہ شروع میں طالبان کی حمایت کرتا رہا تھا مگر ان کے اندر القاعدہ کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کی بناء پر ان کے خلاف ہو گیا تھا۔ افغانستان چھوڑ دینے پر مجبور ہو جانے کے بعد وہ پاکستان میں نہ چاہتے ہوئے بھی جلا وطنی کی زندگی گزارنے لگا۔ وہاں بلوچستان کے دارالحکومت کوئٹہ میں 1999 میں طالبان کے ایک تربیت یافتہ رکن نے اس کے باپ کو آئی ایس آئی کی ممکنہ معاونت کے ساتھ، یا پھر یہ کرزئی کا خیال تھا، موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ اگرچہ اس نے خود کو قتل ہونے سے بچا لیا اور دو مزید برس کوئٹہ میں قیام پذیر رہا، تاہم آئی ایس آئی کے ایک عہدیدار نے نائین الیون سے کچھ ہی عرصہ قبل اس سے ملاقات کر کے ملک چھوڑنے کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ پاکستانی حکام اور کرزئی کے درمیان ناپسندیدگی کا آغاز ہو چکا تھا۔ اس پس منظر میں اور اس کے ساتھ ہی دوسرے عوامل کو مدنظر رکھتے ہوئے یہ کوئی حیران کن امر نہیں ہے کہ پاکستان طالبان کا پتہ سنبھال کر رکھنا چاہتا تھا۔ ایک دن امریکہ افغانستان سے نکل جائے گا۔ اور امریکہ کو القاعدہ کے اہم رہنماؤں کی کھوج لگانے کے کام میں مدد دینے سے وہ دن جلد نزدیک آ جائے گا۔ مگر وہ اپنے اس حلیف سے بہت زیادہ قابل ترجیح تھے جو ڈیورنڈ لائن کے اس طرف تشکیل پا رہا تھا۔ بہتر یہی تھا کہ انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے اور مناسب دنوں کا انتظار کیا جائے۔

اس دوران امریکہ نے اس ساری صورتحال کو پہلے سے ہی نظرانداز کرنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے اس کا پیشگی مشاہدہ اس وقت کرنا شروع کر دیا تھا جب اکتوبر 2001 میں امریکہ نے طالبان پر بم برسانے شروع کر دیئے تھے۔ امریکی محکمہ خارجہ میں نیٹو کے دفتر کے نئے ڈائریکٹر کے طور پر میں اس فوجی اتحاد کے برسلز میں واقع ہیڈکوارٹرز کا پہلا دورہ کرنے گیا تھا۔ وہاں تعینات اعلیٰ امریکی عہدیداروں سے ملاقاتیں کرتے کرتے میں نے خود کو آخرکار امریکی مشیر دفاع گالبرائتھ کے دفتر میں پایا۔ سیاسی سفارش پر بھرتی ہونے والا یہ عہدیدار ریگن کے دور حکومت میں فرانس کا سفیر بھی رہا تھا۔ ایک بصورت دیگر معمول کی گفتگو کے اختتام پر اس نے ذکر کرتے ہوئے بتایا کہ وہ نائین الیون کے تھوڑے ہی عرصے کے بعد واشنگٹن میں تھا اور ری پبلکن

پارٹی میں خارجہ پالیسی امور کے سب سے بارسوخ ماہر رچرڈ پرل کی سرکردگی میں ہونے والے اجلاس میں شریک تھا۔ اگرچہ گالبرائتھ نے اس کا ذکر نہیں کیا مگر میرے اندازے مطابق یہ غالباً اس وقت پرل کی سربراہی میں ہونے والے ڈیفینس پالیسی بورڈ کا اجلاس تھا۔ کالبرائتھ نے بتایا کہ پرل نے دلیل دیتے ہوئے کہا تھا کہ امریکہ کو نائن الیون کی صورت میں جو موقع ملا تھا اسے استعمال کرتے ہوئے عراق پر حملہ کر کے صدام حسین کا تختہ الٹ دینا چاہئے۔ وہ اس تجویز کے حوالے سے میرا نکتہء نظر معلوم کرنا چاہتا تھا۔ مجھے یہ سن کر شدید حیرت وصدمے کا احساس ہوا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ری پبلیکن کے خارجہ پالیسی حلقوں میں عراق اس قدر اہمیت اختیار کر چکا ہے۔ مگر چونکہ میں جارحانہ لہجہ نہیں اپنانا چاہتا تھا اس لئے میں نے یہی جواب دیا کہ ہمیں کسی بھی اور جگہ پر حملہ کرنے سے پہلے افغانستان اور القاعدہ کا مسئلہ حل کر لینا چاہئے۔

لہٰذا جب بش انتظامیہ نے قوم کو عراق کی جنگ کے بخار میں مبتلا کرنا شروع کر دیا تو مجھے زیادہ حیرت بھی نہیں ہوئی۔ مارچ 2003 میں جب جنگ شروع ہوئی تو یہ ایک طرح سے بڑے صدمے اور ہیبت کی صورتحال تھی اور امریکہ کی اس ملک کو جلدی سے آزاد کروا کے وہاں سے رخصت ہو جانے کی نام نہاد خود اعتمادی کا پردہ چاک کرتی نظر آ رہی تھی۔ بعث پارٹی کو اقتدار سے بے دخل کرنے کے لئے امریکہ نے ملک کے اندر نظم و نسق کا تقریباً ہر نشان تباہ کر کے رکھ دیا تھا۔ چنانچہ اس کا نتیجہ ایک قسم کی ایسی انارکی صورت میں برآمد ہوا جو کہ القاعدہ کی طرح کی شکل اختیار کرتی ہوئی خطرناک بغاوت کے منظر عام پر آنے کے باعث اور بھی خطرناک ہو کر رہ گئی تھی۔ چنانچہ امریکہ کو مجبور ہو کر نہ صرف ملک کا نظم و نسق سنبھالنا پڑ گیا بلکہ صورتحال کو مزید بگڑنے سے بچانے کے لئے زیادہ سے زیادہ فوجیں بھی ملک میں بھجوانی پڑیں۔ ایک برس کے اندر اندر عراق کے اندر 130,000 فوجی موجود تھے جو کہ اصل حملے کے وقت استعمال ہونے والی فوج سے دوگنی تعداد تھی۔ یہ صورتحال افغانستان کے بالکل برعکس ڈرامائی صورتحال تھی، جہاں امریکہ صرف 15000 (پندرہ ہزار) فوجیوں کی معمولی سی تعداد سے کام چلا رہا تھا۔ اب عراق کے مرکزی اہمیت اختیار کر جانے کی بناء پر افغانستان فوجی اور خارجہ پالیسی کے نکتہء نظر سے پس پردہ منظر بن کر رہ گیا تھا۔

آپریشن اینڈ یورنگ فریڈم کو جلد از جلد تکمیل کی طرف لے جانے کے لئے سیکرٹری

دفاع ڈونالڈرمزفیلڈ نے اسی ماہ کابل کا مختصر دورہ بھی کر ڈالا جس ماہ بغداد نے ہتھیار ڈال دیئے تھے، تا کہ افغانستان میں بڑے پیمانے پر ہونے والی جنگی کاروائیوں کے خاتمے کا اعلان کر دے۔ ستم ظریفی تو یہ ہے کہ اس نے یہ اعلان عین اس وقت کیا جب طالبان اپنے قدم دوبارہ جمانے کی کوششوں کا آغاز کر رہے تھے۔ آخری مرتبہ صوبہ ہلمند سے موٹر سائیکل پر سوار ہو کر فرار ہوتے وقت دیکھا جانے والا ملا عمر پاکستان کے صوبے بلوچستان پہنچ چکا تھا جہاں اس نے کوئٹہ کے نواح میں کوئی دوکان کھول لی تھی۔ اس کے ساتھ زندہ بچ جانے والے بہت سے ساتھیوں نے بھی وہیں پناہ لے لی تھی یا پھر وہ شمال کی طرف قبائلی علاقوں میں گئے تھے جہاں انہوں نے اپنی طاقت بحال کرنے کے لئے از سرنو کام شروع کر دیا تھا۔ اب وہ افغانستان واپس حکمران بن کر نہیں بلکہ باغی بن کر جا رہے تھے، اپنے ان مجاہدین پیشروؤں کی طرح جنہوں نے، ان کی یادداشت کے مطابق، ایک نسل پہلے روسیوں کو مار بھگایا تھا۔ جنوب میں بہت سے طالبان بھی نکل کر ان کے ساتھ شامل ہو رہے تھے۔ جنوب میں بہت سے طالبان کمانڈروں نے ملا برادر اور داد اللہ کی قیادت میں طالبان طاقت کے دوبارہ عروج کا عمل تیز کر دیا۔ مشرق میں طالبان کی کوششوں کا مرکز وہ تنظیم تھی جو بعد ازاں حقانی نیٹ ورک کے نام سے معروف ہوئی۔ شمالی وزیرستان کے قبائلی علاقے میران شاہ سے ابھر کر سامنے آنے والے اس نیٹ ورک کی قیادت جلال الدین حقانی اور اس کے بیٹے سراج الدین کے پاس تھی۔ سوویت مخالف جہاد کے دوران بڑے حقانی کو ایک معروف جہادی کی حیثیت حاصل تھی جس کے بن لادن سے ذاتی تعلقات تھے۔ حزب اسلامی کے ایک اہم دھڑے کے اعلیٰ عہدے دار کے طور پر اس کے آئی ایس آئی سے بھی قریبی روابط رہے تھے۔ افغان خانہ جنگی کے دوران اس نے دراصل وفاداری تبدیل کرتے ہوئے 1995 میں اس وقت طالبان کی طرفداری شروع کر دی تھی جب وہ پہلے ہی کابل کے دروازوں پر پہنچ چکے تھے۔ گلبدین حکمت یار بھی ان کی صفوں میں شامل ہونے کے لئے پر تول رہا تھا۔ ایران میں جلاوطنی کے اختتام پر وہ واپس پاکستان پہنچ گیا تھا جہاں اسے اس کے سابقہ طالبان کو گذشتہ لڑائی میں افرادی قوت کا نقصان پورا کرنے کے لئے نئی بھرتیوں کے حوالے سے کسی طرح کی مشکل کا سامنا نہیں تھا۔ یہاں پختون قوم پرستی کی ایک نمایاں خصوصیت کام کرتی نظر آ رہی تھی، کیونکہ نئی کرزئی حکومت اور نئی تیار شدہ فوج میں فاتح قومی اتحاد (نیشنل الائنس) سے تعلق رکھنے والے نسلی تاجک اور ازبک

باشندوں کی اکثریت تھی۔ جیسے ہی متفرق طاقتوں پر مشتمل ان کی طالبان جہادیوں نے ڈیورنڈ لائن کے اس طرف واپسی کا سفر شروع کیا تو اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ پاکستان کی طرف سے انہیں روکنے کی کوئی کوشش کی گئی تھی۔

طالبان کے دوبارہ نمودار ہونے کے باوجود، امریکہ کی توجہ ابھی بھی زیادہ تر القاعدہ پر مرکوز تھی۔ واشنگٹن القاعدہ کے خلاف تعاون کرنے پر پاکستان کا بے حد مشکور تھا مگر خالد شیخ محمد کی گرفتاری کے ساتھ ہی پاکستان کے شہری علاقوں میں گرفتاری کے لئے دستیاب القاعدہ کے اعلیٰ عہدیداروں کی رسد کا سرچشمہ خشک ہونے کے قریب تھا۔ سب سے بڑی مچھلی، اسامہ بن لادن ابھی تک مفرور، غالباً کہیں قبائلی علاقوں میں چھپا ہوا تھا۔ اور یہ امر باعث ندامت تھا۔ کسی کو بھی یقینی طور پر جو علم تھا وہ القاعدہ کی یہاں بڑے پیمانے پر موجودگی تھی۔ یہ صرف مخصوص عرب جہادیوں پر مشتمل طبقے تک محدود نہیں تھی بلکہ اس میں وہ بیرونی جہادی بھی آ جاتے تھے جو نائن الیون سے قبل طالبان کے شانہ بشانہ ان کے ساتھ لڑنے افغانستان آئے ہوئے تھے۔ ان میں انتہاء پسند اسلامک موومنٹ آف ازبکستان (IMU) سے منسلک ازبک جہادیوں کے علاوہ مخصوص چیچن جہادی اور حتیٰ کہ چین کے صوبے زنجیانگ سے یوئیگھر زباشندوں کی مختصر تعداد بھی شامل تھی۔ پاکستان میں جلد ہی ان کو بحیثیت مجموعی غیر ملکی جہادیوں کا خطاب دے دیا گیا۔ القاعدہ کے اعلیٰ عہدیداران کے برعکس جو کہ پاکستان کے شہری علاقوں میں روپوش ہوتے پھر رہے تھے، یہ جہادی فرار ہو کر قبائلی علاقوں میں چلے گئے تھے اور وہیں ٹھہرے رہے۔ اگرچہ ان کی وہاں موجودگی کوئی اتنا بڑا راز نہیں تھا، مگر پاکستان نے ان کا کوئی بندوبست کرنے کے بارے میں سوچا تک ہی نہیں تھا۔ قبائلی علاقوں میں القاعدہ کا کبھی کوئی ایک اعلیٰ عہدیدار بھی گرفتار نہیں کیا گیا تھا۔ یہ حقیقت واشنگٹن کے لئے مسلسل فکر و پریشانی کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ اسامہ بن لادن کو پکڑنے میں ناکامی پر انتہائی مایوسی اور جھنجھلاہٹ کے ساتھ ہی پاکستان کی سرزمین پر القاعدہ کی صحیح سالم حالت میں موجودگی سے بیزاری کا شکار ہو کر امریکہ نے اسلام آباد پر کاروائی کرنے کے لئے دباؤ بڑھانا شروع کر دیا۔

پاکستان اس حوالے سے کوئی کاروائی کرنے میں سخت ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ تاہم وہ امریکہ سے اپنے تعلقات خراب کرنے کا خطرہ بھی مول نہیں لینا چاہتا تھا۔ کیونکہ ان

تعلقات کا فائدہ اسے پہلے ہی قرضوں کی بڑے پیمانے پر معافی اور تین ارب ڈالر کی اقتصادی و فوجی امداد کے وعدے کی صورت میں مل چکا تھا۔ اسلام آباد میں بیٹھے مقتدر حلقوں کو یہ خوف بھی لاحق تھا کہ امریکہ کہیں خود اپنے طور پر کارروائی کرنے کا فیصلہ نہ کر ڈالے۔ احمد رشید کا خیال تھا کہ کولن پاول نے پہلے دراصل اس طرح کی دھمکی دی بھی تھی، تاہم امریکہ کے ساتھ معاملات طے کرنے کا طویل تجربہ رکھنے والے ایک سابقہ اعلیٰ پاکستانی عہدیدار نے اس کی تردید کرتے ہوئے مجھے بتایا کہ امریکہ اس طرح کے طرز عمل کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ میرا اپنا بھی یہ تجربہ تھا۔ امریکہ پاکستان کو کم یا زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنا لائحہ عمل پیش کرنے کے ساتھ ہی اس پر کارکردگی دکھانے کے حوالے سے دباؤ بھی ڈالتا رہتا۔ یہ اب پاکستان کے اپنے ہی تصور پر منحصر تھا کہ وہ اس امر کا تعین کرتا کہ ایسا کرنے میں ناکامی کی صورت میں نتائج برآمد ہو سکتے تھے۔ اس مثال میں پاکستان کو یہ خوف تھا کہ قبائلی علاقوں میں امریکہ کی طرف سے کسی بھی قسم کی یک طرفہ کارروائی کی صورت میں عوام کے اندر اشتعال پھیل سکتا ہے اور یوں مشرف حکومت کی مقبولیت کو دھچکا لگ جائے گا۔ یہ بمشکل ہی درست نظریہ تھا۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ ہی کشمیر سے محرومی کے بعد پاکستانی عوام کے ذہنوں میں یہ بٹھا دیا گیا ہے ان کی سرزمین کے حوالے سے بھارت کے عزائم اچھے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی ملکی خودمختاری اور سرحدوں کی ممکنہ خلاف ورزی کے حوالے سے بہت حساس بن گئے ہیں۔ یہ خدشات بعدازاں اس وقت درست ثابت ہو گئے جب قبائلی علاقوں میں امریکہ کے پری ڈیٹر میزائل حملوں کا نتیجہ اسی ردعمل کی صورت میں ظاہر ہوا۔ تاہم مشرف نے بعدازاں قبائلی علاقوں میں القاعدہ کے خلاف خود اپنی ذاتی وجوہات کے پیش نظر کارروائی کا حتمی فیصلہ کر لیا: اسی تنظیم نے اس پر قاتلانہ حملہ کیا تھا۔

مارچ 2004 میں پاکستان نے آخر کار خود اپنے طور پر کارروائی کا آغاز کر دیا۔ فرنٹیئر کور کے مقامی دستوں نے جنوبی وزیرستان میں کلوشہ کے مقام پر طالبان کے ایسے مشکوک ٹھکانے کا محاصرہ کرنے کے بعد اس پر حملہ کر دیا تھا جس کے بارے میں انہیں یقین تھا کہ اس میں القاعدہ کے جہادی اور دوسرے غیر ملکی عناصر چھپے ہوئے تھے۔ یہ حملہ کوئی آسمانی آفت نہیں تھی جو اچانک نازل ہو گئی تھی۔ پاکستانی حکام نے حملے سے ایک ماہ قبل ہی مقامی قبائلی رہنماؤں کو آگاہ کر دیا تھا کہ وہ علاقے میں القاعدہ کے خلاف ایک عدد ''ڈھونڈو اور گھیرو'' قسم کی کارروائی شروع کرنے کا

ارادہ رکھتے ہیں۔ بدقسمتی سے بہت ناقص طور پر تربیت یافتہ فرنٹیئر کور کے جوان جنہیں کلوشہ آپریشن کے لئے استعمال کیا گیا تھا۔ایک ایسے مقام کی طرف پیش قدمی کر بیٹھے جو اصل میں مخالفین کی طرف سے جال کے طور پر استعمال کیا جا رہا تھا اور یوں انہیں شدید جانی نقصان سے دو چار ہونا پڑ گیا۔ چنانچہ مزید کمک طلب کر لی گئی اور یوں700 کی ابتدائی نفری میں اضافہ ہوتے ہوتے یہ تعداد7000 تک جا پہنچی۔اگرچہ پاکستان آخرکار اس ٹھکانے کا محاصرہ کر کے اسے تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا مگر اس کے ردعمل میں پاکستانی فوج کے قافلوں اور علاقے میں واقع دور دراز چوکیوں پر حملے ہونا شروع ہو گئے۔فرنٹیئر کور کے بے شمار فوجی دستوں نے میدان جنگ چھوڑ دیا کیونکہ وہ اپنے پشتون بھائیوں سے لڑنے میں ہچکچاہٹ محسوس کر رہے تھے۔

سودے بازی میں توقع سے زیادہ فائدہ حاصل کر کے اور اس خدشے کے پیش نظر کہ صورتحال قابو سے باہر ہو سکتی ہے پاکستان نے معاہدے کی پیش کش کر دی۔ان کے درمیان مکالمہ کروانے والا بھی ایک پاکستانی تھا۔اس کا نام نیک محمد تھا اور وہ طالبان جہادیوں کا قائد تھا۔فرنٹیئر کور نے کلوشہ میں جہاں حملہ کیا تھا وہ اس کی رہائش کا احاطہ ہی تھا۔لڑائی کے دوران اس نے جس جرأت کا مظاہرہ کیا تھا اور جس طرح آئی ایم یو کے قائد طاہر یلداشیف کو پاکستانی فوجی چوکیوں سے بچاتے ہوئے محفوظ مقام پر پہنچا دیا تھا،اس کی بناء پر اسے پہلے ہی بہت شہرت حاصل ہو چکی تھی۔ بعد ازاں شکئی نامی ایک قریبی دیہات میں پاکستانی حکام اور اس کے درمیان جس معاہدے پر اتفاق رائے ہوا اس سے اس کی شہرت وساکھ کو مزید استحکام حاصل ہو گیا۔فوج نے القاعدہ کے جنگجوؤں کا صفایا کرنے کی کوشش کے خاتمے اور اپنے دستوں کو بیرکوں تک محدود رکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔اس کے بدلے نیک محمد نے حکومتی فوجوں پر حملہ کرنے کے فرار ہو جانے کی کارروائیاں روک دینے کے ساتھ ہی اس امر کی یقین دہانی بھی کروا دی کہ اس کی پناہ میں موجود غیر ملکی جہادیوں کو مقامی حکام کے ساتھ رجسٹرڈ کرا دیا جائے گا۔

شکئی کا معاہدہ پاکستان کی طرف سے ایک نمایاں پسپائی کی علامت تھا اور نیک محمد کی فتح تصور کیا گیا۔ یہ حقیقت کہ فوج نے اس دیوبندی مسجد میں مذاکرات منعقد کرنے پر آمادگی ظاہر کر دی تھی جس میں طالبان عبادت کرتے تھے ایک بڑی رعایت تصور کی گئی۔ نیک محمد کو غیر معمولی کامیابی حاصل ہو گئی تھی۔ فتح کے جذبے سے سرشار ہو جانے کے بعد اس نے اپنے غیر ملکی

ساتھیوں کو رجسٹریشن کے لئے پیش کرنے کی کوئی کوشش نہ کی اور یوں فوج نے شرمندگی و گھبراہٹ کے احساس کے تحت تلاش کرنے اور گھیرا ڈالنے کی کوششوں میں جارحانہ تیزی کا مظاہرہ کرنا شروع کر دیا جس کا نتیجہ مزید تصادموں کی صورت میں نکلا۔ یہ اس طرح ٹوٹ کر رہ جانے والے معاہدوں میں سے پہلا معاہدہ ثابت ہوا۔ چند ماہ بعد نیک محمد ایک ایسے حملے میں مارا گیا جو بعد ازاں پاکستان میں امریکہ کے پری ڈیٹر میزائل کا اولین حملہ ثابت ہوا۔ اس وقت پاکستان نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ یہ کارنامہ ان کی اپنی فضائیہ کے طیارے نے سرانجام دیا تھا۔ اس کی سب سے ممکنہ تشریح یہ نظر آتی ہے کہ امریکہ نے یہ پیش کش کی تھی کہ اگر نیک محمد کو تلاش کرنے میں اس کی مدد کی جائے تو وہ اسے خود ہی نشانہ بنا دے گا۔ پاکستان اس پر رضامند ہو گیا مگر اس کا اصرار تھا امریکہ اس کاروائی میں ملوث ہونے کی تشہیر نہیں کرے گا۔ قبائلی علاقوں میں القاعدہ کے جہادیوں کو چن چن کر مار دینے کی کوششوں کے دوبارہ آغاز کے فیصلے سے حوصلہ افزائی پا کر اور امریکہ کو پاکستان کی سرزمین پر پڑی ڈیٹر میزائلوں کے حملے کی اجازت پر بڑے آرام سے رضا مند ہو گیا۔ ایک اور مثال قائم کر دی گئی تھی۔ جہاں تک نیک محمد کا تعلق ہے اگرچہ وہ موت کے منہ میں جا چکا تھا مگر اس کے چھوڑے ہوئے نقوش دیرپا ثابت ہوتے نظر آ رہے تھے۔ اس نے ایک ایسی طاقت کی بنیاد رکھ دی تھی جو بعد ازاں طالبان کے نام سے معروف ہوئی۔

اس کے بعد دوسرا اہم طالبانی قائد جو منظر عام پر آیا وہ بیت اللہ محسود تھا۔ جنوبی وزیرستان کے شمال میں آباد محسود قبیلے کا رکن، یہ وہ شخص تھا جس نے اپنے پیشرو سے بھی زیادہ بدنام زمانہ کارنامے سرانجام دیئے تھے مگر جس کی زندگی کا انجام بالکل اسی طرح ہی ہوا۔ اس نے اپنی سرگرمیوں کا آغاز تقریباً اسی جگہ کیا تھا جہاں نیک محمد نے اختتام کیا تھا، یعنی القاعدہ کے ارکان اور دوسرے غیر ملکی جہادیوں کو پناہ دینے کے ساتھ ہی ان کی تلاش کرتی ہوئی پاکستانی فوج کے ساتھ وقتاً فوقتاً جھڑپیں کرنا۔ فوج کے لئے یہ سب کچھ پرانی کاروائیوں کا نئے سرے سے اعادہ تھا۔ تصادم کی کاروائیاں جاری رکھنے یا نئے فوجی دستے روانہ کرنے میں ہچکچاہٹ کے باعث اس نے شکئی کی مثال کو پھر سے دھرانے کا فیصلہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ ایک نئے معاہدے کی کوشش شروع کر دی۔ اس معاہدے کے تحت جس پر کہ کلوشہ معاہدے کے تقریباً ایک برس بعد، فروری 2005 میں دستخط کئے گئے تھے، پاکستان جنوبی وزیرستان سے اپنی باقاعدہ فوج کو نکالنے کے

ساتھ ہی فرنٹئیر کور کو اس کے سرکاری ٹھکانوں تک محدود رکھنے پر رضامند ہو گیا تھا۔ محسود نے بھی فوجی قافلوں اور چوکیوں پر حملے روکنے اور اس کے ساتھ ہی غیر ملکی جہادیوں کو پناہ نہ دینے پر رضا مندی ظاہر مندی ظاہر کر دی تھی۔ پاکستانی حکام کو غالباً ایسی کوئی خوش فہمی نہیں تھی کہ محسود القاعدہ کے حوالے سے کئے گئے وعدے پر کاربند رہے گا اور اسی لئے اپنے ہی فوجی دستوں کو بیرکوں تک محدود رکھنے کے وعدے پر تیار ہوتے ہوئے بھی انہوں نے اس پر عملدرآمد کے کسی بھی طریقہ کار کی تخصیص نہیں کی۔ جیسا کہ نیک محمد کے ساتھ گزشتہ معاہدے سے ظاہر ہوتا تھا، ان کا مقصد صرف اور صرف لڑائی کا خاتمہ کرنا تھا۔ تاہم اس کا انہیں کوئی خاص فائدہ نہیں ہوا، فوج کی طرف سے کسی بھی قسم کی مخالفت کی عدم موجودگی میں محسود نے جنوبی وزیرستان کے اکثر علاقوں پر اپنا تسلط قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی۔ جو بھی قبائلی رہنما اسے روکنے کی کوشش کرتا اسے ٹھکانے لگا دیا جاتا اور اس کے ساتھ ہی اس نے طالبان طرز کا خام انصاف بھی متعارف کرا دیا۔ جون 2005 میں اس نے آخر کار فوج کے ساتھ اپنے معاہدے کو مکمل طور پر بالائے طاق رکھتے ہوئے سرکاری فوجوں پر حملوں کا دوبارہ آغاز کر دیا۔

اس دوران قبائلی علاقے کے دیگر حصوں میں اس اس کے ساتھ ہی صوبہ سرحد کی وادیء سوات میں بھی اس کی مثال کی پیروی کی جانے لگی۔ حافظ گل بہادر نے شمالی وزیرستان میں حقانی نیٹ ورک کے زیر انتظام علاقے کے اندر ہی پاکستانی طالبان کے نام سے ایک تنظیم قائم کر ڈالی تھی۔ نیک محمد کے قبیلے سے تعلق رکھنے والے مولوی نذیر نے محسود کی کمان والے علاقے کے عین جنوب میں جنوبی وزیرستان کے ایک علاقے میں اپنی ایک نئی تنظیم تشکیل دے دی۔ باجوڑ میں یہی کام فقیر محمد نے کیا اور ملا فضل اللہ نے جو سوات میں ٹی این ایس ایم کے رہنما کے طور پر اپنے قید کی سزا بھگتنے والے سُسر صوفی محمد کا جانشین بننے میں کامیاب ہو گیا تھا، پاکستانی طالبان کی طرز پر اس تنظیم کو دوبارہ بحال کرنے کا کام شروع کر دیا۔ اگرچہ درج بالا کا شمار اس عرصے کے دوران منظر عام پر آنے والے انتہائی اہم پاکستانی طالبان رہنماؤں میں ہوتا ہے، مگر ان کے مقابلے میں دوسرے ایسے رہنما بھی موجود تھے جو باقی ماندہ قبائلی علاقے کے اکثر حصوں میں چھوٹی یا غیر اہم تنظیمیں چلا رہے تھے۔ شروع شروع میں وجود میں آنے والی ایسی اکثر تنظیمیں خود مختار قسم کے ایسے گروپ تھے جن کے مقاصد صرف اپنے علاقوں تک ہی محدود تھے۔ تاہم اس حوالے سے فقیر محمد کو

استثنیٰ حاصل تھا۔ ایک نوجوان کے طور پر وہ ٹی این ایس ایم کے رہنما صوفی محمد کا پیروکار رہا تھا اور سوات میں کافی وقت گزار چکا تھا۔ بعض مثالوں میں نئے پاکستانی طالبان کے حرکت عمل میں آنے کی وجہ وہی محرکات تھے جنہوں نے نیک محمد کو اس راہ پر ڈالا تھا۔ فوج ان کی پناہ میں موجود القاعدہ کے جہادیوں کی تلاش میں نکلی تھی اور انہوں نے فوج کی اس کوشش کی مزاحمت کی تھی۔ بعض تو یقیناً جنوبی وزیرستان میں نیک محمد اور بیت اللہ محسود کی کامیابیوں سے اتنے متاثر تھے کہ انہوں نے اپنے اپنے علاقوں میں بالکل انہی کی طرح بننے کی امید کے ساتھ سرگرمیاں شروع کر دی تھیں۔

یہ پاکستانی طالبان بہت سخت قسم کے جنگجو تھے اور افغان خانہ جنگی کے طویل تجربے کے ساتھ ہی القاعدہ کے جہادیوں اور دوسرے غیر ملکی مجاہدین کی مدد حاصل ہونے کی بناء پر ان کو اپنے علاقوں کا انتظامی کنٹرول روایتی قبائلی سرداروں سے چھین کر اپنے ہاتھ میں لینے کا فن آتا تھا۔ قبائلی علاقوں کے مدرسوں سے نکلنے والے طلباء جو چند برس قبل افغانستان میں طالبان کی صفوں میں شمولیت کرنے کے لئے نکل پڑتے، اب ان کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے۔ اور یہی کچھ جیشِ محمد کی طرح کی پنجاب سے ابھرنے والی تنظیموں کے ناراض کارکنوں نے کیا، جن کی اکثریت نے پاکستان کے شہری علاقوں میں پہلے سے ہی القاعدہ کے ساتھ کام کرنا شروع کر دیا تھا تاکہ نائن الیون کے فوراً بعد اگلے برس مغربی اہداف اور پاکستانی حکام کو نشانہ بنانے کے لئے شروع کی جانے والی کارروائیوں میں ان کی مدد کر سکیں۔ اس امر کا امکان بھی لگتا ہے کہ ان تنظیموں کی تشکیل میں القاعدہ کی حوصلہ افزائی نے اہم کردار ادا کیا ہوگا۔ القاعدہ کی قیادت کا پاکستانی حکومت کی طرف سے ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینک دینے کی کوششوں کی مزاحمت سے نہ صرف ذاتی مفاد وابستہ تھا بلکہ اس کے خیال میں افغانستان پر دوبارہ اپنا تسلط قائم کرنے تک قبائلی علاقے ان کے لئے مجبوری بن چکے تھے کیونکہ اس کے علاوہ انہیں کہیں اور پناہ ملنی مشکل تھی۔ ان کی حوصلہ افزائی کے کامیاب نتائج برآمد ہوئے کیونکہ جب ریاست اور القاعدہ کے درمیان چناؤ کا وقت آیا تو بہت سے پاکستانی طالبان نے بالکل وہی فیصلہ کیا اس سے قبل ان کے پنجابی دیوبندی بھائیوں نے کیا تھا۔ یعنی القاعدہ کی رفاقت میں ریاست کے خلاف جنگ۔

ان مختلف تنظیموں کی مشترکہ خصوصیت ان کی پاکستانی قومیت تھی۔ پاکستانی فوج نے

بظاہر افغان طالبان کو پاکستان کے اندر یکا وتنہا چھوڑ دیا تھا۔ اس ذیل میں نہ صرف ملا عمر آ جاتا تھا جو کہ اپنے اعلیٰ عہدیداروں کے ساتھ جنہیں بعد میں کوئٹہ شوریٰ کا نام دیا گیا تھا، بلوچستان کے اپنے آبائی علاقے میں مقیم تھا، بلکہ شمالی وزیرستان کے علاقے میراں شاہ میں صدر دفاتر قائم کرنے والا حقانی نیٹ ورک بھی شامل تھا۔ اسی طرح قبائلی علاقوں میں اپنی کمین گاہ قائم کرنے والے گلبدین حکمت یار کو بھی اکیلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ افغان طالبان کے زیر انتظام آنے والے علاقوں میں القاعدہ کے کوئی ارکان موجود نہیں تھے۔ ان کی موجودگی قائم اور ابھی بھی نمایاں ہے، تاہم اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہاں پاکستانی فوج نے حقانی نیٹ ورک یا حکمت یار کے خلاف کبھی کوئی کاروائی کی ہو۔ فوج نے حتیٰ کہ، میراں شاہ میں فرنٹیئر کور کی ایک چوکی بھی قائم رکھی ہوئی ہے جس کے عملے اور حقانی نیٹ ورک کے درمیان بڑے گہرے اور بے تکلفانہ مراسم ہیں۔ یہ وہی چوکی ہے جہاں سے نیویارک ٹائمز کا نمائندہ ڈیوڈ رھوڈ 2009 میں خود کو جلال الدین حقانی کے اس بیٹے کی قید سے چھڑا کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا تھا جس نے اس کو سڑک کے کنارے کسی جگہ یرغمالی بنا رکھا تھا۔ پاکستان القاعدہ کے جہادیوں پر حملہ صرف اور صرف پاکستانی طالبان کے تحفظ کی چھتری کے نیچے رہ کر کرتا نظر آتا ہے، ایسا پہلا حملہ کلوشہ پر کیا گیا تھا، اس لئے نہیں کہ اس میں ملوث طالبان پاکستانی تھے بلکہ اس لئے کہ وہ افغانی نہیں تھے۔ اس راز کی تہہ تک پہنچنا کوئی مشکل کام نہیں ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ پاکستان نے افغان طالبان کو صرف اس لئے اکیلا نہیں چھوڑا کہ ان کے نزدیک انہوں نے مستقبل میں افغانستان میں کوئی کردار ادا کرنا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ وہ ان کی شکست کے نتائج کا سامنا کرنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتے تھے۔ اگر افغان طالبان منظر سے اچانک ہی غائب ہو جاتے تو امریکہ تقریباً یقینی طور پر افغانستان سے نکل چکا ہوتا اور یوں انڈیا اس جگہ پر ایک غالب بیرونی طاقت کی حیثیت سے اپنے قدم جما لیتا جسے کہ وہ پہلے ہی ایک مخاصمانہ افغان ریاست سمجھتے تھے۔

پاکستانی تناظر سے دیکھا جائے تو پاکستانی طالبان سے ہاتھا پائی ایک بدترین صورتحال میں بہترین ترجیح تھی۔ القاعدہ کی تلاش میں آخر کار قبائلی علاقوں کی طرف پیش قدمی کر کے انہوں نے امریکہ پر یہ ظاہر کر دیا تھا کہ وہ اپنی کارکردگی دکھانے میں واقعی سنجیدہ ہیں۔ وہ طالبان کے ساتھ ٹکر لے کر بھی امریکہ کی نظروں میں اپنا تاثر بہتر بنا رہے تھے کیونکہ افغانستان میں طالبان کی

بڑھتی ہوئی باغیانہ سرگرمیوں کی بناء پر وہاں موجود امریکی فوجی خطرات کی زد میں تھے۔ اگرچہ یہ درست تھا کہ وہ پاکستانی طالبان کے تعاقب میں تھے اور افغان ورائٹی کو ایک جانب رکھ دیا گیا تھا۔ وقت کے اس موڑ پر اس امر پر یقین کرنے کی کوئی وجہ نہیں تھی کہ امریکہ اس تفریق یا باریکی سے آگاہ تھا۔ علاوہ زیں اگرچہ پاکستان صرف پاکستانی طالبان کو ہی نشانہ بنا رہا تھا، مگر یہ حقیقت کہ بعض طالبان طاقتیں قبائلی علاقوں میں پاکستانی فوج کے خلاف صف آراء تھیں، اس امر کی جانب اشارہ کرتی نظر آتی تھی کہ وہ افغانستان میں امریکی فوجوں کے خلاف نہیں لڑ رہے تھے۔ اور اس کے لئے امریکہ کو شکر گزار ہونا چاہئے تھا۔

اگرچہ قبائلی علاقوں میں ہونے والی لڑائی کا ہدف افغان طالبان نہیں تھے مگر اس کی وجہ سے ان کی زندگی پھر بھی اجیرن ہوتی جا رہی تھی۔ اس کے نتیجے میں وہ طاقتیں کمزور ہوتی جا رہی تھیں جو بصورت دیگر افغانستان میں لڑ رہی ہوتیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ اس بات پر بھی پاکستان سے ناراض تھے کہ اس نے قبائلی علاقوں میں اپنی فوجیں داخل ہی کیوں کی تھیں، تاہم وہ کسی طرح سے بھی مزاحمت کرنے کی پوزیشن میں نہیں تھے کیونکہ پاکستان کی طرف سے ان کی وہاں اور بلوچستان دونوں جگہوں پر موجودگی کو برداشت کرنا اس لئے بھی اہم تھا کہ اس طرح وہ افغانستان میں کچھ نہ کچھ کرنے کے قابل تو رہ گئے تھے۔ یہ ممکن ہے بلکہ یقینی امکان ہے کہ آئی ایس آئی نے انہیں پہلے ہی اس امر کی یقین دہانی کرا دی ہو کہ جب تک وہ اس علاقے میں جاری جنگ سے دور رہتے ہیں انہیں خوفزدہ ہونے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ وہ اس حقیقت سے بھی بخوبی آگاہ تھے کہ ان کے پاکستانی طالبان ساتھی فوج کے ساتھ اس لئے محاذ آراء ہیں تا کہ القاعدہ کو تحفظ فراہم کیا جا سکے۔ تاہم اس امر کا کوئی ثبوت نہیں ہے کہ انہوں نے پاکستانی طالبان کی کبھی حوصلہ افزائی کی ہو کہ وہ اپنے عرب مہمانوں یا اپنی صفوں میں موجود غیر ملکی مجاہدین کے ساتھ تصادم کرتے رہے تھے۔ ان کی وجہ سے چونکہ افغانستان ان کے ہاتھوں سے نکل گیا تھا اس لئے وہ انہیں چھوڑ دینے پر آمادہ نہیں تھے کہ وہ پھر واپس وہیں پہنچ جائیں۔

تاہم، افغان طالبان کا سب سے عظیم مفاد اسی میں تھا کہ قبائلی علاقوں میں جاری جنگ اپنے اختتام کو پہنچ جائے۔ جون 2006 میں سراج الدین حقانی جو کہ نیٹ ورک کے روز مرّہ معاملات کی نگرانی کے حوالے سے اپنے باپ کا جانشین بن چکا تھا، خود ذاتی طور پر ملوث ہو گیا۔ وہ

تصادم کے ان واقعات کے جواب میں متحرک ہوتا نظر آ رہا تھا جو خود اس کے اپنے علاقے میں فوج اور حافظ گل بہادر کے وفادار جنگجوؤں کے درمیان پیش آ رہے تھے۔ اس نے ایک اعلامیہ جاری کر دیا تھا جس کے مطابق اگرچہ افغانستان میں جاری جہاد ''خون کے آخری قطرے تک'' جاری رہنا چاہیئے تھا مگر پاکستانی فوج کے خلاف جنگ ''طالبان کی پالیسی سے مطابقت نہیں رکھتی تھی'' بیت اللہ محسود نے اس پر بظاہر مثبت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے فوج کے ساتھ اپنی جنگ بندی کی حکمت عملی کا از سر نو اعادہ کر ڈالا۔ جنوبی وزیرستان میں مولوی نذیر اور شمالی وزیرستان میں گل بہادر نے اسی طرز عمل کا مظاہرہ کیا۔ موخر الذکر جنگ بندی نے شمالی وزیرستان کے اس امن معاہدے کی راہ ہموار کی تھی جس پر ستمبر میں عملدر آمد کیا گیا تھا۔ جیسا کہ گزشتہ معاہدوں میں ہوا تھا، فوج ایک مرتبہ پھر اپنی جارحانہ نگران سرگرمیوں کو روکنے اور خود کو بیرکوں تک محدود رکھنے پر آمادہ ہو گئی تھی۔ جواب میں پاکستان طالبان نے فوج کے اوپر حملے روک دینے اور سرحد پار افغانستان کے اندر روائیوں سے باز رہنے کی یقین دہانی کروا دی تھی۔ القاعدہ جہادیوں اور دوسرے غیر ملکی جنگجوؤں کو شمالی وزیرستان چھوڑ دینے کا حکم دے دیا گیا تھا۔ تاہم ایک الگ شق بھی رکھی گئی تھی: وہ جو ابھی نکل جانے کے قابل نہیں تھے وہ اس وقت تک یہاں قیام کر سکتے تھے جب تک کہ ان کی سرگرمیاں پر امن اور معاہدے کی شرائط کی پاسداری جاری رہتی۔

یہ اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں ہے کہ پاکستانی حکام کو یہ معاہدہ کیوں پسند تھا۔ اس میں تصادم ختم کرنے کا اعلان کر دیا گیا تھا کیونکہ فوج اور عوام دونوں ہی اسے ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھتے تھے۔ القاعدہ کے جہادیوں کا تعاقب اور چیز تھی، مگر طالبان نائن الیون سے بھی پہلے کے حلیف تھے۔ پاکستانی طالبان بھی ہم وطن لوگ تھے، یعنی ایک ایسی حقیقت جس کے باعث صورتحال اور بھی بدتر ہو گئی تھی۔ اور اس سے بھی بدتر اس لئے کیونکہ یہ جنگ امریکہ کے ایماء پر لڑی جا رہی تھی اور طالبان کے ساتھ ہی القاعدہ کو بھی پاکستانی سرزمین پر دھکیلنے کی ذمہ داری اسی ملک پر ہی عائد ہوتی تھی۔ یہ نکتہ بہت کم لوگوں نے ذہن نشین رکھنے کی کوشش کی تھی کہ یہ طالبان کو پاکستان کی طرف سے امداد و تعاون فراہم کرنے اور طالبان کی طرف سے نائین الیون کے مجرموں کو تحفظ فراہم کرنے کا نتیجہ ہی تھا۔ جیسے جیسے نائین الیون قصہ پارینہ بنتا جا رہا تھا، ویسے ویسے دہشت گردی کی جنگ میں امریکہ کا ساتھ دینے والی طاقتوں کی مقبولیت کا گراف تیزی سے نیچے گرتا جا

رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس شخص کی مقبولیت بھی جو اس حوالے سے تعاون کرنے میں پیش پیش رہا تھا، یعنی پرویز مشرف۔ اسے سیاسی تائید و تعاون کی اشد ضرورت تھی اور پاکستانی طالبان کے ساتھ امن معاہدے ہی اس کی ضمانت دے سکتے تھے۔ آنے والے مارچ میں باجوڑ میں فقیر محمد کے ساتھ اسی طرح کا معاہدہ کرنے کے ساتھ ہی ان معاہدوں کا سلسلہ پایہء تکمیل تک پہنچ گیا اور قبائلی علاقوں میں نسبتاً امن ہو گیا۔ مگر اس کی قیمت بھی چکائی تھی۔ یہ علاقہ بڑے موثر انداز میں حکومت پاکستان کے قابو سے باہر نکل چکا تھا۔ اب اس کا انتظام طالبان کے ہاتھوں میں تھا۔

امریکہ نے پہلے پہل شمالی وزیرستان معاہدے کی حمایت کی تھی۔ صدر بش نے اس پر فریقین کے دستخط ہو جانے کے دو ہفتے بعد مشرف کے ساتھ کی جانے والی مشترکہ پریس کانفرنس میں خود بھی اس کی توثیق کر دی تھی۔ ایسا کرنے کی ظاہری وجہ غالباً اپنے مہمان کی قدر افزائی کرنا ہی ہو سکتی تھی کیونکہ یہ یقین کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ امریکی حکومت میں کسی کو اس سے مثبت نتائج برآمد ہونے کی توقع ہوئی ہو گی۔ افغانستان میں سرایت کر جانے پر پابندی کا انحصار صرف اور صرف طالبان کی نیک نیتی پر تھا۔ اس حوالے سے عملدرآمد کا کوئی طریق کار معاہدے میں موجود نہیں تھا اور اصل مجرم یعنی افغان طالبان اس معاہدے میں شریک ہی نہیں تھے۔ القاعدہ اور دوسرے غیر ملکی جنگجوؤں کے حوالے سے موجود شق اور بھی زیادہ سردرد کا باعث تھی۔ اس کے مطابق انہیں شمالی وزیرستان چھوڑنے کا حکم تو دے دیا گیا تھا، تاہم ساتھ یہ چھوٹ بھی موجود تھی کہ اگر وہ درست طرز عمل کا مظاہرہ کریں تو وہاں قیام کر سکتے تھے۔ مگر امریکہ ایسے معاہدے کی ظاہری حمایت پر بھی کیوں آمادہ تھا؟ اس کی ایک ممکنہ وضاحت تو یہ ہے کہ دونوں فریق اس امر پر متفق ہو چکے تھے کہ قبائلی علاقوں میں القاعدہ کے جہادیوں کو آمادہ کرنے کے دوسرے طریقے اپنائے جائیں۔ گزشتہ برس امریکہ نے وہاں القاعدہ کے اہم ترین ٹھکانوں کو دو مرتبہ پری ڈیٹر میزائلوں کا نشانہ بنایا تھا، ایک مرتبہ نومبر 2005 میں اور دوسری مرتبہ جنوری 2006 میں۔ پہلے کامیاب حملے میں ابوحمزہ رابع کو نشانہ بنالیا گیا تھا جو کہ اس وقت القاعدہ کی تیسری اہم شخصیت تھی۔ دوسرا نشانہ ایمن الظواہری تھا جو کہ القاعدہ میں دوسرے نمبر پر تھا۔ اس کوشش میں ایک رہائش گاہ کے احاطے کو نشانہ بنایا گیا جس میں کم سے کم اٹھارہ افراد ہلاک ہو گئے تھے جن میں کہ عورتیں اور بچے بھی شامل تھے۔ غلط اطلاعات کی فراہمی یا پھر بدقسمتی کے باعث الظواہری اس وقت وہاں موجود نہیں تھا اگر چہ مرنے

والوں میں دو نچلے درجے کے القاعدہ عہدیداران شامل تھے۔ یہ حملہ جس کا امریکہ نے اعتراف کیا تھا کہ اس کی طرف سے کیا گیا تھا، پاکستان میں اچھے خاصے اشتعال کا باعث بن گیا، محض اس لئے نہیں کہ اس میں معصوم زندگیوں کا نقصان ہوا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ یہ پاکستان کی خودمختاری کو مجروح کرنے کے مترادف تھا۔ شوروغوغا اس قدر زیادہ تھا کہ پاکستانی حکومت کو اس کی مذمت پر مجبور ہونا پڑا۔

اگرچہ یہ ممکن ہے کہ یہ حملے پاکستانی حکومت کے علم یا منظوری کے بغیر کئے گئے ہوں، مگر اس امر کا امکان نظر نہیں آتا کہ امریکہ ایک ایسے تعلق کو خطرے سے دوچار کر دے گا جو خطے میں اس کے اہداف کے حصول کے نکتہ ءنظر سے انتہائی ناگزیر تھا۔ اس امر کا غالب امکان ہے کہ پاکستان نے حملوں کی نہ صرف پیشگی منظوری دے دی ہو بلکہ مطلوبہ اہداف کو نشانہ بنانے کے حوالے سے درکار خفیہ اطلاعات بھی فراہم کر دی ہوں۔ یہ دونوں حملے انتہائی اہم اہداف کو نشانہ بنانے کے لئے کئے گئے تھے اور اگر ایمن الظواہری پر ہونے والا حملہ کامیاب ہو جاتا تو اس کے انتہائی مثبت نتائج برآمد ہوتے۔ اس حملے میں ناکامی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والا شوروغوغا اس خطرے کی طرف اشارہ کرتا ہے جسے مول لے کر یہ حملہ کیا گیا تھا۔ تاہم ہوسکتا ہے کہ یہ فیصلہ خود پاکستان نے کیا ہو کہ قبائلی علاقوں میں جا کر کارروائیوں کا خطرہ مول لینے سے یہ بہتر تھا کہ وہاں پری ڈیٹر حملے کیے جائیں۔ اس پالیسی کے نتیجے میں نہ صرف یہ کہ القاعدہ کے کسی اعلیٰ عہدیدار تک رسائی میں ناکامی کا سامنا کرنا پڑا بلکہ پاکستانی طالبان بھی دشمن بن گئے تھے۔ غالباً پاکستان کا اصرار یہ تھا کہ میزائل حملوں کو کم سے کم سطح پر رکھا جائے اور ان کا نشانہ بھی صرف القاعدہ کی انتہائی اہم شخصیات کو ہی بنایا جائے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کا تقریباً یقینی طور پر یہ اصرار بھی تھا کہ حکومت پاکستان کی شرکت یا رضامندی کو بالکل خفیہ رکھا جائے۔ امریکہ کو غالباً یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ خود پاکستان کی طرف سے ان حملوں کی شدید مذمت کی جائے گی تاکہ عوام کو یہ یقین دلایا جا سکے کہ یہ حکومت پاکستان کی رضامندی کے بغیر کئے جا رہے ہیں۔ اگر اس طرح کی کوئی منصوبہ بندی کی گئی تھی تو اس میں بری طرح ناکامی ہوئی۔ بہت سے پاکستانیوں کا، جو کہ تاریخی طور پر سازشی نظریوں کے شوقین ہونے کے ساتھ ہی جاگیردارانہ انداز کے سیاسی نظام کی ریشہ دوانیوں کے بھی عادی ہو چکے ہیں، اس امر پر تقریباً شروع سے ہی یقین تھا کہ حکومت اس ساری صورتحال

میں خود بھی ملوث ہے۔

اگرچہ قبائلی علاقوں میں القاعدہ کی موجودگی کا توڑ کرنے کے حوالے سے پریڈیٹر استعمال کرنے کی سہولت کی شکل میں امریکہ کے ہاتھ میں ممکنہ طور پر ایک موثر ہتھیار آ گیا تھا، تاہم شمالی وزیرستان کے معاہدے سے امریکہ کو افغانستان کے اندر کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہوا تھا۔ یہ محض ایک تدبیر تھی جس کو پاکستان نے قبائلی علاقوں میں جاری لڑائی ختم کرنے کے لئے استعمال کیا تھا نہ کہ ایک ایسی سنجیدہ کوشش جس کا مقصد طالبان کو پاکستانی سرزمین سے ڈیورنڈ لائن کے اس پار حملے کرنے سے باز رکھنا تھا۔ اور حقیقت میں اس کے بالکل ہی الٹ نتائج برآمد ہوئے۔ فوج کو قبائلی علاقوں میں مصروف رکھنے کی ضرورت سے آزاد ہو کر پاکستانی طالبان اب اس قابل ہو گئے تھے کہ اپنی توجہ ایک مرتبہ پھر افغانستان کی طرف مبذول کر سکیں۔ اس ملک میں امریکی فوجوں کے کمانڈر لیفٹیننٹ جنرل کارل ایکینبری نے احمد رشید کو بتایا تھا کہ شمالی وزیرستان معاہدے کے نتیجے میں قبائلی علاقوں سے کئے جانے والے باغیانہ حملوں میں تین گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ یہ صورتحال پاکستان کے لئے بہت موافق تھی۔ وہ یہ چاہتا تھا کہ طالبان افغانستان میں فتح سے ہمکنار ہوں یا کم از کم شکست ان کا مقدر نہ ہو۔ اور بالکل یہی کچھ ہو رہا تھا۔ آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کے آغاز کے پانچ برس بعد طالبان دوبارہ عروج کی طرف گامزن تھے۔ نصف افغانستان پر ان کی کم یا زیادہ مستقل حکمرانی قائم ہو چکی تھی۔ باغیانہ حملوں کی تعداد میں بھی ہر ماہ اضافہ ہوتا چلا جا رہا تھا۔ مارچ 2006 میں حملوں کی تعداد 300 تھی؛ ستمبر تک یہ تعداد بڑھ کر 600 ہو چکی تھی۔ حتیٰ کہ کابل میں تعینات امریکی سفیر کو بھی مجبور ہو کر واشنگٹن کو اس امر سے آگاہ کرنا پڑا کہ امریکہ اب کسی طرح بھی جنگ نہیں جیتنے لگا۔ ایک ایسی جنگ جسے مفروضہ طور پر پانچ برس قبل اختتام پزیر ہو جانا چاہئے تھا۔

مسئلہ، جیسا کہ شروع سے ہی نظر آ رہا تھا اعداد و شمار کا تھا، اور اس کی بنیادی ذمہ داری عراق کی جنگ پر عائد ہوتی تھی۔ شمالی وزیرستان کا معاہدہ ایک ایسے وقت میں سامنے آیا جب کہ عراق پر قبضے کے حوالے سے امریکہ کی قسمت کا ستارہ اپنے زوال کی انتہاء کو پہنچا ہوا تھا۔ وہاں پر تعینات امریکی فوجیوں کی تعداد 140,000 سے تجاوز کر چکی تھی، مگر اس کے باوجود وہاں تشدد کی بڑھتی ہوئی لہر پر قابو پانے یا حتیٰ کہ دارالحکومت بغداد کے اندر بھی استحکام نام کی کوئی چیز وجود میں

لانے کے لئے یہ تعداد ناکامی تھی۔ تاہم افغانستان میں تعینات فوجیوں کی صورتحال اس سے بھی بدتر تھی، اس وقت وہاں بّری فوجیوں کی تعداد صرف 20,000 تھی۔ مدد کے لئے اشد پریشان ہوکر امریکہ نے اپنے نیٹو کے رکن ممالک سے درخواست کی کہ وہ اس عظیم بوجھ کو اٹھانے میں اس کا زیادہ سے زیادہ ساتھ دیں۔ ان میں سے اکثر وہاں پہلے ہی سے انٹرنیشنل سیکیورٹی اسسٹنس فورس(ISAF) یا ایساف کی امن فوج کے دستوں کی صورت میں اپنا کردار ادا کررہے تھے، جن کو وہاں اگست 2003 میں اس وقت تعینات کیا گیا تھا جب میں امریکہ میں نیٹو کا دفتر چھوڑ کر رخصت ہورہا تھا۔ مگر اب امریکہ نیٹو میں شامل اپنے حلفیوں سے یہ مطالبہ کررہا تھا کہ وہ لڑنے والی فوج کے لئے بھی افرادی قوت فراہم کریں۔ یہ ایک مشکل سودا تھا کیونکہ ان کی اکثریت پہلے ہی عراق جنگ کی مخالفت کرچکی تھی اور اب اس مطالبے پر سخت بیزار تھی کہ امریکہ کو افغانستان کی دلدل سے نکالا جائے۔ اور جبکہ حلیف ممالک مدد کرنے پر آمادہ ہوبھی گئے تھے تو پھر بھی ان ممالک کی حواس باختہ پارلیمنٹس اپنی فوجوں کے استعمال کے حوالے سے شرائط عائد کرنے کے قوانین بنا رہی تھیں۔ 2006 میں اس طرح کی 71 پابندیاں عائد تھیں۔ مثال کے طور پر جرمن فوجیوں کو رات کے وقت اپنے مورچوں سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی اور دن کے وقت بھی گشت کی صورت میں ایمبولنس گاڑیوں کا ہمراہ ہونا ضروری تھا۔ بہرحال 2006 کی خزاں تک نیٹو کی حلیف فوجیں امریکی فوجوں کو ملک کے بہت سے حصوں میں یا تو قوت فراہم کررہی تھیں یا پھر ان کا بوجھ ہلکا کر رہی تھیں، اور ایساف کی فوجوں نے جنوب میں فوجی کارروائیوں کی ذمہ داری خود سنبھال لی تھی۔ تاہم یہ سب کچھ ابھی بہت ناکافی تھا۔

جس وقت یہ سب کچھ ہورہا تھا، اس وقت امریکہ کے اس انداز میں بھی بہت نازک مگر اہم تبدیلی واقع ہورہی تھی جس انداز میں وہ طالبان کو دیکھتا آرہا تھا۔ وہ اصل دشمن نہیں تھے۔ امریکہ نے آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کا آغاز القاعدہ کو تباہ کرنے کے لئے کیا تھا نہ کہ طالبان کو کچلنے کے لئے۔ طالبان پر نزلہ اس لئے گرا تھا کہ وہ راہ میں حائل تھے۔ اگر ملا عمر بن لادن کو بمباری شروع ہونے سے قبل ہی حوالے کرنے کے لئے تیار ہوجاتا تو ہوسکتا تھا کہ وہ نشانے کی زد میں ہی نہ آتے۔ مگر 2006 تک افغانستان میں زمینی حقائق میں اچھی خاصی تبدیلی آچکی تھی۔ القاعدہ اب وہاں اتنی نمایاں موجودگی نہیں رکھتی تھی۔ اسامہ بن لادن اور القاعدہ کی بچی کچھی قیادت کو نکال کر

سرحد کے پار، غالباً پاکستان کے قبائلی علاقوں کی طرف دھکیل دیا گیا تھا۔ اس کے باوجود امریکہ افغانستان میں طالبان کے خلاف جنگی محاذوں پر مسلسل برسرپیکار تھا۔ نہ صرف یہ اس نے خود کے نزدیک مایوس کن کام میں بھی الجھا لیا تھا۔ اس نے مایوس کن حد تک بدعنوان کرزئی حکومت کی اصلاح کو ایک ترجیح بناتے ہوئے شمالی اتحاد کی بدحال اور بچی کھچی فوجوں کو ایک باوقار افغان فوج کی شکل میں یکجا کرنے کا عزم بھی کر لیا تھا۔ اس نے افغانستان سے مت کی تجارت کو بھی جڑ سے اکھاڑنے کا حتمی فیصلہ کر لیا تھا، اگر چہ اس طرح ہفیم ۔۔۔۔۔۔ یا پوست کے کاشتکار اپنی روزی کا لاحق خطرے کے پیش نظر طالبان کی ایک اور فوج بن کر رہ جائے۔ اس طرح امریکہ میں کام کرنے والی حقوق نسواں کی تحریکوں کا بھی دباؤ تھا کہ انتہائی پسماندہ افغان معاشرے میں خواتین کو روایتی طور پر جو ثانوی درجہ حاصل ہے اس حوالے سے بھی کوئی انقلابی تبدیلی لائی جائے۔ افغانستان، یوں محسوس ہوتا تھا جیسے عظیم اصلاحات کے علمبرداروں کی آماجگاہ بن کر رہ گئی تھی۔ اپنے ملک کا نظم و نسق دوبارہ اپنے ہاتھوں میں لینے کی کوشش میں طالبان خود کو القاعدہ کے محافظوں کی بجائے ان کا حقیقی دشمن بنا بیٹھے۔ اور امریکہ کے لئے طالبان کو کامیاب ہونے سے روکنا ہی ایک مقصد بنتا جا رہا تھا۔ بے شک افغانستان میں قیام کا حقیقی مقصد ایک ایسی باگ دوڑ طالبان کے پاس اور القاعدہ کو سرگرمیوں کی کھلی چھٹی دینا ہو، بمشکل ہی بنایا گیا تھا۔

اس دوران، قبائلی علاقوں میں، پاکستانی طالبان شمالی وزیرستان معاہدے سے پیدا ہونے والی نسبتاً امن وامان کی صورت حال سے لطف اندوز ہو رہے تھے "نسبتاً" کا لفظ یہاں اس لئے مناسب نظر آتا ہے کیونکہ جنگ بندی کے ان مختلف معاہدوں کی وقتاً فوقتاً خلاف ورزی کی جاتی رہتی تھی جن کا اطلاق مفروضہ طور پر پورے خطے پر ہونا چاہئے تھا۔ اس کی سب سے بدنام زمانہ مثال اس وقت سامنے آئی جب جنوری 2007 میں جنوبی وزیرستان کے علاقے حمزولہ پر ایک خودکش حملہ آور نے ایک عدد کار بمعہ بم شمالی وزیرستان کے اندر میر علی کے علاقے کے قریب فوج کے ایک قافلے سے ٹکرا دی۔ اس حملے کی ذمہ داری بیت اللہ محسوس پر ڈال دی گئی۔ اسی طرح جنوبی وزیرستان کی سرحد سے پرے صوبہ سرحد کے شہر ٹانک کے نواح میں بھی جھڑپیں دیکھی گئیں اس طرح کے واقعات صورتحال کی نزاکت کی عکاسی کر رہے تھے، تاہم یہ کبھی کبھار ہی ہوتے تھے نہ کہ باقاعدگی سے۔

پاکستان کی بہترین روایات کے مطابق حکام نے خود کو ایک مشکل صورتحال میں الجھا لیا اور اس کا حل ان کے نزدیک لازماً یہی راستہ بہتر ہوگا۔ یہ سچ تھا کہ قبائلی علاقوں پر ان کا موثر کنٹرول نہیں رہا تھا، تاہم انہیں اس حقیقت کا ادراک کرنا چاہیئے تھا کہ یہ کوئی اتنی بڑی مصیبت نہیں تھی کیونکہ قبائلی علاقے کبھی بھی مکمل طور پر پاکستان کے نظم و نسق کا حصہ نہیں رہے تھے۔ امریکہ کا مسئلہ، یقیناً ابھی تک موجود تھا۔ امریکہ کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ شمالی وزیرستان کا معاہدہ بنیادی طور پر کسی قسم کی کاروائی سے گریز کا ایک بہانہ تھا اور اسی لئے اس نے پاکستان پر مزید کارکردگی دکھانے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا۔ واشنگٹن اس کو مجبور کر رہا تھا کہ پری ڈیٹر میزائل حملوں میں اضافے کی اجازت دی جائے، جن میں سے کوئی حملہ بھی پاکستانی طالبان کے ساتھ ہونے والے معاہدوں میں سے کسی ایک یا دو کی دھجیاں اڑا کر رکھ سکتا تھا۔ اہم نکتہ یہ تھا کہ ان پر قائم رہنے کی کوشش کی جاتی۔ امریکہ کو ایک دن افغانستان سے نکل جاتا تھا اور قبائلی علاقوں میں صورت حال معمول پر آنی شروع ہو جاتی۔ پاکستان جس نکتے کو سمجھنے میں ناکام رہا وہ یہ تھا کہ پاکستانی طالبان کے ساتھ اس کے تعلقات پہلے ہی اتنے بگڑ چکے تھے کہ ان کا معمول پر آنا ممکن نہیں رہا تھا۔ یہ احساس آنے والی گرمیوں کی دھماکہ خیز طور اچانک آمد کے ساتھ آیا۔ یہ احساس قبائلی علاقوں میں پیش آنے والے واقعات کے نتیجے میں نہیں بلکہ پاکستان کے دارلحکومت، اسلام آباد کے عین مرکز میں واقع لال مسجد کے واقعے کے نتیجے میں اجاگر ہوا۔

7

لال مسجد،فوج کی ناکامی،اورملکی دہشت گردی کی مہم

لال مسجد، اسلام آباد کے عین مرکز میں اس جگہ سے زیادہ سے زیادہ ایک میل کے فاصلے پر واقع ہے جہاں میں نے رہائش رکھی ہوئی تھی۔ دارالحکومت کی سب سے بڑی دیوبندی مسجد کا انتظام وانصرام دو بھائیوں عبدالعزیز اور عبدالرشید غازی کے پاس تھا جو کہ غازی برادران کے نام سے مشہور تھے۔ مسجد کے علاوہ دو مدرسے بھی ان کے زیرانتظام تھے، جن میں سے ایک جامعہ حفصہ خواتین کے لئے مخصوص اور مسجد کے احاطے کے اندر واقع تھا۔ جبکہ مردوں کا مدرسہ وہاں سے کئی میل دور اسلام آباد کے شمالی علاقے کی حدود کا تعین کرنے والی سرسبز مارگلہ پہاڑیوں کی تلہٹی میں بڑی قیمتی اراضی پر واقع تھا۔ غازی برادران کا شماران شدت پسند علما میں ہوتا تھا جو پاکستان کی طرف سے نائین الیون کے بعد امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف شروع کی جانے والی جنگ کی حمایت کے فیصلے سے شدید اختلاف رکھتے تھے اور حتیٰ کہ مشرف کو بھی غدار کے لقب سے نواز چکے تھے۔ دو برس گزر جانے کے بعد انہوں نے سپاہ صحابہ کے قائد مولانا اعظم طارق کے قتل کے خلاف جسے اسلام آباد کے اندر غالباً سپاہ محمد کے کارکنوں نے گولی مار کے ہلاک کر دیا تھا، ایک احتجاجی مظاہرے کا انعقاد کیا تھا۔ غازی برادران کو مزید شہرت ایک برس بعد اس وقت ملی جب انہوں نے ایک فتویٰ جاری کرتے ہوئے اعلان کیا کہ پاک فوج کے وہ جوان جو پاکستانی طالبان کے خلاف جنگ لڑتے ہوئے مارے گئے شہید نہیں ہیں۔ اگرچہ دارالحکومت کے عین مرکز میں ان کی موجودگی حکومت کے لئے ندامت وگھبراہٹ کا باعث تھی، تاہم ان کے خلاف کوئی کاروائی نہ کی گی۔

یہ2007 کے ابتدائی ماہ تھے جب صورتحال قابو سے باہر ہونا شروع ہوگئی۔ مسئلہ یہ تھا کہ دیوبندی مسجد کی تعمیر اسلام آباد کے اندر سرکاری زمین پر کی گئی تھی اوراس کے لئے حکومت سے کوئی اجازت بھی نہیں لی گئی تھی۔ بظاہر دارلحکومت میں انتہاء پسند مساجد کی بڑھتی ہوئی تعداد سے پریشان، مقامی حکام نے دو انتہائی بدنام زمانہ مساجد کو گرا کر ایسی دیگر مساجد کے خلاف بھی کاروائی کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اس کے لئے جو جواز پیش کیا گیا اس میں کوئی لگی لپٹی نہ رکھی گئی۔ ''خفیہ اداروں'' کی رپورٹ کے مطابق گرائی جانے والی مساجد ایسا مثالی محل وقوع رکھتی تھیں جہاں سے دہشت گرد حملے کرنا بہت آسان تھا۔ اس کے ردعمل میں، اور غالباً غازی برادران کے اکسانے پر جامعہ حفصہ کی طالب علم خواتین نے لال مسجد کے احاطے سے متصل بچوں کے سرکاری کتب خانے پر دھاوا بول دینے کے بعد اس پر قبضہ کرلیا۔ اس دیدہ دلیری کے مظاہرے کے باوجود انتظامیہ خاموش تماشائی بنی رہی۔ چنانچہ اس طرح مزید حوصلہ پا کر غازی برادران نے دونوں مدارس کے طلباء پر مشتمل ''پاکباز دستوں'' کی تشکیل شروع کر دی جنہیں شہر کے اندر سی ڈی/ڈی وی ڈی بیچنے والے دوکانداروں کے پاس بھیجا جاتا تاکہ وہ انہیں ڈرا دھمکا کر ان چیزوں کے ساتھ ہی مغربی تہذیب کی علامت دوسری اشیاء کی فروخت سے بھی باز رکھیں۔ یہ اخلاقیات کی نگرانی کی بالکل ویسی ہی مہم تھی جو اس سے گزشتہ عشرے کے دوران صوبہ سرحد میں منظر عام پر آئی تھی اور ان اولین تفکرات کا باعث بن گئی تھی جو پاکستان میں بڑھتی ہوئی طالبنائزیشن کے حوالے سے لاحق ہوتی جارہی تھیں۔ مگر اب یہ سب کچھ پاکستانی دارلحکومت کے عین مرکز میں عوام اور زرائع ابلاغ کی نظروں کے سامنے دن دھاڑے ہورہا تھا۔ حکام بالا اگرچہ ان کاروائیوں کی مذمت کرنے کے ساتھ ہی جوابی اقدامات کی دھمکی دے رہے تھے مگر عملی طور پر کچھ نہیں کیا گیا۔

مارچ کے اواخر میں، پاکستان کے ایک پائے کے صحافی ظفر عباس نے ان واقعات سے تحریک پاکر لال مسجد کے حوالے سے پاکستان کے ایک انگریزی روز نامے ڈان کے لئے ''سرایت کرتی ہوئی بغاوت(Creeping Coup)'' کے عنوان ایک عدد مضمون لکھ ڈالا۔ یہ عین اسی روز اخبار کی زینت بنا جس روز مولانا عبدالعزیز نے حکومت کو خبر کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایک ہفتے کے اندر اندر پورے ملک میں شریعت نافذ کردی جائے ورنہ تباہ کن نتائج کا سامنا کرنے کے لئے تیار رہے مگر حکام بالا ابھی بھی خطرے کا سدباب کرنے پر آمادہ نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا وہ

بارود کے ذخیرے پر بیٹھے ہیں اور اگر کسی طرح کی جوابی کاروائی کی گئی تو حالات مزید خطرناک رخ اختیار کرلیں گے۔ یہ حقیقت کہ عورتیں اور لڑکیاں بھی اس معاملے میں ملوث تھیں صورتحال کو مزید پیچیدہ بنا دیتی تھی۔ غازی برادران نے تشویش میں مزید اضافہ کرنے کے لئے حکومت کو خبردار کر دیا کہ اگر ان کے خلاف کوئی کاروائی کی گئی تو وہ پورے ملک کو خودکش حملوں کی آماجگاہ بنا کر رکھ دیں گے۔ اپریل میں اسلام آباد انتظامیہ نے اخلاقی ضوابط کی تلقین کی سرگرمیوں میں ملوث مدرسے کے گیارہ طالب علموں کو گرفتار کر کے محدود پیمانے کی کاروائی کر ڈالی۔ ایک ماہ بعد مدرسے کے دوسرے طالب علموں نے چار مقامی پولیس والوں کو اغوا کر کے لال مسجد کے اندر اپنی تحویل میں رکھتے ہوئے ان کی رہائی کے عوض اپنے ساتھی طالب علموں کی رہائی کا مطالبہ کر ڈالا۔ جون کے اواخر میں ایک اور ''پاکباز دستے'' نے چینی باشندوں کی طرف سے چلائے جانے والے ایک مساج پارلر پر حملہ کر کے ان میں سے اکثر کو کچھ دیر مسجد کے احاطے میں قید رکھنے کے بعد چھوڑ دیا۔اس کے ردعمل میں بیجنگ کی طرف سے کیا جانے والا احتجاج اتنا ہی اشتعال آمیز تھا جتنا کہ نایاب۔ عام طور پر ٹھنڈے مزاج کے حامل چینی بھی پاکستان کے دوسرے حصوں میں چینی باشندوں پر ہونے والے حملوں کے تازہ واقعات پر اظہار تنفر کئے بغیر نہ رہ سکے۔ بے شمار چینی انجینئرز کو بلوچستان میں ہلاک کر دیا گیا تھا اور اس کے علاوہ بے شمار دیگر کو قبائلی علاقوں میں اغواء کر لیا گیا تھا۔چینی کارکنوں کو اس لئے ہدف بنایا جا رہا تھا کیونکہ چین کے صوبے زنجیانگ میں مقامی یغور آبادی کے اندر ان انتہاء پسند مسلمانوں کو بھی حکومتی عتاب کا سامنا تھا جن میں سے چند ایک بھاگ کر پاکستان کے قبائلی علاقوں میں روپوش ہو گئے تھے۔چین کی ناراضگی ایک سنجیدہ مسئلہ تھا کیونکہ پاکستان اس کو اپنا ایک ایسا دیرپا حلیف سمجھتا تھا جس نے امریکہ کے برعکس ہر اچھے برے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔

واقعات تیزی سے اپنے خونی انجام کی طرف جا رہے تھے۔ چین کی طرف سے سخت الفاظ میں احتجاج اور اس طرح کے واقعات کے اعادے کی روک تھام کی نیت کے پیش نظر پاکستانی حکومت نے جولائی کے شروع میں لال مسجد کے گرد حفاظتی حصار قائم کر دیا۔ ہر طرف یہ افواہیں گردش کرنے لگیں کہ مسجد کے احاطے کے اندر قبائلی علاقوں سے غیر ملکی جہادی اور مقامی دیوبندی تنظیموں کے مسلح دستے اس کے دفاع کو مضبوط بنانے کی غرض سے سرایت کر چکے ہیں، پرویز

مشرف نے جون کے آخر میں فوجیوں سے خطاب کرتے ہوئے اس صورتحال میں جیش محمد کے ملوث ہونے کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ تاہم اس نے مسجد کے احاطے کے اندر بڑی تعداد میں خواتین اور بچیوں کی موجودگی کے باعث کسی قسم کی کاروائی کرنے کے حوالے سے مسلسل ہچکچاہٹ کا اظہار کیا۔ تشدد کی اولین لہر اس وقت بلند ہوئی جب 3 جولائی کو مدرسہ کے طالب علموں نے ملحقہ سرکاری عمارت پر یلغار کرنے کی کوشش کی۔ اس کے نتیجے میں فائرنگ کا تبادلہ شروع ہو گیا جس میں 25 سے زائد افراد ہلاک ہو گئے۔ بعدازاں انتظامیہ نے محاصرہ اور سخت کر دیا اور کاروائی کی نگرانی کے لئے فوج کی ایلیٹ کمانڈو فورس طلب کر لی۔ اس امر کا احساس ہونے پر کہ حکومت اس مرتبہ کاروائی کرنے میں سنجیدہ دکھائی دیتی ہے، مدرسہ کے 1200 طلباء نے اگلے دن ہی عمارت خالی کر دی جن میں مولانا عبدالعزیز بھی شامل تھا جو کہ برقع میں روپوش ہونے کی کوشش کرکرتے ہوئے تضحیک کا نشانہ بھی بنا تھا۔ اگرچہ اضافی قابضین اگلے کئی روز کے دوران چھوٹے چھوٹے گروہوں کی صورت میں برآمد ہوتے رہے تھے مگر اکیلے بچ جانے والے غازی برادر کے ساتھ گفت وشنید بے فائدہ رہی اور یوں 10 جولائی کو ہونے والی کمانڈو کاروائی کے لئے راہ ہموار ہو گئی۔ خفیہ جگہوں پر رکھے گئے دھماکہ خیز مواد سے پر محدود علاقے کے اندر ایک کمرے سے دوسرے کمرے تک ہونے والی مرحلہ وار لڑائی کے کئی گھنٹوں کے بعد آخر حکومتی طاقت غالب آ گئی سو سے زائد افراد بشمول عبدالرشید غازی ہلاک ہو گئے تھے۔ ہلاک ہونے والوں میں عورتیں اور بچے بھی شامل تھے جنہیں یا تو یرغمال بنا لیا گیا تھا یا پھر انسانی ڈھال کے طور پر استعمال میں لایا گیا تھا۔ ہلاک شدگان کی تلاش کے دوران حکومت کے دعوے کے مطابق دس غیر ملکی جہادیوں کے علاوہ ایک خط بھی دریافت کیا گیا جو کہ القاعدہ کے دوسرے نمبر پر آنے والے اعلیٰ عہدیدار ایمن الظواہری نے غازی برادران کی حوصلہ افزائی کے طور پر لکھا تھا۔

لال مسجد کے واقعے کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ اس واقعے نے پوری دنیا کو یہ باور کرا دیا تھا کہ طالبنائزیشن کی لہر صوبہ سرحد سے نکل کر پاکستان کے شہری مراکز کے اندر دور دور تک پھیل گئی ہے۔ اگرچہ لال مسجد ابھی تک اس حوالے سے سب سے بڑی ڈرامائی مثال کی حیثیت رکھتی تھی، مگر یہ اپنی نوعیت کی واحد مثال نہیں تھی۔ جنوبی پنجاب کی سرائیکی پٹی سے اس طرح کی کئی خبریں آ چکی تھیں جن کے مطابق انتہاء پسند اسلامی نظریات رکھنے والی تنظیموں کے ارکان مغربی

ثقافت کی علامت اشیاء کی فروخت کرنے والے دوکانداروں کو دھمکاتے پائے گئے تھے۔ اس سے ایک عشرہ قبل اس طرح کے واقعات وہاں بہت کم دیکھنے میں آتے تھے مگر اب ایسا نہیں تھا۔ اس علاقے کے اندر انتہاء پسند نظریات کا پرچار کرنے والی مساجد اور مدارس کی بتدریج بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر یہ صورتحال اب ناگزیر ہو چکی تھی مگر یہ سب کچھ محض سرائیکی پٹی کے علاقوں تک محدود نہیں رہا تھا۔ طالبنائزیشن کی ابتدائی علامات پنجاب کے انتظامی اور ثقافتی دارلحکومت لاہور تک سرایت کر چکی تھیں جہاں دوکانداروں کو یہ دھمکیاں ملنے لگی تھیں کہ اگر انہوں نے اپنی دوکانوں کو غیر اسلامی قسم کی اشیاء کے ذخائر سے پاک نہ کیا تو خطرناک نتائج ان کے منتظر ہوں گے۔ انہیں دھمکیوں کے نتیجے میں لاہور کے مقامی تاجروں نے مجبور ہو کر اکتوبر 2008 میں ہال روڈ کے علاقے میں بڑے پیمانے پر سی ڈیز جلا دی تھیں، ایک ایسا واقعہ تھا جس کی بڑے پیمانے پر تشہیر کی گئی تھی۔

لال مسجد کے واقعے نے پرویز مشرف کو فوری طور پر انتہاء پسند نظریات کا پرچار کرنے والی مساجد اور مدارس کے خلاف کاروائی کرنے کے حوالے سے سخت موقف اپنانے پر مجبور کر دیا، مگر وہ عملی طور پر بے بسی محسوس کر رہا تھا۔ آخری کاروائی کے نتیجے میں ہونے والی اموات اور تباہی نے عوام کے اندر پہلے ہی سخت ردعمل پیدا کر دیا تھا۔ بہت سے حلقے جو پہلے حکومت کو کمزوری دکھانے اور قوت ارادی کے فقدان کے طعنے دے رہے تھے، اب اس ساری کاروائی کو خونی انجام سے دوچار کرنے پر اسے دوبارہ کوس رہے تھے۔ سابق وزیر اعظم نواز شریف نے بھی موقع کی مناسبت سے حکومت کی طرف سے صورتحال پر قابو پانے میں بدنظمی اور نااہلیت دکھانے پر لندن سے جلاوطنی کی حالت میں مذمت بھرا بیان جاری کر دیا تھا۔ یہ نظریہ عام تھا کہ حکومت نے ضرورت سے زیادہ ردعمل کا مظاہرہ کیا ہے۔ سپریم کورٹ کے حکم پر لال مسجد کی سرگرمیاں دوبارہ بحال کر دی گئیں۔ عوام کے شدید اشتعال کے پیش نظر حکومت نے اسلام آباد یا کسی بھی اور جگہ پر کسی غیر قانونی مسجد کو دوبارہ گرانے کی پھر کبھی کوشش نہ کی۔ لال مسجد واقعے کے ایک برس بعد صرف دارلحکومت اسلام کے اندر کئی نئی مسجدیں وجود میں آ گئیں ۔ مولانا عبدالعزیز کو آخر کار اپریل 2009 میں ایک بار پھر سپریم کورٹ کے حکم پر، قید سے رہا کر دیا گیا۔ لال مسجد واپس پہنچ کر اس نے ان سینکڑوں اموات پر افسوس کا اظہار کیا جو اس کے خیال میں رائیگاں نہیں گئی تھیں۔ ''آج' اس

نے گرجدار اعلان کے ساتھ کہا' پورا ملک نفاذ شریعت کے مطالبے سے گونج رہا ہے۔

پورے پاکستان میں شدت پسند اسلامی نظریات رکھنے والی شخصیات میں لال مسجد کے اثرات نے جوش کی نئی لہر دوڑا دی۔ اگر اس حوالے سے کوئی شک وشبہ باقی تھا کہ انتہاء پسند دیو بندی جہادی اور دوسرے فرقوں سے تعلق رکھنے والے خود کو ایک ایسی واحد تحریک کا جزو خیال کرتے تھے جس کا مقصد اور منزل ایک ہی تھی تو لال مسجد کے اشتعال انگیز ردعمل نے اسے بالکل ہی غلط ثابت کر کے رکھ دیا تھا۔ القاعدہ کے نمبر دو پر آنے والے رہنما ایمن الظواہری نے لال مسجد محاصرے کے اختتام کے اگلے روز ایک ویڈیو ٹیپ جاری کر دی جس میں مومنین پر یہ زور دیا گیا تھا کہ وہ پاکستانی ریاست کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیں۔ قبائلی علاقوں اور صوبہ سرحد کے کچھ حصوں میں شدید ردعمل کا مظاہرہ کیا گیا اور پاکستانی طالبان نے شمالی وزیرستان معاہدے کی منسوخی کا اعلان کرتے ہوئے فوج کے ساتھ کئے جانے والے جنگ بندی معاہدوں کو غیر موثر قرار دے دیا۔ قبائلی علاقوں اور دوسری جگہوں پر محاصرے کے خونی اختتام سے قبل ہی تشدد کی لہر چل پڑی۔ 4 جولائی کو ایک کار بم دھماکے کے نتیجے میں شمالی وزیرستان کے اندر 6 فوجی ہلاک ہو گئے تھے۔ دو روز بعد بندوقوں سے مسلح افراد نے راولپنڈی کے فوجی ہوائی اڈے سے پرواز کرنے والے اس طیارے کو مار گرانے کی کوشش کی جو پرویز مشرف کو لے کر جا رہا تھا۔

اسی دن ایک عارضی نوعیت کے دھماکہ خیز مواد (IED) کی زد میں آ کر وادی سوات سے کچھ ہی فاصلے پر صوبہ سرحد کے علاقے دیر میں چار فوجی جوان ہلاک ہو گئے تھے۔

لال مسجد محاصرے کے خونی اختتام کے بعد حملوں کی شدت اور تعداد میں اور بھی تیزی آ گئی تھی، جن کا نشانہ فوج، پولیس اور سویلین اہداف تھے۔ 12 جولائی کو سوات کے اندر مختلف واقعات میں سات افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ 14 جولائی کو شمالی وزیرستان کے اندر ہونے والے ایک کار بم دھماکے میں فرنٹیئر کور کے تین فوجی ہلاک ہو گئے۔ اس سے اگلے دن سوات اور صوبہ سرحد کے ایک ضلعی صدر مقام ڈیرہ اسماعیل خان میں حملوں کی زد میں آ کر فوج اور پولیس کے 49 جوان لقمہء اجل بن گئے۔ 17 جولائی کی تشدد کی لہر کا رخ دوبارہ اسلام آباد کی طرف پلٹ گیا، جہاں ایک خودکش بمبار نے خود کو سپریم کورٹ کے معطل چیف جسٹس افتخار محمد چوہدری کے حق میں نکلنے والے جلوس کے قریب دھماکے سے اڑاتے ہوئے سترہ جانیں تلف کر دیں۔ 19 جولائی

کو صوبہ سندھ کے شہر کراچی کے ایک شمالی علاقے میں ہلاک ہونے والے بے شمار چینی کارکنوں سمیت مختلف حملوں میں 40 افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ 24 جولائی کو شمالی وزیرستان کی سرحد کے اس پار صوبہ سرحد کے شہر بنوں میں ہونے والے ایک راکٹ حملے کی زد میں آ کر نو شہری موت کے گھاٹ اتر گئے۔ تشدد کی لہر 27 جولائی کو ایک مرتبہ پھر اس وقت اسلام آباد کی طرف پلٹ گئی تھی، جب لال مسجد سے کچھ ہی فاصلے پر آبپارہ مارکیٹ میں واقع ایک ہوٹل میں کسی خودکش بمبار نے خود کو دھماکے سے اڑا دیا تھا۔ ملکی دہشت گردی کی مہم شروع ہوا چاہتی تھی۔

ملکی دہشت گردی کوئی نئی بات نہیں تھی۔ اس کی بنیاد بیس برس سے زیادہ عرصہ میں بتدریج ڈالی گئی تھی۔ اس میں مغربی اہداف اور اہم عہدوں پر تعینات پاکستانی شخصیات پر ہونے والے وہ حملے بھی شامل تھے جن کی منصوبہ بندی نائین الیون حملوں کے بعد القاعدہ نے کی تھی۔ اگرچہ ان حملوں کی شدت میں کچھ کمی آ گئی تھی مگر یہ سلسلہ ابھی رکا نہیں تھا۔ مارچ 2006 میں کراچی میں ہونے والے خودکش کار بم دھماکے کی زد میں آ کر امریکی سفارت کار ہلاک ہو گیا تھا اور اپریل 2007 میں وزیر داخلہ کو قتل کرنے کی ایک کوشش بھی منظر عام پر آئی۔ تاہم لال مسجد واقعے سے پہلے دو عشروں کے دوران پاکستان میں دہشت گردی کے پیش آنے والے زیادہ تر واقعات فرقہ وارانہ نوعیت کے ایسے واقعات تھے جن میں لشکر جھنگوی اور سپاہ محمد جیسی تنظیمیں ملوث تھیں۔ انہوں نے لال مسجد کے بعد بھی اپنی سرگرمیاں جاری رکھی تھیں مگر پاکستانی فوج، پولیس اور سویلین اہداف پر ہونے والے حملوں نے ان کی سرگرمیوں کو غیر اہم بنا دیا۔ عارضی نوعیت کے دھماکہ خیز مواد (IEDs)، کار بم، خودکش جیکیٹیں یا صدریاں ان تکنیکوں کی عکاسی کرتے تھے جو القاعدہ نے عراق میں اور طالبان نے افغانستان میں استعمال کی تھیں اور یہ ان مختلف تنظیموں کے درمیان رابطے اور باہمی تجربات و مہارتوں سے استفادہ کرنے کی علامت بھی تھے۔ اگرچہ لال مسجد کے واقعے کے فوری نتیجے کے طور پر سامنے آنے والے دہشت گرد حملے مسجد کے احاطے پر سرکاری اہلکاروں کی یلغار کا اشتعال انگیز ردعمل تھے، تاہم ملکی اہداف کو نشانہ بنانے والے دہشت گرد حملوں کا حتمی مقصد انہیں پاکستانی طالبان اور فوج کے درمیان اس جنگ میں ایک اہم ہتھیار کے طور پر استعمال کرنا تھا جو کہ شروع ہوا چاہتی تھی۔

خطے کے اندر جنگ بندی معاہدوں کو غیر موثر بنا کر رکھ دینے کے ردعمل کے طور پر فوج

نے اضافی دستے تعینات کرنے شروع کر دیئے۔اس نے شمالی وزیرستان میں طویل عرصے سے لاوارث چھوڑ دی جانے والی چوکیوں کو لال مسجد محاصرے کے اختتام سے بھی قبل دوبارہ اپنے زیر انتظام لانا شروع کر دیا تھا، اور اپنی طاقت کو اس سے بھی پہلے، مستحکم کرنا شروع کر دیا تھا۔ 19 جولائی کو پاکستانی طالبان کی طرف سے شمالی وزیرستان معاہدے کی تنسیخ کے اعلان کے محض چار دن بعد، پرویز مشرف نے بڑے بڑے پاکستانی صحافیوں کو بتایا تھا کہ وہ علاقے میں دو ڈویژن فوج اور روانہ کر رہا ہے۔میں نے ایک اعلیٰ پاکستانی عہدیدار سے سنا تھا کہ 2007 کے اواخر تک قبائلی علاقوں اور سوات میں تعینات فوجی دستوں کی تعداد گزشتہ تمام ادوار کے مقابلے میں بہت زیادہ تھی۔ایک اور برس کے اندر اندر دستوں کی مجموعی تعداد چھ انفنٹری ڈویژنوں کے برابر پہنچ چکی تھی جو کہ فرنٹیئر کور اور ریگولر فوج کے درمیان تقسیم تھی۔شروع شروع میں دستوں کی تعداد میں اضافے کا ظاہری مقصد بنیادی طور پر طاقت کا مظاہرہ کرنا تھا، جس کی پاکستانی عوام کو بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔اس وقت کی اخباری خبروں نے ان نئے دستوں کا استقبال فوج کے گشتی دستوں اور نئی کھولی گئی سرحدی چوکیوں اور دوسرے نگران مقامات (check points) پر حملوں سے کیا۔اس حوالے سے بہت بڑا ڈرامائی، اور ساتھ ہی شرمناک، واقعہ 30 اگست کو اس وقت پیش آیا جب بیت اللہ محسود سے وفاداری رکھنے والے تقریباً بیس عدد پاکستانی طالبان نے 300 سے ذرا ہی کم فوجیوں پر مشتمل رسد فراہم کرنے والے ایک دستے کو روک کر قائل کر لیا تھا کہ وہ ایک بھی گولی کے تبادلے کے بغیر ہتھیار ڈال دیں۔اس ایک واقعے سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستانی فوجی لڑائی میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے تھے۔

نومبر میں حکومت نے جارحانہ حملے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔اس کا اولین ہدف وادی سوات تھی۔جیسا کہ ہم نے پانچویں باب میں ملاحظہ کیا ہے کہ سوات میں انتہا پسند اسلامی تنظیم ٹی این ایس ایم کے بانی صوفی محمد کو آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کے ابتدائی مرحلے کے دوران پاکستانی واپسی پر اس وقت گرفتار کر لیا گیا تھا جب اس کی طاقت کمزور پڑ چکی تھی اس کے بعد اس کے داماد ملا فضل اللہ نے تنظیم کی قیادت سنبھالتے ہوئے ٹی این ایس ایم کی صفوں کو دوبارہ مستحکم کرنا شروع کر دیا۔اپنی حکمت عملی کے ایک حصے کے طور پر فضل اللہ نے ایف ایم ریڈیو کی نشریات سے وسیع پیمانے پر استفادہ کرتے ہوئے شریعت کے نفاذ کا سختی سے مطالبہ کرنے کے ساتھ ہی مغرب کے

ضرررساں اثرورسوخ پرمبنی سرگرمیوں،مثلاً پولیو کے قطرے پلانے کی مہم اور خواتین کی تعلیم وغیرہ کو بھی شدید تنقید کا نشانہ بناڈالا۔اس کی نشریات کا دائرہ بہت وسیع ہوتا جارہا تھا اور اس کے ساتھ ہی اس کے کارکنوں کی تعداد بھی،اور اس مقبولیت کا صلہ اسے ''ملا ریڈیو'' کے خطاب کی صورت میں ملا۔اس نے لال مسجد کے واقعہ سے دو ماہ سے کچھ کم عرصہ قبل حکومت کے ساتھ خود اپنے ہی وضع کردہ امن معاہدے پر دستخط کردیئے تھے،مگر جب کہ مسجد کا محاصرہ ابھی جاری تھا اس نے سوات میں پاکستانی فوج پر خودکش حملے شروع کر دیئے۔ موسم خزاں تک اس کے جہادیوں نے59 دیہاتوں میں سرکاری عمارتوں اور تھانوں پر قبضہ کرنے کے ساتھ ہی اپنے علیحدہ انتظامی ادارے قائم کرلئے تھے۔یہی وہ وقت تھا جب فوج نے سوات میں مضبوطی سے قدم جمانے شروع کردیئے تھے،اور نومبر میں حملوں کا آغاز کردیا گیا۔سوات پر حملہ جس کا نام جسٹ پاتھ یا راہ حق رکھا گیا تھا، خطے میں پاک فوج کے مقاصد میں بنیادی تبدیلی کا غماز تھا۔فوج قبائلی علاقوں میں دراصل شدید امریکی دباؤ کے زیراثر آگئی تھی تاکہ القاعدہ کے جہادیوں کو چن چن کران کے انجام تک پہنچایا جاسکے۔پاکستانی طالبان کے ساتھ اس کا تصادم دراصل اس کوشش کے غیر مطلوب ضمنی اثرات کا نتیجہ تھا۔مگر اب ہدف تبدیل ہوچکا تھا۔سوات اور بعدازاں قبائلی علاقوں میں کی جانے والی کاروائیوں میں اب اس کا بنیادی مقصد پاکستانی طالبان کا تعاقب کرکے انہیں لڑائی پر مجبور کرنا تھا۔اب نقاب کچھ حد تک اتر گئے تھے۔لال مسجد کے واقعے نے پاکستان کو بہت کچھ سکھادیا تھا۔

راہ حق کے نام سے کئے جانے والے حملوں کو جس میں فرنٹیئر کور پیش پیش تھی،ابتداء میں کامیابیاں نصیب ہوئیں۔فوج وادی سوات کے اندر ٹی این ایس ایم کو بہت سے محاذوں پر پسپا کردینے میں کامیاب ہوگئی تھی،اور دسمبر2007 کے آغاز تک تنظیم دوبارہ پہاڑوں میں پناہ گزین ہوگئی۔فوج نے فتح کا دعویٰ کردیا،مگر فضل اللہ کے جہادیوں نے پہاڑوں میں واقع اپنی پناہ سے حملہ کرکے فرار ہوجانے کی کاروائیاں جاری رکھیں۔اس دوران واپس اسلام آباد میں آپریشن راہ حق کا حکم جاری کرنے والی شخصیت شدید سیاسی مشکلات کا شکار ہوچکی تھی۔اس برس کے آغاز سے ہی پرویز مشرف کی مقبولیت تیزی سے زوال پذیر ہوچکی تھی۔امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دینے کے غیرعوامی فیصلے کے باعث اس کی ساکھ پہلے ہی کمزور ہوچکی تھی،تاہم مارچ میں سپریم کورٹ کے چیف جسٹس افتخار چوہدری کو بدعنوانی کے

الزامات میں معطل کر کے اس نے اپنی ساکھ مزید خراب کر لی تھی اس اقدام کا اصل محرک، تاہم یہ خوف تھا کہ افتخار چوہدری کہیں آنے والی خزاں میں ہونے والے صدارتی انتخاب میں مقابلے کے لئے اس کی دوبارہ نامزدگی کو غیر قانونی ہی قرار نہ دے ڈالے۔ اس اقدام کے نتیجے میں وکلاء برادری اشتعال کا شکار ہوگئی اور یوں وکلاء تحریک کے آغاز کی بنیاد رکھ دی گئی۔ اس طرح شروع ہونے والے احتجاجی مظاہروں کے باعث مشرف کی عوامی نفرت میں اور اضافہ ہو گیا۔ جولائی کے اواخر میں، لال مسجد واقعے کے صرف چند ہفتوں بعد سپریم کورٹ کے بقیہ جج صاحبان نے مشرف کی مزید حکم عدولی کرتے ہوئے افتخار چوہدری کو اس کے عہدے پر بحال کر دیا۔ لال مسجد میں بڑے پیمانے پر ہونے والی ہلاکتوں اور ان کے نتیجے میں دہشت گردی کی وارداتوں میں غیر معمولی اضافے نے اس کی ساکھ مزید خراب کر دی۔ اگرچہ اس نے اکتوبر کے اوائل میں خود کو کسی نہ کسی طرح دوبارہ منتخب کروانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی، مگر اس خوف سے کہ کہیں سپریم کورٹ پھر اس کے خلاف فیصلہ نہ کر دے، اس نے اگلے ماہ ہنگامی حالت کا نفاذ کر دیا۔ پاکستانی طالبان کی جانب سے تیزی سے منڈلاتے ہوئے خطرات نے اسے وہ جواز یا بہانہ فراہم کر دیا جس کی اسے ضرورت تھی۔

مگر اس کے باوجود، دباؤ تھا کہ بڑھتا ہی چلا جا رہا تھا۔ نومبر کے آواخر میں اس نے اپنی گرتی ہوئی ساکھ کو سہارا دینے کے لئے طویل عرصہ سے کئے جانے والے اس مطالبے کو تسلیم کر لیا کہ اسے آرمی چیف یعنی فوج کے سربراہ کی حیثیت سے استعفیٰ دے دینا چاہئے۔ مگر اس فیصلے کا نتیجہ فوج کے ان رسمی روابط کے منقطع ہونے کی صورت میں نکلا جو اس کی طاقت کا اصل سرچشمہ تھے۔ دسمبر میں اس نے ہنگامی حالت کے خاتمے کا اچانک اعلان کر دیا جبکہ اس دوران اس نے چوہدری شجاعت اور اس کے بہت سے ساتھیوں کو ہنگامی حالت کے تحت حاصل اختیارات کے ذریعے پہلے ہی بے دخل کر کے رکھ دیا تھا۔ مگر اب یہ سب کچھ لاحاصل تھا۔ پرویز مشرف اب ایک شکست خوردہ شخص تھا۔ اگلے برس اگست کے مہینے میں اسے صدارت کے عہدے سے دستبردار ہونا پڑا اور بعد ازاں غداری کے الزامات کا سامنا کرنے سے بچنے کے لئے پاکستان چھوڑ جانے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کی جگہ اب آصف زرداری نے لے لی تھی جو کہ پاکستان کی دو مرتبہ خاتون وزیر اعظم بننے والی بے نظیر بھٹو کا خاوند تھا۔ بدعنوانی کے الزامات میں مطلوب بے نظیر نو برس کی

MashalBooks.org

جلاوطنی کے بعد اکتوبر 2007 میں پاکستان واپس آئی تھی۔ وہ مشرف کے دوبارہ صدر بننے کے دو ہفتوں بعد اس کی طرف سے ہنگامی حالت کے نفاذ سے دو ہفتوں سے کچھ ہی زیادہ عرصہ قبل وطن واپس لوٹی تھی۔ یہ واپسی مشرف حکومت کے ساتھ پس منظر میں ہونے والے ان بے شمار مذاکرات معاہدوں کا نتیجہ تھی جو امریکہ کے تعاون سے کروائے گئے تھے۔ مشرف نے اس امید پر اسے واپس آنے کی اجازت دی تھی کہ وہ اسے صدارت کے عہدے پر برقرار رہنے میں مدد دے گی۔ معاہدے کو پرکشش بنانے کے لئے اس نے اس امر پر رضامندی ظاہر کر دی تھی کہ بے نظیر کے خلاف بدعنوانی کے الزامات کے خاتمے کے لئے قانون سازی کی جائے گی۔ اس طرح اس کو جنوری میں ہونے والے عام انتخابات میں شرکت کے لئے اپنی جماعت کی قیادت کا موقع مل جاتا اور پی پی پی کو یہ انتخابات جیتنے کی بہت زیادہ توقع تھی۔ قومی مصالحتی آرڈی ننس کے تحت، جیسا کہ اس معاہدے کو نام دیا گیا تھا، ان تمام سیاستدانوں کو جن پر مشرف دور سے قبل وقفے وقفے سے آنے والی سویلین حکومتوں میں بدعنوانی کے الزامات عائد کئے گئے تھے۔ مکمل معافی دے دی گئی۔ اس طرح بینظیر پر عائد الزامات کا بھی خاتمہ ہو گیا اور اس کی وطن واپسی کی راہ ہموار ہو گئی۔ مگر یہ ایک المناک واپسی تھی۔ وہ ملکی سطح پر جاری دہشت گردی کی جنگ کا مقبول ترین ہدف بننے لگی تھی۔

کراچی کے ہوائی اڈے پر اپنی آمد کے ابعد بے نظیر بھٹو محمد علی جناح کے مزار تک جانے والے گاڑیوں کے ایک شاندار قافلے میں شامل ہو گئیں۔ سڑکوں کے کنارے لاکھوں کی تعداد میں عوام اس کی ایک جھلک دیکھنے کے منتظر تھے۔ ان میں دو خود کش بمبار بھی تھے جنہوں نے خود کو دھماکے سے اس وقت اڑا دیا جب قافلہ قریب سے گزر رہا تھا۔ اگرچہ بے نظیر معجزانہ طور پر محفوظ رہی، تاہم 140 افراد ہلاک اور 400 سے زائد زخمی ہو گئے۔ یہ ملکی دہشت گردی کی لہر کے نتیجے میں اب تک رونما ہونے والا سب سے بڑا سانحہ تھا۔ اگرچہ اس واقعے نے اس کو ہلا کر رکھ دیا تھا، تاہم اس نے پھر بھی اپنی ساری توانائیاں قومی اسمبلی کے آنے والے انتخابات کے لئے وقف کر دیں۔ اس نے مشرف سے بھی مناسب فاصلہ اختیار کر لیا تھا جو کہ اس مرتبہ خود کو اتنا کمزور محسوس کر رہا تھا کہ اس نے نواز شریف کے جلاوطنی ختم کر کے واپس آنے کے فیصلے کی بھی کوئی مزاحمت نہ کی، حالانکہ یہ وہی شخص تھا جسے اس نے آٹھ برس قبل ملک بدر ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ کراچی سانحے کے

باوجود بے نظیر بھٹو نے بڑے بڑے جلسے جلوس منعقد نہ کرنے کے مشوروں کو مسترد کر دیا تھا کیونکہ یہ پاکستانی طرز کی سیاست کا اہم جزو تھے۔ یہ ایک فاش غلطی تھی۔ 27 دسمبر کو جب کہ وہ راولپنڈی میں ایک انتخابی جلسے کے اختتام پر روانہ ہو رہی تھی اس کی گاڑیوں کے قافلے کے قریب ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ وہ ایک بڑی ایس یو وی گاڑی کی چھت کے کھلے حصے (hatch) سے سر نکال کا عوام کے نعروں کا ہاتھ ہلا ہلا کر جواب دے رہی تھی، اور دھماکے کی طاقت سے اس کا سر پیچھے ہو کر کھلی چھت کے ابھرے ہوئے کنارے سے ٹکرایا۔ پاکستان کی مستقبل کی یقینی وزیراعظم موت کے منہ میں جا چکی تھی۔

پاکستانی حکام نے اس قتل کی ذمہ دار بیت اللہ محسود پر عائد کر دی۔ سی آئی اے کے ڈائریکٹر مائیکل ہیڈن نے بعد ازاں اس موقف کا تائید کرتے ہوئے اصرار کیا کہ محسود کے وفادار ایک پاکستانی جہادی نے یہ واردات القاعدہ کے تعاون سے کی تھی۔ جہان تک پس پردہ محرک کا تعلق تھا، تو بے نظیر نہ صرف مستقبل کی امکانی وزیراعظم تھی بلکہ اپنے باپ کی طرح بہت سے لوگ اسے شیعہ بھی تصور کرتے تھے اور یوں ایک فرقہ ورانہ عنصر بھی ممکنہ طور پر شامل محرک تھا۔ اس سے بھی اہم اور طالبان کو بام عروج تک پہنچانے میں اس کے کردار کے باعث، ستم ظریفانہ حقیقت یہ تھی کہ وہ پاکستانی طالبان کی خصوصاً اور پاکستان میں انتہاء پسند اسلامی نظریات کی عموماً ایک بہت بڑی ناقد بن چکی تھی۔ وہ لال مسجد سے جنم لینے والی اخلاقیات کے نفاذ کی تحریک کی مذمت میں بھی پیش پیش تھی اور حکومت کو اس کے خلاف کاروائی کرنے میں سستی کے مظاہرے پر شدید تنقید کا نشانہ بنائے ہوئے تھی۔ دوسرے سیاست دان، اس کے برعکس خاموشی اپنائے ہوئے تھے، یا پھر نواز شریف کی طرح حکومت کو لال مسجد کے حتمی محاصرے کے نتیجے میں برپا ہونے والے بڑے پیمانے کے قتل و غارت پر طنز و تشنیع کا نشانہ بنائے ہوئے تھے۔ چنانچہ بے نظیر کے قتل سے ایک ماہ پہلے خود نواز شریف کی اپنی وطن واپسی بھی اتنی پر خطر نہیں رہی تھی۔ بے نظیر کی صاف گوئی و بے باکی اور عوامی سطح پر گھل مل جانے کی عادت ہی اس کے لئے باعث نقصان ثابت ہوئی تھی۔ اسے اس امر کا احساس نہیں تھا کہ پاکستان سے اتنا عرصہ دور رہنے کے دوران یہاں کیسی کیسی تبدیلیاں رونما ہو چکی تھیں۔

جہاں تک بیت اللہ محسود کا تعلق تھا، وہ بے نظیر بھٹو کے قتل سے

*اس مقالے کی تحقیق میں آسٹریلین ریسرچ گرانٹس کمیٹی اور ریسرچ کمیٹی آف آئی لنڈرز یونیورسٹی کی طرف سے امداد دی گئی۔ ان کی حمایت کا شکریہ کے ساتھ اعتراف کیا جاتا ہے۔

MashalBooks.org

محض دو ہفتے قبل ہی خطے کے اندر دوسرے اہم پاکستانی طالبان رہنماؤں کے ساتھ اتحاد کے ذریعے ایک تنظیم بنام تحریک طالبان پاکستان تشکیل دینے میں مصروف تھا۔ محسود اس تنظیم کا سربراہ، جبکہ شمالی وزیرستان سے حافظ گل بہادر نائب منتخب ہوگیا اور باجوڑ کا فقیر محمد تیسرے نمبر پر آ گیا تھا۔ اس امر کا کوئی حقیقی ثبوت نہیں ملا کہ اس اتحاد کا نتیجہ میدان جنگ میں بہتر تعاون کی صورت میں نکلا یا پھر یہ کہ اس کا کوئی ایسا مقصد بھی تھا یا نہیں۔ اس تنظیم کی تشکیل کا مقصد ایک سیاسی عزم یا ارادے کا اظہار ہی نظر آتا تھا بہ نسبت اس کے کہ پاکستانی طالبان کی بکھری ہوئی طاقت کو ایک واحد کمان کے تحت یکجا کیا جائے۔ اپنی ابتدائی حکمت عملی کا اعلان کرتے ہوئے تحریک طالبان نے مطالبہ کیا تھا کہ قبائلی علاقوں اور سوات میں شریعت نافذ کی جائے اور اس کے ساتھ ہی افغانستان میں امریکی فوجوں کے خلاف جارحانہ جہاد اور پاکستانی فوج کے خلاف دفاعی جہاد کا بھی اعلان کر دیا۔ اس کے علاوہ لال مسجد کے محافظین کے ساتھ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے غازی برادران میں اکلوتے بچ جانے والے غازی عبدالعزیز کی رہائی کا مطالبہ بھی کر دیا گیا۔

مگر اپنی تشکیل کے تقریباً فوراً بعد ہی تحریک طالبان کی صفوں میں انتشار پھیلنے لگا تھا۔ فروری کے وسط تک، صرف دو ماہ بعد حکومت کے ساتھ شمالی وزیرستان معاہدے کے احیاء پر اظہار رضامندی کرتے ہوئے، گل بہادر نے اپنا راستہ الگ کر لیا تھا۔ اپنی تمام ترجیحات کو محفوظ رکھنے کے لئے بے چین، وہ تحریک طالبان کی تشکیل کے وقت بھی اس طرح کے معاہدے کے لئے مذاکرات جاری رکھے ہوئے تھا۔ شمالی وزیرستان معاہدے کے احیاء کے حوالے سے اس کی حوصلہ افزائی حقانی نیٹ ورک سے منسلک ہمسایہ ساتھیوں نے کی تھی جن کی یہ دلچسپی ابھی تک برقرار تھی کہ پاکستانی طالبان اپنی تمام تر توجہ افغانستان پر ہی مرکوز کئے رکھیں۔ ملا عمر نے بھی، مبینہ طور پر، ذاتی سطح پر مداخلت کی تھی۔ عین اسی وقت گل بہادر نے مولوی نذیر کے ساتھ اتحاد کی طرف پیش قدمی شروع کر دی تھی جو کہ خود بھی پاکستان کے ساتھ جنگ بندی پر آمادہ ہوگیا تھا۔ اس سے پچھلے موسم بہار میں وہ ازبک مجاہدین کے ساتھ دست بدست ہوگیا تھا جو کہ اس کے اپنے ہی علاقے میں اس پر حاکمیت جمانے کی کوشش کر رہے تھے اور اسی لئے وہ حکومت کے ساتھ تعاون کے معاہدے کی طرف مائل ہوگیا تھا۔ دونوں رہنماؤں نے اپنے اتحاد کا رسمی اعلان جولائی 2008 کے اوائل میں کیا تھا۔ یہ دو وجوہات کی بناء پر اہم تھا۔ پاکستانی طالبان کی دو بڑی تنظیموں نے حکومت

کے ساتھ امن وامان قائم کرنے کے ارادے کے ساتھ ہی آپس میں بھی تعاون کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ چنانچہ اب صرف بیت اللہ محسود اور اس کے پیچھے پیچھے رواں دواں باجوڑ کا فقیر محمد اور سوات کا ملا فضل اللہ ہی وہ اہم پاکستانی طالبان رہنما رہ گئے تھے جو ابھی تک ریاست کے ساتھ حالت جنگ میں تھے۔ اس طرح ممکنہ طور پر محسود بھی الگ تھلگ سا ہو گیا تھا، جس کے جہادی اب دو طاقتوں، شمال میں گل بہادر اور جنوب میں مولوی نذیر کے درمیان پس کر رہ گئے تھے۔

اس امر پر یقین کرنے کے لئے یہ وجہ موجود ہے کہ آئی ایس آئی نے ان نتائج کے لئے سخت محنت کی تھی، جسے اس بات کا تقریباً یقینی علم تھا کہ اگر گل بہادر اور مولوی نذیر نے پاکستانی فوج کے ساتھ لڑائی روک دی تو ان کی توجہ مغرب کی جانب ہونے کا امکان پایا جاتا تھا جہاں وہ افغانستان کے اندر اپنے افغان بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے میں مصروف ہو جاتے۔ آخر کار وہ جہادی تھے اور ملا عمر کے ساتھ ذاتی سطح پر وفاداری کا اعلان کر چکے تھے۔ اگر چہ اس حوالے سے کوئی براہ راست ثبوت نہیں پایا جاتا کہ پاکستانی حکام نے گل بہادر اور نذیر کی بھرپور حوصلہ افزائی کی تھی کہ وہ اپنی کوششوں کا مرکز افغانستان کو بنائیں، تاہم انہیں یہ احساس ہوا ہوگا کہ نتیجہ یہی برآمد ہو گا۔ صرف دو راستے ہی سامنے پا کر، کہ یا تو متحد مگر مخالف پاکستانی طالبان سے ٹکر لیں یا پھر امریکہ کو افغانستان میں جن مشکلات کا سامنا ہے ان میں اضافے کا سبب بن جائیں، یہ امر باعث حیرت نہیں تھا کہ انہوں نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا۔

گل بہادر اور مولوی نذیر کے ایک طرف ہو جانے کے ساتھ ہی، پاکستان نے بیت اللہ محسود کے ساتھ ٹکر لینے کا فیصلہ کر لیا۔ وہ نہ صرف یہ کہ پاکستانی طالبان میں سب سے طاقتور اور ہٹ دھرم رہنما تھا بلکہ ملکی دہشت گردی کی مہم کے پس پردہ ایک اہم طاقت بھی۔ اس کا ایک اہم دست راست قاری حسین محراتی القاعدہ کے رہنما ابوموسیٰ الزرقاوی کا مداح تھا اور خودکش بمباروں کی ایک پوری کھیپ تیار کرنے کے لئے تربیتی کیمپ لگانے کے حوالے سے پہلے ہی کافی بدنام تھا۔ پاکستان نے اپنے آپریشن بنام ''زلزلہ'' یا ارتھ کوئیک کا آغاز 24 جنوری کو کیا تھا جبکہ محسود کے جہادیوں کو جنوبی وزیرستان کے شمال میں سراروغہ نامی علاقے کے اندر فرنٹیئر کور کے جوانوں کی ایک بڑی تعداد کو حملے کا نشانہ بنائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ یہ پوری طرح واضح نہیں ہو سکا کہ آیا فوج کی طرف سے کاروائی کا آغاز اس حملے کے جواب میں کیا گیا تھا یا پھر اس کی منصوبہ بندی کچھ

عرصہ سے جاری وساری تھی۔ موخر الذکر وضاحت زیادہ مناسب نظر آتی ہے۔ فوج نے ٹی این ایس ایم کو سوات سے بے دخل کرنے کی کوششوں کا اختتام گزشتہ ماہ ہی کیا تھا، اور اس طرح سے جنوبی وزیرستان میں کاروائی کے آغاز کے لئے مفروضہ طور پر فوجی دستے دستیاب تھے۔ اس کے علاہ فوج بیک وقت ایک سے زائد دشمنوں کے ساتھ ٹکر لینے میں ہچکچاہٹ محسوس کرتی ہوگی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ اس نے سوات آپریشن کے اختتام پذیر ہونے کا انتظار کیا۔ دونوں عوامل اس امر کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ پاکستان کو یہ یقین نہیں تھا کہ اس کے پاس علاقے میں اتنے فوجی موجود تھے جن کے بل پر وہ اپنی کارکردگی مزید بہتر بنا سکتا، حالانکہ لال مسجد واقعے کے بعد فوجیوں کی تعداد میں خاطر خواہ اضافہ دیکھا گیا تھا۔

آپریشن ارتھ کوئیک کو ابھی محدود پیمانے پر ہی کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ فوج کو مئی میں ہی اپنے جوانوں کو واپس بلانے پر مجبور ہونا پڑ گیا۔ اگرچہ فوج بہت سے علاقوں سے محسود کا اثر ورسوخ ختم کرنے میں کامیاب ہوگئی تھی، مگر پھر بھی اسے حتمی طور پر نشانہ بنانے کی کسی کوشش میں کامیاب نہ ہوسکی۔ جس طرح کہ سوات میں کئی ماہ پہلے ہوا تھا، جب اپنے سے زیادہ طاقت ور پاکستانی فوج کے مقابلے کی تاب نہ لاکر پاکستانی طالبان گردونواح کے مضافاتی علاقوں میں روپوش ہوگئے تھے۔ تاہم فوج عمارات وغیرہ کو نقصان پہنچانے اور اس کے ساتھ ہی مقامی آبادی کو الگ تھلگ کر کے رکھ دینے میں کسی حد تک کامیاب ہوگئی تھی۔ مُہم کے دوران چار ہزار مکانات تباہ کر دیے گئے تھے جبکہ دولاکھ لوگ بے گھر ہو کر رہ گئے۔ فوج نے بہت سے مواقع پر حسن کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہوگا یا کرسکتی ہوگی، مگر اس طرح کی لڑائی کسی طرح سے بھی اچھی کارکردگی کی عکاسی نہیں تھی۔ مقامی باشندے دوفریقوں کی لڑائی میں پسنے کے عادی ہو چکے تھے۔ فرنٹئر کور کے جوان ناقص تربیت کے ساتھ ہی کسی قسم کے جذبے سے بھی محروم تھے جبکہ رسمی طور پر تربیت یافتہ فوج کو بغاوت مخالف کاروائیوں کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ انہیں کشمیر میں پیادہ فوج کی لڑائی لڑنے اور پنجاب کے میدانوں میں ٹینکوں کی لڑائی لڑنے کا تجربہ تو تھا مگر قبائلی علاقوں کے پتھریلے اور ناہموار راستوں پر گوریلا جہادیوں کا تعاقب کرنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔ پاکستانی فوج ایک ایسا کند ہتھیار تھا جسے ایسے حالات کی اصلاح کے لئے استعمال کیا جارہا تھا جس کیلئے زیادہ تیزی اور باریک بینی کی ضرورت تھی۔ جب انہوں نے مئی میں جنوبی وزیرستان کا علاقہ خالی کرنا شروع کیا تھا تو محسود

کی فوجیں واپس آنا شروع ہوگئیں۔

اس دوران سوات میں بھی حالات یہی رخ اختیار کر رہے تھے۔فوج ٹی این ایس ایم کو پہاڑوں میں پناہ لینے پر مجبور کرنے میں تو کامیاب ہوگئی تھی مگر انہیں وہیں تک محدود رکھنے میں مشکل محسوس کر رہی تھی۔اس وقت تک صوبہ سرحد میں ایک نئی حکومت تشکیل پا چکی تھی۔سیکولر سیاسی جماعت اے۔این۔پی نے جو کہ 2002 کے ان انتخابات سے قبل جن کے نتائج امریکہ کے خلاف نفرت کی انتقامی لہر پر مبنی تھے،ایک بڑی جماعت تھی،فروری 2008 میں ہونے والے صوبائی اسمبلی کے انتخابات میں اپنی طاقت کو دوبارہ یکجا کرتے ہوئے جے یو آئی کو بری طرح شکست دے دی۔اس کے قائدین سوات میں طویل عرصہ سے جاری جنگ کے نتیجے میں پیدا ہونے والی تباہی اور آفت پر افتاں وخیزاں تھے چنانچہ انہوں نے اس کے خاتمے کے لئے مذاکرات کرنے کا فیصلہ کیا۔انہوں نے مئی کے مہینے میں مُلّا فضل اللہ سے کامیاب مذاکرات کئے جس میں اے این پی نے اس کی شرط پر رضامندی ظاہر کردی۔یہ معاہدہ کوئی ایک ماہ تک نافذ العمل رہا۔ملا فضل اللہ نے جو کہ اب تحریک طالبان میں شامل ہو چکا تھا اور اپنے جہادیوں کو ایک وسیع تر پاکستانی طالبان تحریک کا حصہ سمجھتا تھا،اس وقت تک ہتھیار پھینکنے سے انکار کر دیا تھا جب تک کہ فوج وادی سے واپس نہ چلی جائے۔جب فوج نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو فضل اللہ نے معاہدے پر عمل سے انکار کر دیا اور سرکاری فوجوں پر حملے کا آغاز کر دیا تھا۔

یہ حملے گزشتہ حملوں کے مقابلے میں اتنے کامیاب نہیں ہوئے۔اگرچہ بہت سے قصبات میں شدید جھڑپیں دیکھنے میں آئیں مگر فوج کو اس طرح کی کامیابی نہیں ملی جو اسے صرف چند ماہ قبل نصیب ہوئی تھی۔اگلے کئی ماہ کے دوران فضل اللہ وادی سوات کا بہت سا ایسا حصہ تباہ کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا جو کہ ایک زمانے میں سیاحوں کی توجہ کا مرکز دلکش سیاحتی مقام تھا۔ سب سے پہلے نشانہ بنائے جانے والی سہولیات میں پورے پاکستان کا واحد اور اکلوتا سکی (لکڑی کے تختوں سے برف پر پھسلنے کے سہولت کا حامل) تفریحی مقام بھی شامل تھا۔مقامی سیاستدانوں بشمول اے این پی کے عہدیداران کو ہدف بنایا گیا،بعض کو ہلاک کر کے جبکہ بعض کو وادی سے بے دخل کر کے۔لڑکیوں کے اسکول باقاعدہ منصوبہ بندی کر کے جلا اور تباہ کر دیئے گئے۔پاکستانی طالبان جیسے جیسے وسیع تر علاقے پر قابض ہوتے چلے گئے،انہوں نے شریعت کے ساتھ ہی ایسا

وحشیانہ طالبانی انصاف رائج کر دیا جس پر ملا عمر بھی شرما کر رہ جاتا۔ ٹیلی وژن دیکھنے، رقص کرنے اور گانے، اور داڑھی نہ رکھنے جیسے جرائم کی سزا موت مقرر کر دی گئی۔ ایک آدمی کو صرف اس لئے گولی ماری گئی تھی کہ اس کی پتلون کے پائنچے بہت نیچے تھے۔ سر کاٹ دینا سزا کا ایک مقبول طریقہ بن چکا تھا۔ مینگورہ کے علاقے میں جو کہ وادی کا سب سے بڑا قصبہ تھا، ایک اہم چوک پر انسانی لاشیں جا بجا بجلی کے کھمبوں سے لٹکی نظر آتی تھیں۔ ان کے نام ملا ریڈیو سے روزانہ نشر کئے جاتے، تاکہ باقی لوگ خبردار ہو جائیں۔ تین لاکھ لوگ اپنی جانیں بچانے کے لئے علاقے سے فرار ہو گئے تھے۔ اس طرح کی خبریں بھی آ رہی تھیں کہ فضل اللہ کے جہادیوں کو جنوبی وزیرستان سے آنے والے ان پاکستانی طالبان کے علاوہ جو سرکاری فوج دستوں کے واپس چلے جانے کے باعث آزاد ہو گئے تھے، سرائیکی پٹی سے تعلق رکھنے والی انتہاء پسند دیو بندی تنظیموں کے ارکان نے بھی استحکام عطا کیا تھا ایک مقامی صحافی نے جو کہ پاکستان کے سوئٹزر لینڈ کی تباہی کے واقعات ترتیب دے رہا تھا، اپنے ایک مضمون کو، ''پاکستان کھو گیا (Pakistan Lost)'' کا عنوان دیا۔

فوج کو ایک مقام پر پہنچ کر یہ ضرور واضح ہو گیا ہو گا کہ اس کے پاس پاکستان طالبان کے خطرے سے نمٹنے کے لئے خاطر خواہ فوجی دستے موجود نہیں تھے۔ تاہم اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے اضافی دستے روانہ کئے تھے۔ مقامی آبادی کو یہ شکایت پیدا ہونے لگی تھی کہ فوجی اپنے ہی خیموں میں محصور ہو کر رہ گئے تھے اور کسی بھی قسم کی کاروائی کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ اس طرح کی بے عملی کی ایک ممکنہ وضاحت یہ نظر آتی ہے کہ حتیٰ کہ جب فضل اللہ اور اس کے حلیف اپنی غارت گر قسم کی سرگرمیوں کا آغاز کر رہے تھے تو فوج قریب ہی واقع باجوڑ ایجنسی میں ایک علیحدہ کاروائی کی منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ اگرچہ باجوڑ قبائلی علاقوں کی سب چھوٹی ایجنسی تھی، تاہم یہاں پر وزیرستان سے باہر پاکستانی طالبان اور غیر ملکی جہادی سب سے زیادہ تعداد میں پائے جاتے تھے۔ اس کے سوات سے بھی خاص طور پر قریبی روابط تھے۔ جیسا کہ ہم نے باب نمبر چھ میں ملاحظہ کیا ہے باجوڑ تحریک طالبان کا قائد فقیر محمد ٹی این ایس ایم کے بانی صوفی محمد کا شاگرد تھا اور سوات طالبان سے قریبی ربط رکھتا تھا۔ یہ واضح نہیں ہے کہ جب سوات پر اس کی گرفت کمزور پڑ رہی تھی تو ایسے وقت میں فوج نے باجوڑ جانے کا فیصلہ کیوں کیا تھا ہو سکتا ہے کہ ایسا امریکی دباؤ کے تحت کیا گیا ہو کیونکہ باجوڑ وہ اہم علاقہ تھا جسے

افغانستان میں حملوں کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔فقیر محمد کے سوات کے ساتھ قریبی روابط اور پاکستانی طالبان کے دو اہم ترین ٹھکانوں کے مابین فاصلے کی کمی بناء پر یہ ممکن ہے کہ فوج نے باجوڑ کو بھی اسی ایک کاروائی کا حصہ سمجھا ہو۔

محرک جو بھی تھا، جب فوج نے اگست میں آپریشن شیر دل (Lion Heart) کا آغاز کیا تو اسے کافی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔فقیر محمد کے جہادیوں نے خندقوں کی تعمیر اور نگرانی کا ایک ایسا جامع نظام وضع کیا تھا جس کا توڑ کرنا اس کے لئے خاص طور پر مشکل تھا۔فوج کی طرف سے ویسے ہی کند یا غیر موثر قسم کے حربے آزمائے جا رہے تھے جنہیں فوج پہلے سے ہی آزماتی چلی آ رہی تھی جس کے نتیجے میں مبینہ طور پر 5000 مکانات تباہ ہو جانے کے ساتھ ہی باجوڑ سے تین لاکھ افراد نقل مکانی پر مجبور کر دیئے گئے۔کئی ماہ کی سخت لڑائی کے بعد فوج آخر کار بالا دست ہوتی نظر آ رہی تھی کیونکہ وہاں سے بہت سے پاکستانی طالبان کو نکالنے میں کامیابی ہو گئی تھی۔حکومتی شرائط پر مبنی ایک امن معاہدے پر مارچ 2009 میں دستخط کر دیئے گئے۔اس وقت اسے پاکستانی طالبان کی اولین اہم شکست سمجھا جا رہا تھا۔تاہم حقیقت اس سے مختلف تھی۔مارچ 2010 میں اس مفروضہ فتح کے تقریباً تقریباً ایک برس بعد فوج نے باجوڑ میں ایک اور فیصلہ کن فتح کا اعلان کر دیا۔حتیٰ کہ صحافیوں کو ساتھ لے جا کر غاروں کا وہ نظام بھی دکھایا گیا تھا جس پر تازہ تازہ قبضہ کیا گیا تھا۔تاہم فوج جس چیز کی وضاحت کرنے میں ناکام ہو گئی وہ یہ تھی کہ گزشتہ برس کی بڑے پیمانے پر مشتہر کی جانے والی فتح کے ساتھ کیا ہوا تھا۔فقیر محمد کی فوجیں مفروضہ طور پر تباہ نہیں کر دی گئی تھیں بلکہ وہ یا تو افغانستان کے صوبے کنڑ کی طرف فرار ہو گئی تھیں یا پھر قریب ہی واقع سوات کے اندر جہاں انہوں نے ملا فضل اللہ کے جہادیوں کو استحکام عطا کیا ہو گا۔باجوڑ میں اپنی پہلی مبینہ فتح کے بعد وہاں پر اپنی مستحکم تعداد برقرار رکھنے پر نارضامند،فوج نے اپنے جوانوں کو وہاں سے نکالنا شروع کر دیا،جس کے نتیجے میں باجوڑ طالبان کو اپنے ٹھکانوں میں واپس لوٹنے کا موقع مل گیا۔

باجوڑ کے مشکوک استثنیٰ کے ساتھ 2009 کے اوائل تک یہ امر واضح ہو چکا تھا کہ لال مسجد واقعے کے بعد فوج نے پاکستانی طالبان کے خلاف جتنی کاروائیاں بھی کی تھیں وہ سب کی سب ناکامیاب رہی تھیں۔اگرچہ فوج کو یہ چاہیئے تھا کہ خطے کے اندر کافی تعداد میں ہمیشہ سے بھی زیادہ دستے روانہ کرتی،مگر ایسا نہیں کیا گیا۔زیادہ تر لڑائی ابھی بھی فرنٹیئر کور کی طرف سے لڑی جا

رہی تھی، جو نہ صرف یہ کہ پاکستانی فوج کے انتہائی ناقص تربیت یافتہ جوانوں پر مشتمل تھی بلکہ انتہائی متذبذب بھی کیونکہ پاکستانی طالبان میں بھی وہی پشتون خون دوڑ رہا تھا جو خود ان کی اپنی رگوں میں گردش کرتا نظر آتا تھا۔ قبائلی علاقوں اور سوات میں اپنے جارحانہ حملوں کے آغاز سے قبل فوج کو غالباً یہ اندازہ نہیں ہوا ہوگا کہ اسے کتنے فوجی جوان یا دستے درکار تھے۔ تاہم جب اس کے حملوں کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑ گیا تھا تو اس وقت بھی وہ اضافی دستے روانہ کرنے میں ہچکچاہٹ کا مظاہرہ کرتی نظر آتی تھی۔ اور اس سے بھی واضح نکتہ یہ ہے کہ جب فوج علاقے پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئی تو اتنے فوجی دستے بھی وہاں نہیں رہنے دیئے گئے جو پاکستانی طالبان کو واپس آنے سے روک سکتے۔

فوج ضروری افرادی قوت/جوان فراہم کرنے میں کیوں ناکام ہوگئی تھی؟ اس کی کئی وجوہات تھیں۔ اگرچہ پاکستان کا یہ خیال تھا کہ لال مسجد کے واقعے کے نتیجے میں پاکستانی طالبان نے انہیں جس طرح للکارا تھا اس کا جواب دینا ضروری تھا، تاہم وہاں پر ہونے والی لڑائی پاکستان کے عوام اور خود فوج کی صفوں میں بھی انتہائی ناپسندیدہ گردانی گئی۔ نائن الیون کے واقعے کے بعد القاعدہ اور طالبان کو پاکستانی حدود کے اندر دھکیل دینے کا ذمہ دار ہونے کی بناء پر امریکہ کو بھی ابھی تک ولن تصور کیا جا رہا تھا۔ اس سے بھی بدتر صورتحال یہ تھی کہ یہ امریکہ ہی تھا جس نے مشرف پر دباؤ ڈالا تھا کہ وہ قبائلی علاقوں میں اپنی فوج روانہ کرے جس کے نتیجے میں وہ اپنے ہی ہم وطنوں کے خلاف تباہ کن جنگ میں دھکیل دی گئی۔ اور اب ملک کے شہری مراکز میں عام پاکستانی بھی خود کش دھماکوں کی نذر ہو رہے تھے۔ اس بناء پر انہیں امریکہ کی طرف سے مسلسل دباؤ پر اور بھی زیادہ غصہ آ رہا تھا۔ اس غصے کا واضح اظہار اس شور غوغے کے دوران سامنے آیا جو کہ ستمبر 2008 میں جنوبی وزیرستان میں القاعدہ کے زیر استعمال احاطے پر امریکی کمانڈو فوجیوں کے حملے کے بعد کیا گیا تھا۔ یہ پاکستان کی سرزمین کے اندر امریکہ کی پہلی منصوبہ بند زمینی کاروائی تھی اور مئی 2011 میں اسامہ بن لادن پر ہونے والے حملے تک آخری بھی۔ ہر طبقہ زندگی سے تعلق رکھنے والے پاکستانیوں میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی۔ پری ڈیٹر میزائلوں کی بات اور تھی، مگر زمین پر بوٹوں کی دھمک قانون وضابطے کی سراسر خلاف ورزی تھی۔ مشرف کے بعد فوج کی سربراہی سنبھالنے والے جنرل اشفاق پرویز کیانی کو مجبور ہو کر امریکہ کو سرعام خبردار کرنا پڑا کہ پاکستان ہر حال میں اپنی خود

مختاری کا دفاع کرے گا۔فوج کو اچھی طرح اندازہ تھا کہ یہ جنگ عوام میں کتنی غیر مقبول تھی اور کیانی نے اس کے مطابق ہی ردعمل کیا تھا۔ایک ایسی فوج کے لئے جسے عوام کی نظروں میں اپنی ساکھ بنانے کی اتنی فکر ہوایک غیر مقبول جنگ کو اتنے زورشور سے جاری رکھنا بہت مشکل ہوتا ہے۔

اسی طرح فرنٹیئر کور پر انحصار کرنا کہ زیادہ تر جنگ اس کی وساطت سے لڑی جائے اس امر کی جانب اشارہ ہے کہ فوج اپنے رسمی تربیت یافتہ جوانوں کو میدان جنگ میں اتارنے سے گریزاں تھی۔ کچھ حد تک اس کے پس پردہ یہ یقین کارفرما تھا کہ پاکستان کی سرزمین پر پاکستانی باشندوں کے مقابل صف آراء ہونا رسمی تربیت یافتہ فوج کیلئے مناسب نہیں تھا،جس کا بنیادی کردار غیر ملکی خطرات کے خلاف ملکی سرحدوں کا دفاع کرنا تھا۔اس کے علاوہ فوج کو اپنا مورال یا اعتماد بھی مجروح ہوتا نظر آ رہا تھا۔فرنٹیئر کور کے ناخوش سپاہیوں کی اور بات ہے جبکہ رسمی فوج کے تربیت یافتہ جوانوں کی ناخوشی ایک بالکل ہی مختلف امر ہے۔ اس کے علاوہ متوازی نقصان (Collateral Damage) کی فکر ایک اضافی مسئلہ تھا۔جنگ کی اس سطح پر شہریوں کی جان و مال کو پہنچنے والا نقصان بہت ہی بری صورتحال کی عکاسی کر رہا تھا۔زیادہ فوجی دستے بھیجنے کا مقصد صرف اور صرف تباہی میں اضافے کا باعث بنتا اور مقامی آبادی مزید بیگانگی کا شکار ہو جاتی۔شاید سب سے اہم عنصر فوج کی قیادت کی جانب سے اس امر کی مخالفت تھی کہ بھارت کی سرحدوں سے فوج ہٹالی جائے جو کہ پاکستانی طالبان کے خطرے سے زیادہ موثر انداز میں نمٹنے کے لئے ان کو کرنا پڑتا۔تاہم پاکستانی حکومت قبائلی علاقوں اور سوات کو پاکستانی طالبان کے رحم وکرم پر چھوڑ دینے کے لئے بھی تیار نہیں تھی۔اس حوالے سے کچھ نہیں کہا جا سکتا تھا کہ وقت آنے پر اس کے کیا نتائج برآمد ہوتے۔اس طرح امریکی ردعمل کی فکر اپنی جگہ تھی۔ امریکہ زیادہ کارکردگی کا طلبگار تھا،کم کا نہیں۔ اگرچہ پاکستان امریکہ کے دباؤ سے سخت نالاں تھا،تاہم وہ واشنگٹن کے ساتھ اپنے تعلقات خطرے میں ڈالنے کے نتائج کا سامنا کرنے پر بھی تیار نہیں تھا۔ چنانچہ پاکستان کچھ نہ کچھ تو کر رہا تھا مگر خاطر خواہ کارکردگی کا مظاہرہ کرنے سے قاصر تھا بجائے اس کے پاکستانی طالبان کو کچھ سبق پڑھایا جاتا انہیں مزید آگے بڑھنے کے لئے بہت سے محرکات فراہم کر دیئے گئے۔

ایسے وقت میں جبکہ فوج تحریک طالبان کے ساتھ ایک ناخوشگوار لڑائی میں الجھی ہوئی تھی، پاکستان افغان طالبان کے لئے ایک بالکل ہی مختلف حکمت عملی اختیار کئے ہوئے تھے۔

جیسا کہ لال مسجد سے قبل کی صورت حال تھی، اس طرح کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے کبھی حقانی نیٹ ورک کو نشانہ بنایا ہو یا پھر بلوچستان میں ملا عمر کے مشیروں کو تکلیف دی ہو۔ انہیں چھوڑ دینے کی اور بات تھی۔ پاکستان کے ہاتھ پاکستانی طالبان سے بھرے ہوئے تھے۔ مگر اس امر کا اچھا خاصا ثبوت موجود ہے کہ اس صورتحال کا ایک اور رخ بھی تھا۔ احمد رشید کے دعوے کے مطابق افغان طالبان کو قبائلی علاقوں کی طرف دھکیل دیئے جانے کے تھوڑے ہی عرصے بعد آئی ایس کو یہ فریضہ سونپ دیا گیا تھا کہ ان کے ساتھ مل کر کام کرنے کے لئے آئی ایس آئی کے ریٹائرڈ افسروں پر مشتمل ایک عدد زیرزمین تنظیم تشکیل دے دی جائے۔ اس امر کا سب سے کھلا اشارہ کہ امریکہ کے پاس آئی ایس آئی اور افغان کے مابین شراکت عمل کا ثبوت موجود تھا نیویارک ٹائمز کے اس مضمون کی صورت میں سامنے آیا جو کہ جولائی 2008 میں کابل میں بھارتی سفارت خانے پر ہونے والے بم دھماکوں کے بعد شائع ہوا تھا۔ گمنام امریکی عہدیداروں نے ٹائمز کو بتایا تھا کہ ان بم دھماکوں کی منصوبہ بندی آئی ایس آئی نے کی تھی جبکہ حقانی نیٹ ورک کے منتخب کردہ ارکان کو ان پر عملدرآمد کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ اس کے بعد آنے والے مارچ میں امریکی عہدیداروں نے مزید انکشافات کرتے ہوئے ٹائمز کے رپورٹر کو بتایا تھا کہ افغان طالبان کے لئے آئی ایس آئی کی حمایت، پیسوں، فوجی ساز و سامان کی فراہمی، اور تزویری یا کلیدی منصوبہ بندی کے حوالے سے رہنمائی کے صورت میں موجود تھی۔ اس سے بھی زیادہ تباہ کن احوال ہارورڈ یونیورسٹی کے ماٹ والڈمین کی اس تحقیق میں موجود ہے جس کے تحت بے شمار افغان طالبان کمانڈروں کے ساتھ مکالمہ کیا گیا تھا۔ ان کے دعوے کے مطابق ان کے ماتحت جہادیوں کو آئی ایس آئی کا وسیع تر تعاون حاصل تھا اور یہ اصرار بھی کیا گیا کہ کوئٹہ شوریٰ میں بھی پاکستانی فوج کے خفیہ اداروں کی نمائندگی موجود تھی۔

یہ فرض کرتے ہوئے کہ ان بیانات میں کچھ نہ کچھ سچائی پائی جاتی ہے، ان کی دراصل کیا اہمیت ہوسکتی ہے؟ جیسا کہ ہم نے نائن الیون کے کچھ ہی عرصہ بعد مشاہدہ کیا، پاکستان نے دہشت گردی کے خلاف امریکہ کی جنگ میں اس کا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کی وضاحت انہوں نے اس طرح کی تھی کہ پاکستان دراصل القاعدہ کے کرتا دھرتاؤں کو انصاف کے کٹہرے میں لانے کے لئے امریکہ کی مدد کر رہا تھا اور اس نے صحیح معنوں میں اپنے الفاظ کا بھرم رکھتے

ہوئے امریکہ کو القاعدہ کے بہت سے تربیت یافتہ کارکنان پکڑنے میں پورا تعاون فراہم کیا بشمول خصوصی طور پر ان کارکنوں کے جنہوں نے پاکستان کے شہروں میں پناہ لے رکھی تھی۔ اور اس امر کی سخت مخالف کے باوجود وہ آخر کار القاعدہ جہادیوں کی تلاش کے لئے قبائلی علاقوں میں فوج بھیجنے پر بھی رضامند ہو گیا تھا۔ جیسا کہ خدشات پائے جاتے تھے اس کے نتیجے میں فوج پاکستانی طالبان کے ساتھ ایک انتہائی پیچیدہ و پریشان کن جنگ میں الجھ کر رہ گئی، جنہوں نے جواب میں خودکش بمبار حملے شروع کرنے کی مہم چلا دی جس کے باعث شہری علاقے دہشت گردی کی زد میں آ گئے۔ انہوں نے امریکہ کو پاکستانی سرزمین پر القاعدہ کو ہدف بنانے کے پری ڈیٹر میزائل چلانے کی اجازت بھی دے دی تھی۔ یہ سارے اقدامات اور ان کے نتائج پاکستان کے اندر ہر طبقہ زندگی کے لوگوں میں بڑھتی ہوئی ناپسندیدگی کی نظر سے دیکھے جا رہے تھے اور یوں پرویز مشرف کی ساکھ اس حد تک کمزور ہو کر رہ گئی کہ اس کی طرف سے سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو ہٹانے کی کوشش اونٹ کی پیٹھ پر آخری تنکا ثابت ہوئی۔

مگر امریکہ کے لئے پاکستانی حمایت یہیں تک محدود نہیں تھی۔ پاکستان نے امریکہ اور اس کے نیٹو حلیف ممالک کو یہ اختیار بھی دے دیا تھا کہ افغانستان تک اپنی فوجیں بھجوانے کے لئے وہ پاکستان کا زمینی راستہ استعمال کر سکتے تھے۔ افغانستان میں اتحادی فوجوں کو رسد کی فراہمی کے لئے استعمال ہونے والے 80 فی صد بار حوار ٹرک اور 40 فی صد ایندھن اس راستے سے گزر کر وہاں پہنچتے۔ یہ پاکستان کی جانب سے محض ممالک کو اپنی کاروائیاں جاری رکھنے کے لئے درکار ایک ناگزیر سہولت تھی۔ وہاں تعینات مغربی فوجوں کو رسد کی فراہمی کا کوئی تسلی بخش متبادل نہ اس وقت تھا اور نہ ہی آج موجود ہے۔ اس کے باوجود پاکستان ایک ہی وقت میں جہاں ایسے کاموں میں تعاون فراہم کر رہا تھا جو اس کے خیال میں امریکہ کیلئے سرانجام دینے میں بہت مشکل تھے، وہاں دوسری طرف وہ ان افغان طالبان کو نہ صرف محفوظ ٹھکانے فراہم کر رہا تھا بلکہ ان کے ساتھ اشتراک عمل بھی کر رہا تھا جو کہ افغانستان کے اندر امریکی فوجیوں کو موت کے گھاٹ اتار رہے تھے۔ اس طرح وہ بیک وقت دوہرا کردار ادا کر رہا تھا یعنی ان طاقتوں کے ساتھ تعاون کر کے جو امریکہ کے ان فوجیوں کو مار رہے تھے جن کے لئے رسد کی فراہمی میں مدد کی جا رہی تھی۔ یہ حقیقت کہ پاکستان اس طرح کی دوعملی کا مظاہرہ کرنے پر مجبور تھا اس امر کی عکاسی کر رہی تھی کہ پاکستان

افغانستان کی مستقبل کی صورتحال کو بہت اہمیت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ وہ امریکہ کے ساتھ بھی تعلقات خراب نہیں کرنا چاہتے تھے مگر افغان طالبان کی شکست کی صورت میں جو نتائج پیش آسکتے تھے ان کا سامنا کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے۔ان کے خیال میں اس طرح سے امریکی فوج کی جلد واپسی کی راہ ہموار ہو جائے گی اور وہ اپنے پیچھے ایک ایسی کمزور افغان حکومت چھوڑ جائے گی جو فطری طور پر پاکستان مخالف ہوگی اور ان کے یقین کے مطابق کم سے کم بھارت کے ساتھ ایک غیر رسمی اتحاد قائم کرلے گی۔اور اس طرح بھارت مستقبل میں کسی بھی تصادم کی صورت میں ان کو عقبی جانب سے دھمکانے کے قابل ہو جائے گا۔ چنانچہ یہی وہ وجہ تھی کہ جہاں وہ ایک طرف امریکہ کے مددگار حلیف کا کردار ادا کر رہے تھے وہاں وہ اس کا انتہائی پرعزم حریف بننے پر بھی خود کو مجبور محسوس کرتے تھے۔ یہ ایک دوہرا کردار تھا جو کہ یقینی طور پر خطرات سے پر تھا،مگر ان کے خیال میں ان کے پاس بیک وقت دونوں کردار سرانجام دینے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔''چور سے کہنا تو چوری کر اور شاہ سے کہنا تیرا گھر لٹا'' پاکستان کا ایک بہت مشہور مقولہ ہے۔

تاہم شہری علاقوں میں اس طرح کی کسی دوعملی کا مظاہرہ نہیں کیا جا رہا تھا، جہاں پاکستانی طالبان کے خلاف کاروائیوں کی بڑی بھاری قیمت چکانی پڑ رہی تھی۔ان کاروائیوں میں الجھنے کے باعث نہ صرف یہ کہ قبائلی علاقوں اور سوات میں ان کے فوج حملے الٹ کر رہ گئے تھے بلکہ اندرون ملک جاری دہشت گردی کی سرگرمیوں کو روکنے میں بھی انہیں سخت مشکلات پیش آ رہی تھیں۔2008 کے پورے سال اور 2009 کے اوائل میں ان حملوں میں تسلسل سے اضافہ ہوتا رہا جو کہ زیادہ تر خودکش بمباروں کی کارستانیاں تھیں۔ زیادہ تر حملے میدان جنگ سے دور فوج اور پولیس کے ٹھکانوں پر کئے گئے تھے۔ سب سے زیادہ اموات اگست 2008 کے ان دوہرے خودکش بم دھماکوں کے نتیجے میں واقع ہوئیں جو اسلام آباد کے باہر واہ آرڈیننس فیکٹری کے دروازہ کے قریب کئے گئے تھے۔فوج کے زیر انتظام چلائے جانے والے ہتھیار سازی کے اس کارخانے میں ستر سے زائد لوگ ہلاک ہو گئے تھے۔فروری 2008 میں اے این پی کی ایک انتخابی مہم پر ہونے والے خودکش حملے میں 25 افراد موت کے گھاٹ اتر گئے تھے۔ چار مزید افراد اس وقت ہلاک ہو گئے تھے جب ایک خودکش بمبار نے اے این پی کے قائد اسفندیار ولی کو اکتوبر میں عید کے موقع پر اپنے گھر میں مہمانوں کا استقبال کرتے ہوئے ہلاک کرنے کی کوشش کی تھی۔اس کے بعد آنے

والے فروری میں اے این پی کے ایک رکن صوبائی اسمبلی کو ایک عارضی طور پر تیار کردہ دھماکہ خیز مواد(IEP) کے ذریعے ہلاک کر دیا گیا تھا۔سویلین اہداف میں سب سے زیادہ بدنام زمانہ حملہ ستمبر میں اسلام آباد کے میریٹ ہوٹل پر کیا جانے والا حملہ تھا، جس کے نتیجے میں عمارت کا اچھا خاصا حصہ تباہ ہو جانے کے ساتھ ہی50 سے زائد افراد ہلاک اور250 سے زائد زخمی ہو گئے تھے۔ میریٹ، جو کہ اسلام آباد کا سب سے بہترین ہوٹل تھا، اعلیٰ سیاسی، سفارتی اور ثقافتی حلقوں کے مل بیٹھنے کے لئے بہت نمایاں جگہ تھی۔اسلام آباد میں شادیوں کی سب سے وسیع اور اہم ترین تقریبات عموماً یہاں منعقد کی جاتی تھیں۔اس کے علاوہ امریکی اور دوسرے سفارت خانوں کے عارضی مہمانوں کو بھی یہیں ٹھہرایا جاتا تھا۔ ہوٹل پر قیام کرنے والے دو امریکی اور ایک چیک سفارت کار بھی مرنے والوں میں شامل تھے۔

سب سے زیادہ سنسنی خیز حملہ مارچ2009 میں اس وقت دیکھنے میں آیا جب مشین گنوں سے مسلح 12 افراد نے پاکستان کے خلاف میچ کھیلنے کے لئے آئی ہوئی سری لنکا کرکٹ ٹیم کو لاہور کے ایک کرکٹ گراؤنڈ لے جانے والی بس پر حملہ کرتے ہوئے گولیوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔سری لنکا ٹیم کے کھلاڑی خوش قسمتی سے موت کے منہ میں جانے سے بچ گئے اورانہیں بارودی خول لگنے سے صرف معمولی چوٹیں آئی تھیں، کیونکہ ان کے بس کے ڈرائیور نے حاضر دماغی سے کام لے کر حملہ آوروں کی آنکھوں میں دھول جھونکتے ہوئے بس کو وہاں سے بھگا لے جانے میں کامیابی حاصل کر لی تھی۔تاہم اس میں چھ پولیس والوں اورامپائر کو لے جانے والی منی وین کے ڈرائیور سمیت آٹھ افراد لقمہ اجل بن گئے تھے۔حملہ آور بندوق بردار بچ کر فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے۔اس حملے نے پاکستان کے حوالے سے بدنام واقعات میں ایک اور بدنام واقعے کا اضافہ کر دیا۔کرکٹ اس ملک کا حقیقی معنوں میں واحد اہم قومی کھیل ہے اوراس میں عوام نہایت جوش وخروش سے شرکت کرتے ہیں۔دو ملکوں کے مابین ٹیسٹ میچ، ایک میزبان ٹیم اورایک مہمان ٹیم، اس کے لئے سب سے اہم واقعہ ہوتا تھا۔تاہم ملک کے اندر جاری دہشت گردی کی لہر نے دوسرے ممالک کی کرکٹ ٹیموں کو پہلے ہی خوفزدہ کر کے رکھ دیا تھا۔ان ممالک کے قومی کھلاڑیوں نے پاکستان میں کھیلنے سے انکار کر دیا تھا۔صرف ایک ملک جو ان حالات میں بھی کھیلنے کے لئے تیار تھا، سری لنکا، ہی تھا۔ پاکستان نے سری لنکا کو یہ سنجیدہ ضمانت فراہم کر دی تھی کہ ان کے کھلاڑیوں کو اس طرح کا

تحفظ ہی فراہم کیا جائے گا جو عموماً دوسرے ملکوں سے یہاں کے دورے پر آنے والے ریاستی سربراہان کے لئے ہی مخصوص ہوتا ہے۔ تاہم کھلاڑیوں کے قافلے کو فراہم کردہ حفاظتی پولیس کے دستے اس مقصد کے لئے ناکافی ثابت ہوئے یہ واقعہ پاکستانی حکام کے لئے ایک ذلت آمیز رسوائی تھی اور پاکستانی کرکٹ کے تابوت میں پہلے سے بھی بڑی کیل ثابت ہوا۔ اب کوئی بھی اس ملک کے دورے پر نہیں آئے گا۔ اس حملے کی ذمہ داری کا شبہ شروع شروع میں بہت سی تنظیموں پر کیا گیا تھا، مگر آخر کار الزام کی زد میں ایک ایسی تنظیم آ گئی جس کے بارے میں اس سے قبل کبھی نہیں سنا گیا تھا: پنجابی طالبان۔

سردیوں کے اواخر اور 2009 کی بہار کے اوائل کا زمانہ پاکستان کی قسمت کا حقیقی نکتہ زوال ثابت ہوا، نہ صرف کرکٹ کے حوالے سے بلکہ قبائلی علاقوں اور سوات کے حوالے سے بھی۔ بہت سا علاقہ تحریک طالبان کے زیر انتظام تھا۔ اس کا اجتماعی سطح کا قائد بیت اللہ محسود جنوبی وزیرستان کا بے تاج بادشاہ بن چکا تھا، جہاں سے وہ اور قاری حسین خود کش بمباری کے حملوں کی منصوبہ بندی جاری رکھے ہوئے تھے۔ سری لنکا کی ٹیم پر اور اس کے ساتھ ہی پنجاب کے اندر بہت سے دیگر کامیاب حملوں سے بخوبی ثابت ہوتا تھا کہ انہیں صوبے کے اندر سے بھی اچھی خاصی حمایت اور تعاون فراہم کیا جا رہا تھا۔ اس فروری میں محسود حافظ گل بہادر اور مولوی نذیر کے ساتھ اپنے اختلافات حل کرنے میں بھی کامیاب ہو گیا تھا۔ ان کے جاری کردہ ایک مشترکہ اعلامیہ میں اوباما، کرزئی اور زرداری کو اہم ترین دشمن قرار دے دیا گیا تھا۔ زرداری کا حوالہ اس حقیقت کی عکاسی کر رہا تھا کہ حکومت پاکستان اب دوبارہ سویلین ہاتھوں میں آ گئی تھی۔ پی پی پی نے بے نظیر بھٹو قتل کے دو ماہ بعد ہونے والے فروری 2008 کے عام انتخابات میں فتح حاصل کر لی تھی۔ اس کا رنڈوا، آصف علی زرداری اب اس کی جگہ پارٹی کا سربراہ بننے کے ساتھ ہی مشرف کی طرف سے اگست میں صدارت کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد پاکستان کا صدر بھی بن گیا تھا۔ تاہم حکومت کی تبدیلی سے عملی طور پر کوئی فرق بھی نہیں پڑا تھا۔

اگرچہ فوج کو باجوڑ میں کچھ کامیابی حاصل ہو گئی تھی، مگر اس کے لئے اسے سوات میں بہت بھاری قیمت چکانی پڑی تھی، جو کہ مکمل طور پر قابو سے باہر نکل چکا تھا۔ سوات میں فوج کی ناکامی سے صوبہ سرحد میں اے این پی کی حکومت دہشت کا شکار نظر آتی تھی۔ پاکستان طالبان نے

وادی سے اس کے کارکنوں کو دھکیل باہر کر دیا تھا جبکہ اس کے قائدین خودکش بمباروں کی بڑھتی ہوئی کارروائیوں کی زد میں تھے۔2009 کے اوائل تک فوج کی پانسہ پلٹ کر رکھ دینے کی صلاحیتوں کے حوالے سے تیزی سے کمزور پڑتی ہوئی توقعات کے مابین، انہوں نے یہ فیصلہ کیا کہ اب ان کے پاس ایک اور معاہدہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا۔

وہ صوفی محمد کو مذاکراتی عمل میں شامل کرنے کے لئے دوبارہ ماضی میں چلے گئے۔ اسے گزشتہ برس ہی جیل سے اس امید پر رہا کر دیا گیا تھا کہ ہوسکتا تھا وہ اپنے سے بھی زیادہ جنونی داماد ملا فضل اللہ سے حمایت واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاتا۔ مگر ایسا نہیں ہوا تھا، البتہ اے این پی کے قائدین خود کو اس امر پر قائل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے کہ اگر وہ اس کے ساتھ کوئی معاہدہ کر لیتے ہیں تو ہوسکتا تھا وہ فضل اللہ کو بھی اس حوالے سے اتفاق رائے پر مجبور کر لیتا۔ چنانچہ بعد ازاں ہونے والے مذاکرات میں ٹی این ایس ایم کے بانی نے بڑی کڑی شرائط پیش کر دی تھیں۔ اس کے اے این پی کی طرف سے شریک مذاکرات قائدین کو نہ صرف وادی سوات کے اندر، جہاں فضل اللہ کے جہادیوں کو غلبہ حاصل تھا بلکہ پورے کے پورے مالاکنڈ ڈویژن میں جس کا کہ سوات محض ایک چھوٹا سا علاقہ تھا، نفاذ شریعت پر رضا مند ہونے کے سوا اور کوئی چارہ نظر نہ آیا۔ یہ ایک بہت اہم کامیابی تھی کیونکہ مالاکنڈ ڈویژن پورے صوبہ سرحد کے ایک تہائی پر مشتمل تھا۔ فضل اللہ کی طرف سے جوابی طور پر ہتھیار ڈال دینے اور مقامی حکومت کے اداروں کا انتظام واپس صوبہ سرحد کی حکومت کو لوٹانے کا وعدہ کیا گیا تھا۔ فروری کے وسط میں طے پانے والے اس معاہدے کے اعلان کے کچھ عرصہ بعد ہی فوج کی جانب سے اس کی سرعام توثیق بھی کر دی گئی تھی۔ آصف زرداری کی طرف سے بھی، جس نے کہ اس معاہدے کو قابل نفاذ بنانے کے لئے اس پر دستخط کرنے تھے، کافی لیت ولعل سے کام لیا گیا۔ اس پر امریکہ کی طرف سے اس پر دستخط نہ کرنے کے حوالے سے کافی دباؤ تھا۔ اس امر کا اندازہ لگانا کوئی اتنا مشکل کام نہیں تھا کہ امریکہ کو اس میں کیا ناپسند تھا۔ اس کے تحت پاکستانی طالبان کو وہ کچھ مل جانا تھا جو وہ چاہتے تھے یعنی شریعت کا نفاذ، مگر حکومت کے مطالبات یعنی ہتھیار پھینک دینے اور سوات میں حکومتی اختیارات کی بحالی کے حوالے سے کسی طرح کا طریق عمل نہیں بتایا گیا تھا۔ گذشتہ نصف عشرے کے دوران پاکستانی حکومت کی طرف سے پاکستانی طالبان کے ساتھ جو معاہدہ بھی کیا گیا تھا اس کے نتیجے میں متنازعہ

علاقے کا انتظام ہمیشہ موخرالذکر کے ہاتھوں میں ہی جاتا رہا۔ اس مرتبہ یہ یقین کرنے کی کوئی وجہ نظر نہیں آ رہی تھی کہ اب ایسا نہیں ہوگا، خاص طور پر اس حقیقت کے پیش نظر کہ اے این پی دباؤ میں رہ کر مذاکرات کر رہی تھی۔

مجھے اور پاکستانی معاملات پر دوسرے ماہرین کو اس وقت یہی لگ رہا تھا۔ مجھے اس بات پر حیرت ہو رہی تھی کہ آیا پاکستان کے سویلین یا فوجی مقتدر حلقے کبھی اس قابل ہوں گے کہ اسلامی انتہاء پسندی کے تیزی سے پھیلتے ہوئے خطرے کی مزاحمت کی جرأت کر سکیں۔ اگر پاکستانی حکمران ملک کے اندر بیرونی سیاحوں کے لئے ایک انتہائی پرکشش اور قیمتی قطعہ اراضی کا دفاع کرنے سے بھی قاصر تھے تو پھر وہ کس چیز کا دفاع کر سکتے تھے؟ معاہدے کے بعد معاہدے میں انہوں نے آسان راستہ اختیار کرنے کی کوشش کی تھی، یعنی مسائل کے حل کو مزید التواء کا شکار کر دینا۔ مگر اب مزید گنجائش نظر نہیں آ رہی تھی۔ میں نے اپنی ان پریشانیوں کا اظہار اپنے ایک مضموں بہ عنوان "The Unravelling of Pakistan" میں کیا تھا، جو کہ ان گرمیوں کے آغاز میں برطانیہ کے خارجہ امور کے رسالے سروائیول میں نمودار ہوا تھا۔ میں نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ پاکستان کی طرف سے پاکستانی طالبان سے نمٹنے کے معاملے میں جس کمزوری کا مظاہرہ کیا گیا تھا اس کے نتیجے میں ان کے نظریات اور عمل میں اور بھی شدت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت تک آگے بڑھتے رہیں گے جب تک کہ ان کو روک نہیں دیا جاتا۔ اپریل 2009 کے وسط میں، جب کہ میرا مضمون ابھی اشاعت کے مرحلے تک نہیں پہنچا تھا، آصف زرداری نے آخر کار سوات معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ وہ دراصل اس امر کا ثبوت فراہم کرنے پر اصرار کرتا رہا تھا کہ وادی میں امن لوٹ آیا تھا، مگر اس کے ہاتھ اس لئے مجبور ہو گئے تھے کہ صوفی محمد نے سارے کے سارے معاہدے سے ہی پھر جانے کی دھمکی دے ڈالی تھی۔ اپنی سیاسی ساکھ کو محفوظ رکھنے کے لئے زرداری نے یہ اصرار کیا تھا کہ قومی اسمبلی بھی اس معاہدے کی توثیق کرے۔ جو بعد ازاں اتفاق رائے سے کر دی گئی۔

مگر حتیٰ کہ جب زرداری اس معاہدے پر دستخط کر رہا تھا تو اس وقت بھی مُلّا فضل اللہ سوات کے جنوب میں مالاکنڈ ڈویژن کے ایک ضلع بونیر میں اپنے جہادیوں کو روانہ کر رہا تھا۔ اس کے دستخط کر دینے کے کچھ دنوں کے اندر اندر سینکڑوں اور جہادی بھی پہنچنا شروع ہو گئے تھے۔ پاکستانی طالبان طرز کا انصاف نافذ کرنے کے لئے اسلامی عدالتیں قائم کر دی گئی تھیں اور بیرونی

سیاسی جماعتوں پر پابندی لگا دی گئی۔ اے این پی کی مقامی انتظامیہ کو بے دخل کر دیا گیا تھا۔ زرداری کی طرف سے معاہدے پر دستخط کے پورے ایک ماہ بعد فضل اللہ کے ترجمان نے اعلان کر دیا کہ سوات میں فضل اللہ کے جہادی خود کو اس معاہدے کا پابند تصور نہیں کرتے۔ بونیر میں داخل ہو جانے کا اقدام یہ ظاہر کرتا تھا کہ مُلّا فضل اللہ کا سوات میں اپنی سرگرمیوں کو محدود کر دینے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ پاکستانی حکام سارے کے سارے مالاکنڈ ڈویژن میں شرعی قوانین کے نفاذ پر رضامند ہو چکے تھے اور وہ اس کا عملی مظاہرہ دیکھنا چاہتا تھا۔ مگر یہ سب کچھ اس کی شرائط پر ہونا تھا۔ بونیر کا اپنے اگلے ہدف کے طور پر انتخاب تقریباً یقینی طور پر ایک طرح سے حکومت کے لئے پیغام تھا۔ یہ سوات سے اسلام آباد کی طرف اگلا ضلع تھا جو اسلام آباد سے صرف 60 میل کے فاصلے پر تھا۔ وحشی فوجیں دروازے پر دستخط دے رہی تھیں۔ پاکستان کے مقتدر طبقے، سویلین و فوجی، ذلت آمیز شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ ان کی طرف سے رعایت دینے کی حکمت عملی مکمل طور پر ناکام ہو چکی تھی۔ اچانک یہ امکان نظر آنے لگا تھا کہ پاکستانی طالبان دریائے سندھ کے مغرب میں ساری کی ساری پشتون سرزمین کو اپنے زیرِ انتظام لانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مگر، بدقسمتی سے، یہ اس کا صرف نصف تھا۔

MashalBooks.org

8

ممبئی، وقوعہ بونیر، اور امریکہ کی مشکلات

یہ صوفی محمد کے ساتھ اے این پی کے حتمی معاہدے سے دو ماہ قبل اور مُلّا فضل اللہ کو بونیر میں داخلے سے چار ماہ قبل 26 نومبر 2008 کی ایک شام تھی۔ دس بھاری مسلح نوجوان جنوبی ممبئی سے متصل بندرگاہ کے علاقے میں کشتیوں سے برآمد ہوئے اور وہاں سے روانہ ہوگئے، بعض افراد ٹیکسی کے ذریعے اور بعض پیدل۔ اگلے ساٹھ گھنٹوں کے دوران وہ ایک خاص مقصد کے ساتھ شہر کے اندر سے گزرتے ہوئے پہلے منتخب کردہ مقامات پر رک جاتے اور خوفزدہ ہجوم کو کہیں دستی بموں کا نشانہ بناتے اور کہیں خودکار ہتھیاروں سے فائرنگ کرتے گزرتے رہے۔ جس وقت ان کا سفر اختتام پذیر ہوا اس وقت تک وہ 160 سے زائد افراد کو ہلاک اور 300 سے زائد کو زخمی کر چکے تھے۔ ان کے ٹھہرنے کے مقامات میں مرکزی ریلوے اسٹیشن، ایک مقامی ہسپتال، ایک مقبول و معروف کیفے، اندرون شہر واقع وہ ہوٹل جہاں مغربی ممالک کے سیاح اکثر قیام کرتے تھے، اور یہودیوں کا ایک گمنام فلاحی مرکز شامل تھے۔ اس مرکز سے حراست میں لئے گئے بعض یہودیوں کو موت کے گھاٹ اتارنے سے قبل تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا۔ بھارت کے سیکیورٹی ادارے بالکل ہی غفلت کا شکار تھے اور حملہ ہونے کے بعد انہیں آخری دہشت گرد کو تاج ہوٹل سے نکال باہر کرنے تک تین دن مسلسل جدوجہد کرنی پڑی۔ ممبئی پر حملہ نائن الیون کے بعد بین الاقوامی دہشت گردی کا ایک اور خیرہ کن مظاہرہ تھا، جس کے اثرات اس کے دورانیے کے باعث شدت کے حامل تھے اور اس کے ساتھ ہی اسے عالمی ذرائع ابلاغ میں بہت ہی زیادہ توجہ حاصل ہوئی۔ اس نے بھارتی باشندوں پر بالکل اسی طرح کے اثرات مرتب کئے جس طرح کہ نائین الیون نے

امریکی باشندوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان دونوں واقعات کے مابین مماثلت کی عکاسی اس طریقہ ہوتی ہے جو وہ اس کا حوالہ دیتے وقت کرتے ہیں۔ اسے 26/11 کے طور پر جانا جاتا ہے۔

اس حملے میں نو عدد دہشت گرد ہلاک ہو گئے تھے۔ واحد بچ جانے والا دہشت گرد وہ نوجوان تھا جس کا نام اجمل قصاب تھا۔ وہ ایک پاکستانی باشندہ نکل آیا جس کا تعلق پنجاب کے ایک چھوٹے سے دیہات فرید کوٹ سے تھا جو کہ لاہور کے جنوب میں 65 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ جیسا کہ اس نے جلد ہی اعتراف کر لیا تھا اس کا تعلق لشکر طیبہ سے تھا جس نے اس حملے کی منصوبہ بندی اور عملدرآمد کا فریضہ سرانجام دیا تھا۔ ممبئی حملوں کے نتیجے میں پاکستان اور بھارت ایک بار پھر جنگ کے دہانے پر پہنچ گئے، بالکل اسی طرح جیسے 2001 کے اواخر اور 2002 کے اوائل میں بالترتیب نیو دہلی میں انڈین پارلیمنٹ پر اور جموں میں بھارتی فوجیوں کے اہل خانہ پر ہونے والے حملوں کے بعد ہوا تھا۔ بنیادی فرق تناظر کا تھا۔ شروع کے حملے اس عرصے کے دوران ہوئے تھے جب پاکستان جہادیوں کو کشمیر کے اندر بھجوانے کے لئے بڑی سرگرمی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ دونوں ممالک کے درمیان تعلقات بہت ہی سرد مہری کا شکار ہو چکے تھے اور بھارت کے ذہن میں کارگل کی یادیں ابھی تک تازہ تھیں۔ ممبئی کا معاملہ بالکل ہی مختلف تھا۔ یہ کچھ حد تک بالکل ہی اچانک ایسے موقع پر وقوع پذیر ہونے والا واقعہ تھا جب پاکستان اور بھارت کے درمیان نسبتاً بہتر تعلقات تھے، اور اس کے نتیجے میں امن کا وہ مرحلہ بری طرح متاثر ہو کر رہ گیا جس کا آغاز دونوں ممالک نے پانچ برس قبل کچھ امیدوں اور رسمی تکلفات/دھوم دھام کے ساتھ کیا تھا۔

امن کے مرحلے نے بذاتِ خود 2001 کے اواخر اور 2002 کے اوائل میں پیدا ہونے والے بحران سے جنم لیا تھا۔ بش انتظامیہ نے دونوں ممالک کو جنگ کے دہانے سے واپس لانے کے لئے پرویز مشرف کو اس امر کا عہد کرنے پر رضامند کر لیا تھا کہ پاکستان کشمیر کے اندر جہادیوں کے داخلے کے حوالے سے ہر طرح کی حمایت و تعاون سے مستقل طور پر دست کش ہو جائے گا۔ اس کے جواب میں امریکہ نے دونوں فریقوں کو مذاکرات کی میز پر واپس لانے کی کوششوں کا یقین دلا دیا تھا۔ کشمیر میں واقعات کا قریب سے جائزہ لینے والے ایک سابقہ اعلیٰ فوجی عہدیدار نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان نے اپنے حصے کی ذمہ داری نبھاتے ہوئے کشمیر میں جہادیوں کی بقول اس کے ''مثبت حمایت'' سے ہاتھ کھینچ لیا تھا۔ اس دعوے کی کشمیر میں مرنے اور زخمی ہونے والے

افراد کے اعداد و شمار سے بھی تصدیق ہوتی ہے، جن کے مطابق 2002 کے آغاز میں مہلک واقعات کی تعداد میں نمایاں کمی واقع ہونے لگی تھی اور یہ رجحان اس وقت تک جاری تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں تھا کہ کشمیر میں جہادیوں کی دخل اندازی یا جہادی تنظیموں کی طرف سے حملوں کا سلسلہ بالکل ہی ختم ہو گیا تھا؛ یہ سلسلہ جاری ہے اور بھارتی ذرائع ابلاغ میں اکثر و بیشتر اس کا ذکر بھی ہوتا رہتا ہے۔ آج کل زیادہ تر حملے انہی تنظیموں کی طرف سے ہی کئے جا رہے ہیں جو ایک عشرہ قبل بھی ان کی ذمہ دار تھیں، یعنی حزب المجاہدین لشکر طیبہ اور جیشِ محمد۔ مگر پاکستانی فوج کی بھرپور حمایت کے بغیر انہیں لائن آف کنٹرول کے دوسری طرف ضروری ساز و سامان لے جانے میں زیادہ مشکل پیش آ رہی ہے۔ ایل او سی (LOC) کے دونوں طرف توپوں سے گولہ باری کا سلسلہ وقفے وقفے سے نومبر 2003 میں بظاہر اس وقت تک جاری رہا جب بھارت اور پاکستان اس جنگ بندی معاہدے پر رضامند ہو گئے جس کے نتیجے میں توپیں خاموش ہو گئیں۔ اس کے ساتھ ہی شمال کی طرف سیاچن گلیشیئر پر بھی لڑائی کا سلسلہ تھم گیا۔ نئے سرے سے امن و امان قائم کرنے کے لئے ہونے والے مذاکرات کے اس سلسلے کا اختتام دو ماہ بعد جنوری 2004 میں اس وقت ہوا جب دونوں فریق جامع مذاکرات دوبارہ شروع کرنے پر رضامند ہو گئے تھے۔

امن و امان کی کوششوں کا سلسلہ جاری رکھنے میں امریکہ نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہ اہم تبدیلی عین اس وقت دیکھنے میں آئی جب بش انتظامیہ پاکستان پر شدید دباؤ ڈال رہی تھی کہ قبائلی علاقوں میں القاعدہ کے چھپے ہوئے رہنماؤں کی تلاش میں فوج روانہ کی جائے۔ پاکستان کے نزدیک یہ دونوں پالیسیاں باہم مربوط تھیں۔ اس وقت حکومت کے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار نے مجھے بتایا تھا کہ واشنگٹن پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات کی بہتری کا اس لئے خواہاں تھا تا کہ پاکستان یکسوئی کے ساتھ قبائلی علاقوں پر توجہ مرکوز کر سکے۔ ایک ترغیب کے طور پر امریکہ نے یہ وعدہ بھی کر لیا تھا کہ وہ کشمیر کے مسئلے میں دلچسپی لینے کے ساتھ ہی اس حوالے سے ہونے والے مذاکرات کی مثبت سمت میں لے جانے کی کوششوں پر بھی تعاون کرتا رہے گا۔ اس عہدیدار نے یہ بھی بتایا کہ پاکستان نے امریکہ کی طرف سے کرائی جانے والی اس مبینہ یقین دہانی کو کشمیر میں متحرک ان جہادی تنظیموں کو ٹھنڈا کرنے کے لئے استعمال کیا تھا جو کشمیر میں سرایت کر جانے کی اپنی جدوجہد میں فوج کے بھرپور تعاون سے محرومی پر سخت نالاں تھیں۔ تاہم حکومت نے آزاد کشمیر

میں جہادیوں کے تربیتی مراکز بند کرنے کے حوالے سے کوئی عملی اقدام نہ کیا، جہاں پر لشکر طیبہ اور جیشِ محمد لائن آف کنٹرول کے اس طرف سرایت کر جانے کے لئے اپنے جہادی تیار کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے تھیں۔ امن مرحلے کے آغاز کے ایک برس بعد میں نے فوج کے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار سے جو کہ کشمیری نسل سے تعلق رکھتا تھا سوال کیا کہ پاکستانی حکام نے ان تربیتی مراکز کو بند کرنے کے لئے کوئی اقدام کیوں نہیں کیا تھا۔ اس کا جواب بالکل سیدھا اور صاف تھا۔ حکومت پاکستان ان کو اس لئے سرگرمیوں سے منع نہیں کر رہی تھی کیونکہ یہ امن کوکوششوں کے ناکام ہو جانے کے خطرے سے تحفظ فراہم کرتی تھیں۔ کیا یہ بات قابل فہم نہیں تھی؟ آخر کار جہادی تنظیمیں وہ واحد پتہ تھیں جو پاکستانی کشمیر میں کھیل سکتا تھا۔

اگرچہ امن مرحلے کا آغاز دو حریفوں کے مابین تعلقات میں حقیقی تبدیلی کی علامت نظر آتا تھا، مگر اس کے بہت کم واضح نتائج سامنے آئے تھے۔ ممبئی واقعات کی صورت میں انجام تک پہنچنے والے پانچ برسوں کے دوران دونوں فریق اہم تنازعات کے حوالے سے کسی بھی معاہدے پر پہنچنے میں ناکام رہے تھے۔ زیادہ سے زیادہ جس بات پر اتفاق رائے دیکھنے میں آیا وہ باہمی اعتماد پیدا کرنے والے اقدامات کی ایک ایسی بے ضرر یا بے فائدہ قسم کی مختصر فہرست تھی جس میں سب سے اوپر سری نگر اور آزاد کشمیر کے دارالحکومت مظفر آباد کے درمیان بس سروس کا آغاز تھا۔ یا پھر دوسرے ممالک کے مبصرین کو اس وقت یہی نظر آیا تھا۔ تاہم مارچ 2009 میں، ممبئی واقعے کے چار ماہ بعد ایک، صحافی نے یہ خبر دی تھی کہ بھارت اور پاکستان 2007 کے آغاز میں مسئلہ کشمیر کے حل کے انتہائی قریب پہنچ چکے تھے۔ تقریباً تقریباً یہ نتیجہ خیز تبدیلی اس وقت واقع ہوئی تھی جب پردے کے پیچھے ہونے والے از سرنو مذاکرات جو کہ اس سے قبل 1999 میں ہونے والی لاہور سربراہی ملاقات کی طرح خفیہ طور پر منعقد کئے جا رہے تھے جبکہ اس سے کم ثمر آور جامع مذاکرات عوام کی نظروں کے سامنے کئے جا رہے تھے۔ اس مرتبہ مذاکرات کرنے والے افراد پرویز مشرف کا طویل عرصے کا ساتھی اور مشیر طارق عزیز اور ایک جہاں دیدہ بھارتی سفارت کار تھے۔ کول کے مطابق معاہدے کے مسودے کے مطابق کشمیر میں مسلمان اکثریت کو اچھی خاصی خود مختاری کے ساتھ ہی لائن آف کنٹرول کے دونوں جانب رہنے والے کشمیریوں کو سرحد کے اس پار آنے جانے کی آزادی بھی حاصل ہو جاتی۔ بھارت اور پاکستان کی فوجیں خطے سے بتدریج واپس بلالی

جاتیں، جبکہ انڈیا طریق عمل کے تحت ایل او سی کے دونوں اطراف سیاسی اور اقتصادی مسائل کے حل کی طرف طرف پیش رفت کی جاتی تھی۔

ایک اہم نکتہ یہ ہے کہ کہ مجوزہ معاہدے کے تحت اس جغرافیائی تنازعے کے حوالے سے کوئی شق نہیں رکھی گئی تھی جو کہ مسئلہ کشمیر کی جڑ تھا۔ کشمیر کو لائن آف کنٹرول، دریائے چناب یا کسی بھی اور متفقہ سرحد کے ساتھ ساتھ مستقل بنیادوں پر تقسیم کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ یہ ایک انتہائی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ تھا۔ چونکہ پاکستانی کسی طرح بھی اس طرح کا کوئی معاہدہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں تھے جس کے تحت وادی کشمیر پر بھارت کی مستقل بالادستی تسلیم کرنے کا امکان نظر آتا تھا، اس لئے انہوں نے اس امر پر اصرار جاری رکھا کہ معاہدہ لازماً عبوری نوعیت کا ہونا چاہئے۔ اس پر پندرہ برس بعد نظر ثانی کی شق شامل کر لی گئی تھی۔ اس وقت کے پاکستانی وزیر خارجہ خورشید قصوری نے بعد ازاں کول کی طرف سے بیان کردہ بہت سی تفصیلات کی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے نیویارکر کے ایک مضمون کے لئے کول کو دیئے جانے والے انٹرویو میں کول کو بتایا تھا کہ 2007 کے اوائل تک دونوں فریق معاہدے کو حتمی شکل دینے کے اتنے قریب پہنچ گئے تھے کہ صرف نیم وقفے یا سیمی کولون کے نشانات پر ہی اختلافات باقی رہ گئے تھے۔ اسی طرح کا بیان ایک اعلیٰ بھارتی عہدے دار نے بھی دیا تھا۔ معاہدہ کبھی پایہ تکمیل تک نہیں پہنچا، جس کی پوشیدہ وجہ یہ بیان کی جاتی ہے کہ مشرف اس وقت خود کو سیاسی طور پر اتنا مضبوط محسوس نہیں کر رہا تھا کہ عوامی سطح پر اس کی حمایت حاصل کر سکتا۔ وہ امریکہ کے ساتھ اپنے اتحاد کی وجہ سے پہلے ہی مشکلات کا شکا تھا اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کو معطل کر دینے کے فیصلے کے نتیجے میں مزید بحران کا شکار ہوتا جا رہا تھا۔ مگر کہانی یہاں تمام ہوتی نظر نہیں آتی۔

اگرچہ قصوری نے کول کو یہ بتایا گیا کہ فوج نے معاہدے کی حمایت کر دی تھی، مگر مجھے یہی بتایا گیا کہ اس طرح نہیں تھا۔ جس وقت دونوں فریق معاہدے کے مسودے کے اندر نیم وقفوں یا سیمی کولون کو حتمی شکل دے رہے تھے، تو طارق عزیز نے فوج کی اعلیٰ قیادت یعنی کور کمانڈروں کو مجوزہ معاہدے کی تفصیلات سے آگاہ کر دیا تھا۔ مشرف بھی موقع پر موجود تھا۔ پاکستان کے ایک سابقہ اعلیٰ سفارت کار نے جو فریقین میں سے ایک کے ساتھ بات کر چکا تھا، مجھے بتایا کہ اگرچہ مشرف نے معاہدے کی بھرپور حمایت کی تھی، مگر کور کمانڈر قائل نظر نہیں آ رہے

تھے اور پریشان تھے۔ان میں سے اکثر کو شک تھا کہ بھارت پر معاہدے کی شرائط کی پاسداری کے حوالے سے مکمل اعتماد کیا جا سکتا تھا۔انہیں سب سے زیادہ فکر فوجوں کی واپسی کے حوالے سے لاحق تھی کیونکہ اس طرح کے کوئی شواہد موجود نہیں تھے کہ معاہدے میں فوجوں کی واپسی کی نگرانی کے عمل یا اس کی پائیداری کے حوالے سے کوئی طریقہ کار شامل تھا۔جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا، پاکستان نے تنازعہ کشمیر کے ابتدائی دنوں میں اقوام متحدہ کی استصواب رائے کے حق میں منظور کردہ قراردادوں کے مطابق آزاد کشمیر کے اندر سے فوجیں واپس بلانے سے انکار کر دیا تھا، کیونکہ اسے خوف تھا کہ بھارت موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کے خالی کردہ علاقے میں اپنی فوجیں داخل کر سکتا ہے۔ بھارتی فوجوں کی واپسی کے عمل کی نگرانی کے حوالے کسی طرح کے طریق عمل کی عدم موجوگی میں پاکستانی لیفٹیننٹ جنرلز کو غالباً یہ خوف تھا کہ بھارت دوبارہ اس طرح کرنے کا ارادہ کر سکتا تھا۔

تاہم مسئلہ صرف فوج کا نہیں تھا۔ پاکستان کے لئے معاہدے کے حوالے سے کشمیری مسلمانوں کو آمادہ کرنا بھی مشکل نظر آ رہا تھا۔ جبکہ مذاکرات اپنے اختتام کی طرف جا رہے تھے تو کشمیر میں اہم مخالف تنظیموں سے خفیہ صلاح مشورہ کر لیا گیا تھا، اور ان کی اکثریت اس سے اتفاق کر چکی تھی۔ مگر ان میں سے ایک اہم فریق ابھی بھی رضا مند نہیں تھا۔ یہ جماعت اسلامی کی کشمیر شاخ کا طویل عرصہ سے چلا آنے والا رہنما سید علی گیلانی تھا۔ جیسا کہ قصوری نے بعد ازاں اعتراف کیا تھا، گیلانی کسی بھی ایسے معاہدے پر ہرگز تیار نہیں تھا جس کے تحت کسی ایسی حتمی جغرافیائی تقسیم پر اتفاق نہ کیا گیا ہو جس کے مطابق کشمیر کے مسلم آبادی والے علاقے کو پاکستان کے ساتھ ملحق کیا جا سکے۔اس کا سخت گیر انکار اہمیت رکھتا تھا، محض اس لئے نہیں کہ وادی میں اس کو مقبولیت حاصل تھی بلکہ اس لئے بھی کہ پاکستان کے اندر ممکنہ ردعمل کے حوالے سے یہ انکار کیا ظاہر کرتا تھا۔ جماعت اسلامی بھی یقیناً اس کی مخالفت کرتی اور یہی کچھ ان سیکولر قوم پرست باغیوں کو کرنا تھا، جن کی اکثریت فوج سے قریبی روابط رکھتی تھی اور جن کے لئے کشمیر میں پاکستان کے جغرافیائی مقاصد کا حصول ایک خبط کی طرح ان کے ذہن پر سوار تھا۔اور پاکستانی جہادی تنظیموں کا کیا ردعمل ہونا تھا؟ لشکر طیبہ اور جیش محمد کو ایک مثبت معاہدے کی توقع میں انتظار کرنے کی تاکید کر دی گئی تھی۔ایک ایسے معاہدے پر ان کا کیا ردعمل ہونا تھا جو ان کے نزدیک ایک عظیم تر مسئلے کے

حوالے سے کم ازکم پندرہ برس تک کسی طرح کی پیش رفت کے امکان سے خالی نظر آتا تھا۔

حقیقت یہ تھی کہ مجوزہ معاہدہ کشمیر کی خودمختاری بھارت کے حوالے کرنے کا ایک وسیلہ تھا مگر اس کا اظہار نہیں کرتا نظر آتا تھا۔ یہ کوئی نیا خیال یا تجویز نہیں تھی۔ اس کا نچوڑ میرے سامنے سب سے پہلے 2000 میں اس سابقہ کتابی یا پڑھا کو پاکستانی لیفٹیننٹ جنرل نے پیش کیا تھا جس کے پاکستان کی طرف سے ایٹمی ہتھیاروں کے استعمال اور جہانگیر کرامت کے سر پر منڈلاتے ہوئے استعفیٰ پر تبصرے کا حوالہ میں نے باب نمبر 2 میں دیا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ اس نے نہ چاہتے ہوئے بھی یہ نتیجہ اخذ کر لیا تھا کہ پاکستان کشمیر کے مسئلے پر کبھی فتح حاصل نہیں کر سکتا تھا اور اسے کشمیر سے باعزت طور پر دستبردار ہونے کی ضرورت تھی۔ اس کی تجویز، جو کہ بقول اس کے وہ چھوٹی چھوٹی محفلوں میں ہونے والے مباحثوں میں منوانے کی کوشش کرتا رہا تھا، یہ تھی کہ ایک ایسا معاہدہ ہونا چاہئے جس کے مطابق کشمیر کی مکمل خودمختاری بحال کر دینے کے ساتھ ہی لائن آف کنٹرول کے ساتھ ساتھ ایک کھلی سرحد قائم کر دی جائے، مگر جغرافیائی مسئلے پر کسی قسم کا موقف اختیار نہ کیا جائے۔ اس کی تجویز ابھی ابتدائی مراحل سے ہی گزر رہی تھی اور اس کی بہت سی تفصیلات جو کہ بعد میں سامنے آنے والے معاہدے کی شرائط سے مماثلت رکھتی تھیں بعد ازاں پس پردہ منعقد کئے جانے والے مذاکرات میں کام آئی تھیں۔ مجھے اس کا کوئی علم نہیں ہے کہ آیا جنرل کو اپنی اس سوچ کے حوالے سے پرویز مشرف سے بھی تبادلہ خیال کرنے کا موقع ملا تھا یا نہیں جس کو وہ بہت قریب سے جانتا تھا، تاہم اس وقت میرا یہ خیال تھا کہ اس طرح کی تجاویز ہی غالباً مسئلہ کشمیر کے واحد حقیقت پسندانہ حل کی طرف لے جا سکتی تھیں۔ تاہم اس وقت بھی، اب کی طرح، مشکل یہ تھی کہ پاکستانی عوام کو اس پر کس طرح آمادہ کیا جائے۔ مشرف جو کہ اقتدار میں آتے وقت کشمیر کے مسئلے پر بہت سخت موقف رکھتا تھا، آخر کار خود کو اس تجویز کے حوالے سے آمادہ نہیں ہوا۔ یہ ممکن ہے کہ مشرف اس تجویز کو اس وقت منوانے کی کوشش کر لیتا جب اس کی سیاسی ساکھ بہت مضبوط تھی، مگر اس کے باوجود اسے زبردست مخالفت کا سامنا کرنا پڑ جاتا۔

اس حوالے سے کچھ واضح نہیں ہے کہ آیا لشکر طیبہ کو ممبئی حملوں سے قبل اس طرح پیش رفت کا علم تھا یا نہیں۔ حکام بالا کی آشیر باد سے اس کے قائد حافظ سعید نے 2002 کے شروع میں حکومت کی طرف سے رسمی پابندی عائد کر دیئے جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد اپنی تنظیم کا نام

تبدیل کر کے جماعتہ الدعویٰ رکھ دیا تھا اگرچہ لشکر نے فوج کی بھرپور حمایت کے بغیر ہی کشمیر کے اندر اپنے جہادی سرایت کر دینے کا سلسلہ جاری رکھا ہوا تھا، تاہم اس کی زیادہ توجہ پاکستان کے اندر اپنی سرگرمیوں پر مرکوز رہتی۔ اس نے اپنی خیراتی سرگرمیوں کے ذریعے اپنا وقار اور اثر ورسوخ برقرار رکھنے کی کوشش جاری رکھی۔ اس کا سب سے زیادہ فائدہ اسے کشمیر میں اکتوبر 2005 میں آنے والے تباہ کن زلزلے کے دوران ہوا جب آزاد کشمیر میں اس کے تربیتی مراکز کی طرف سے قائم کی گئی بنیادی سہولتوں کے ڈھانچے کے ذریعے زلزلہ زدگان کو سہارا دینے والی اشیاء اور طبی امداد کی فراہمی اس کے لئے آسان ہوگئی تھی۔ اس کی کارکردگی کی بدولت، جو کہ نسبتاً غیر موثر قسم کے سرکاری اداروں کی کارکردگی سے بہت ہی زیادہ تھی، اسے پاکستانی عوام میں بہت زیادہ قدر و منزلت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس حوالے سے بھی کچھ ثبوت ملا ہے کہ ہوسکتا ہے لشکر نے اس عرصے کے دوران جہاد کے مقصد کے پیش نظر اپنی کچھ سرگرمیوں کا رخ افغانستان کے میدانِ جنگ کی طرف کر دیا ہو۔ تاہم تنظیم امن کوششوں کی ناکامی اور کشمیر میں جاری اپنی سرگرمیوں کے حوالے سے پاکستانی حکومت کے تعاون کے خاتمے پر خاصی مایوس نظر آنے لگی ہے۔ بھارت کے الزام کے مطابق لشکر نے جولائی 2006 میں ممبئی کے قریب ٹرینوں پر کئے جانے والے پے در پے بم دھماکوں کے لئے ایک انتہا پسند بھارتی اسلامی تنظیم کا تعاون حاصل کیا تھا، جن کے نتیجے میں 200 سے زائد افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ مگر یہ واقعہ، اگرچہ اس میں زیادہ انسانی جانیں ضائع ہوگئی تھیں، اس طرح کی سنسنی اور تاثر پیدا کرنے میں ناکام رہا جو 26 نومبر (26/11) کے واقعے کے نتیجے میں پیدا ہوا تھا، اور جو اس کے منصوبہ سازوں نے ذرائع ابلاغ کی غیر معمولی توجہ حاصل کرنے کے لئے تیار کیا تھا۔

پاکستان ممبئی واقعے کے دوران ہونے والی ہلاکتوں اور اجمل قصاب کے اس ابتدائی اعتراف کے مضمرات سے بالکل ہی غافل نظر آتا تھا کہ اس واقعے کے پس پردہ لشکر طیبہ کا ہاتھ تھا۔ اسے بھارت خاص طور پر اس کے وزیر اعظم من موہن سنگھ کی جانب سے عائد کردہ اس الزام پر بھی بہت تکلیف محسوس ہوئی کہ اس واقعے میں پاکستانی حکومت کا ہاتھ تھا، اس کا اشارہ صاف صاف آئی ایس آئی کی طرف تھا۔ جیسا کہ اس سے قبل ہوتا آیا تھا، امریکہ فوری طور پر بحران کے حل کی کوششوں میں مصروف ہوگیا تھا تاکہ صورتحال قابو سے باہر نہ ہوجائے۔ پاکستان نے پہلے پہل

دفاعی ردعمل ظاہر کیا اور اس امر کی تردید کی کہ حملہ آور پاکستانی تھے۔ تاہم آخرکار اس نکتے کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو کر آنے والے ماہ فروری میں لشکر کے آپریشنل کمانڈرز کی الرحمٰن لکھوی اور اس کے بے شمار ساتھیوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ نومبر میں لکھوی اور اس کے سات عدد ساتھیوں پر ممبئی حملوں کی منصوبہ بندی کرنے کے حوالے سے باقاعدہ فرد جرم عائد کر دی گئی۔ یہ سب کچھ 26 نومبر کے حملوں کے تقریباً ایک برس بعد ہوا۔ پاکستان نے لشکر کے قائد حافظ سعید کو بھی گھر کے اندر نظر بند کر دیا تھا، اگرچہ حکومت کے دعوے کے مطابق اس کا ممبئی حملوں میں ملوث ہونے کا کوئی ثبوت نہیں ملا تھا۔ اس مفروضہ عدم شہادت کی بناء پر لاہور ہائی کورٹ نے جون 2009 کے شروع میں اس کی رہائی کے احکامات جاری کر دیئے۔ حکام نے مظفر آباد اور پاکستان کے دیگر بے شمار شہروں میں لشکر کے قائم کردہ مراکز پر چھاپے بھی مارے مگر، 2001 کی طرح، تنظیم کے خلاف بہ حیثیت مجموعی کوئی کاروائی نہ کی۔

2010 کے موسم بہار مین بھارت نے پاکستان کے ملوث ہونے کے حوالے سے الزامات کا دوبارہ اعادہ کیا۔ اس مرتبہ ان کے دعوے کے مطابق ایک پاکستانی نژاد امریکی شہری ڈیوڈ ہیڈلے نے انہیں کچھ ثبوت فراہم کئے تھے۔ اسے ایک امریکی عدالت کی طرف سے اس جرم میں سزا بھی سنا دی گئی تھی کہ وہ حملوں کے لئے ممکنہ اہداف کا جائزہ لینے میں لشکر کی معاونت کے لئے ممبئی کے دورے پر بھی گیا تھا۔ اپنے انٹرویو کے لئے آنے والے تفتیشی افسروں کو اس نے بتایا کہ اس ساری کی ساری کاروائی میں آئی ایس آئی قدم قدم پر ملوث رہی تھی۔ اگرچہ اس کے الزامات کو سرے سے ہی مسترد نہیں کیا جا سکتا، تاہم اس امر پر یقین کرنا مشکل ہے کہ جنرل کیانی، پاکستان کے فوجی سربراہ اور سابقہ ڈی جی آئی ایس آئی نے جانے بوجھے ایسے حملوں کی اجازت دی ہو جن کا مقصد ایسے مقامات کو نشانہ بنانا ہو جہاں غیر معمولی افراد کثرت سے آتے جاتے رہتے ہوں۔ میں نے یہاں جنرل کیانی کا ذکر اس لئے کیا ہے کیونکہ اس طرح کی منصوبہ بندی کی غیر معمولی اہمیت اور اثرات کے پیش نظر آئی ایس آئی نے جنرل کیانی کی ذاتی اجازت کی ضرورت محسوس کی ہوگی۔ یہ امر واضح نظر آتا ہے کہ ممبئی حملوں کی منصوبہ بندی اس طرح کی گئی تھی کہ اس واقعے کو ذرائع ابلاغ میں زیادہ سے زیادہ سنسنی خیز انداز میں پیش کرنے کا مقصد حاصل ہو سکے اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی واضح نظر آتا ہے کہ یوں پاکستان پر الزام لگنے کے ساتھ ہی اس کی عالمی سطح

پر بھی مذمت کی جائے گی۔ یہ نکتہ سمجھنا اتنا مشکل نہیں ہے کہ آخر لشکر طیبہ پاکستان اور بھارت کے تعلقات کیوں خراب کرنا چاہتی ہوگی، مگر یہ سمجھ سے بالاتر ہے کہ اس کا پاکستان کو کیا فائدہ ہوسکتا تھا۔ بعدازاں بھارت نے یہ خیال پیش کیا تھا کہ پاکستان کا دراصل پس پردہ یعنی حقیقی مقصد یہ رہا ہوگا کہ لشکر کے ارکان کہیں اس تنظیم کا ساتھ چھوڑ کر نہ چلے جائیں یا پھر کہیں القاعدہ یا پاکستانی طالبان کے ساتھ نہ جاملیں۔ تاہم اگر سنجیدہ محرک یہی رہا ہو تو ان کے لئے اس سے بھی بہت بہتر طریقہ یہ ہوتا کہ وہ سیلاب کا رخ کشمیر کی طرف کر دیتے۔ تاہم اس کے باوجود اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ ایسا ہوا تھا۔ جو کچھ بھی ہو، ممبئی حملوں میں آئی ایس آئی کے کردار کے بغیر بھی حقیقت یہ ہے کہ پنجاب سے تعلق رکھنے والی ایک جہادی تنظیم کی طرف سے جس کے آئی ایس آئی سے روابط کوئی ایسی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی، ممبئی کی طرف کے حملوں کی منصوبہ بندی اور ان پر عملدرآمد بذات خود بھی اچھا خاصا قابل مذمت فعل تھا۔ اس سے ایک مرتبہ پھر یہ ثابت ہوگیا تھا کہ پاکستان جن جہادی تنظیموں کی حمایت وامداد کر رہا تھا ان کو حدود میں رکھنے کے لئے اس نے کوئی اقدامات نہیں کئے تھے۔

اور یہ حقیقت بھی مساوی طور پر قابل مذمت ہے کہ اگرچہ لشکر طیبہ نے تاریخ کے دوسرے سنسنی خیز ترین حملوں کی کاروائی سرانجام دے ڈالی تھی، مگر پاکستان کی طرف سے اس تنظیم کو غیر موثر کرنے کی کبھی کوئی کوشش نہیں کی گئی۔ جوابی کاروائی کے طور پر صرف چند ایک مجرموں کو گرفتار کر کے پاکستان یہ ثابت کرتا نظر آ رہا تھا کہ اس کاروائی کی ذمہ داری صرف لکھوی اور لشکر کے ایک چھوٹے سے باغی دھڑے پر عائد ہوتی ہے اور حافظ سعید اور باقی ماندہ پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوتی۔ اس طرح کا اشارہ یا کنایہ اگرچہ کبھی بھی خود پاکستان کی طرف سے نہیں دیا گیا، مگر یہ زیادہ قابل فہم نظر نہیں آتا۔ اس امر کا بہت ہی کم امکان نظر آتا ہے کہ لشکر کے آپریشنل کمانڈر نے اس طرح کے تباہ کن اثرات کے حامل اپنے سے فوراً اوپر بیٹھے ہوئے عہدیدار کی رضامندی حاصل کئے بغیر اور یوں تنظیم کے اندر بڑے پیمانے پر پھوٹ پڑ جانے کے خطرے کو نظر انداز کر کے سرانجام دیئے ہوں۔ اور پھر بھی تنظیم میں کسی طرح کے انتشار کے آثار نظر نہیں آئے تھے۔ اس کی بجائے تنظیم کی سالمیت کو برقرار رکھنے کے لئے لکھوی کو قربانی کا بکرا بنا کر پیش کر دیا گیا۔ اس دوران پاکستان نے اس واقعے میں اپنے ملوث ہونے کے الزام کی شدت سے تردید کر کے،

قوانین وضوابط کی آڑ لیتے ہوئے، ہیڈلے کو جھوٹا قرار دینے کے ساتھ ہی حافظ سعید کے خلاف کسی طرح ثبوت کے مبینہ فقدان پر کندھے اچکا کر خود کو اس صورتحال سے بری الذمہ قرار دینے میں کامیابی حاصل کر لی۔

تاہم سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ممبئی جیسے خوفناک واقعے کے بعد بھی لشکر کو مسلسل تحفظ فراہم کرنے کا کیا مقصد ہے؟ اس حکمت عملی کے پس پردہ صاف ظاہر ہے کہ کشمیر میں باہمی تعاون کی طویل تاریخ کارفرما ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ حتیٰ کہ جب فوج نے کشمیر کے اندر مداخلت کی سرگرمیوں کے حوالے سے اپنا بھرپور تعاون بھی ختم کر دیا تھا، اس وقت بھی پاکستان لشکر کو مسلسل اپنی بیمہ پالیسی یعنی بھارت کے حوالے سے کامیاب خارجہ پالیسی کی ضمانت سمجھتا رہا۔ ممبئی کی طرح کے واقعات کے مستقبل میں وقوع کے پذیر ہونے کے خطرے کے باوجود، اپنے ان اصل پتوں کی قربانی دینا مشکل ہوتا ہے جو آپ کے خیال میں اس کھیل کے لئے ضروری ہوتے ہیں جو آپ کی نظر میں سب سے اہم کھیل ہوتا ہے۔ تاہم اس صورتحال کے کچھ اور پہلو بھی ہیں۔ بہت ہی زیادہ دھڑوں میں تقسیم جیش محمد کی چند ایک باقیات کے ممکنہ استثنیٰ کے ساتھ، لشکر طیبہ ملکی سطح کی وہ واحد جہادی تنظیم ہے جو کبھی بھی ریاست کی مخالفت پر نہیں آئی، پاکستان اس کو اسی شکل میں دیکھتے رہنا ہی پسند کرے گا، اور یقیناً اس کی بہت مناسب وجہ بھی موجود ہے۔ لشکر ملک کے پنجابی علاقے کے مرکز میں واقع سب سے بڑی اور انتہائی دبدبے والی شدت پسند اسلامی تنظیم ہے۔ 2009 میں نیویارک ٹائمز کو انٹرویو دیتے ہوئے ایک درمیانی سطح کے آئی ایس آئی آفیسر نے بتایا کہ اس تنظیم کے ارکان کی تعداد ڈیڑھ لاکھ ہے۔ اس نے خیال ظاہر کیا کہ اگر یہ جیش محمد کو بھی ساتھ ملا لے تو پورے پاکستان میں قیامت برپا کر سکتی ہے۔ اس سے بھی بڑی سطح کے ایک اور قابل ذکر سابقہ پاکستانی عہدیدار نے جو کہ اس حوالے سے زیادہ باخبر ہونے کی استطاعت رکھتا نظر آتا تھا کہ آئی ایس آئی لشکر کے حوالے سے کیا سوچ رکھتی تھی، مجھے بتایا کہ اس کو یقین تھا کہ یہ تعداد بہت ہی زیادہ بتائی گئی تھی۔ اس نے بتایا کہ اس کے تربیت یافتہ جہادیوں کی تعداد 25000 کے لگ بھگ ہوگی۔ تاہم یہ بہت ہی دبدبے والی تنظیم ہے جو کہ پاکستان کی ہر لحاظ سے بہترین منظم جہادی تنظیم ہے۔ لشکر کی طرف سے خوف وہراس کی جو فضا پیدا کی جا چکی تھی یا اس کی جو ہیبت تھی اس کی عکاسی لاہور کے ایک معروف صحافی کے اس تبصرے سے ہوتی ہے جو اس نے میرے ساتھ گفتگو کرتے

ہوئے کیا تھا کہ اگر لشکر چاہے تو صرف 5000 افراد بھیج کر پنجاب کے دارالحکومت پر صرف ایک دن میں قبضہ کر لے۔ اس کے بیان کے مطابق پولیس کا دور دور تک نام ونشان ہی نظر نہیں آئے گا۔

2009 کی بہار تک، ممبئی حملوں کے فوری اثرات کے تحت ملک کے اندر موجود شدت پسند اسلامی تنظیموں سے نمٹنے کے حوالے سے پاکستان کی بے بسی یا بدنصیبی اپنی انتہاء پر پہنچ چکی تھی۔ ممبئی حملوں کے باعث بھارت کے ساتھ کشمیر پر ہونے والے کبھی روشن امکانات کے حامل پرامن مذاکرات اچانک تعطل کا شکار ہو کر رہ گئے تھے اور ساتھ ہی پاکستان کی بین الاقوامی سطح پر خستہ حال ساکھ بھی مزید داغدار ہو گئی تھی۔ ملک کے مغرب میں حکومت نے اگرچہ قبائلی علاقوں کو تقریباً تقریباً پاکستانی طالبان کے حوالے کر کے رکھ دیا تھا، مگر اس کے باوجود اس کے فاتح دشمنوں کی طرف سے دہشت گرد حملوں کا سلسلہ بتدریج جاری تھا۔ شاید سب سے زیادہ شرمناک حقیقت یہ تھی کہ انہوں نے وادی سوات میں نظم ونسق چلانے کے اپنے حق سے عملاً دستبرداری ظاہر کر دی تھی اور یوں مُلا فضل اللہ کے ہاتھوں مزید ذلیل ہونے قبل ہی اس سے منحرف ہو کر جنونی انداز میں اپنے جہادیوں کو جنوب میں اسلام آباد کی طرف واقع بونیر کی جانب بھجوا دیا تھا۔

یہ وہ وقت تھا جب آخر کار پاکستان کو حرکت میں آنا پڑا۔ پاکستانی طالبان اپنی حدود سے کہیں آگے نکل چکے تھے۔ فوجی حلقوں سے قریبی روابط رکھنے والے ایک اعلیٰ سطح کے سابقہ پاکستانی سفارتکار نے مجھے بتایا کہ بونیر والے واقعے کے پیش نظر، پاکستانی حکومت، فوج اور سویلین سب ہی قائل ہو گئے تھے کہ اگر طالبان کو روکا نہ گیا تو وہ مسلسل پیش قدمی کرتے رہیں گے۔ اب وقت آ چکا تھا کہ انہیں واپس دھکیل دیا جائے۔ خاص طور پر حکام کو یہ احساس بھی ہو گیا تھا کہ اب عوامی رائے بھی تحریک طالبان کی مخالفت میں جانا شروع ہو گئی تھی۔ اس حد تک کہ بہت سے پاکستانیوں کی رائے میں قبائلی علاقوں اور سوات میں پیدا کردہ مسائل کی ذمہ داری امریکہ پر یا پھر پرویز مشرف پر عائد ہوتی تھی جس نے امریکہ کی دہشت گردی کے خلاف جنگ میں اس کا ساتھ دینے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔ یہ ان کی طرف سے کی جانے والی کارروائیاں ہی تھیں جس نے پاکستانی طالبان کو ریاست کا دشمن بننے پر مجبور کر دیا تھا۔ روایتی دانش کے مطابق یہ مسائل اس وقت تک حل نہیں ہو سکتے تھے جب تک کہ امریکہ اس خطے سے چلتا نظر نہیں آتا تھا جس کے فوری طور پر کوئی آثار نہیں تھے۔ اگرچہ ان امریکہ مخالف رویوں میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی، مگر

پاکستانی طالبان کے حوالے سے رویے ضرور تبدیل ہو چکے تھے۔ ملکی سطح پر جاری دہشت گردی کی لہر نے جس کے پیچھے تحریک طالبان کے قائد بیت اللہ محسود کا ہاتھ تھا، ایک اہم کردار ادا کیا تھا۔ تاہم عام لوگ پاکستانی طالبان کے اس وحشیانہ طرز حکومت سے بھی سخت بیزاری محسوس کرنے لگے تھے، جسے کہ ذرائع ابلاغ میں پاکستان کے اندر بھی بہت نمایاں طور پر پیش کیا جا رہا تھا۔ سوات میں ایک نوجوان لڑکی کو بے رحمی سے کوڑے مارنے کا منظر دکھانے والی ایک ویڈیو نے بھی سخت اشتعال پیدا کر دیا تھا۔ اس کا جرم صرف یہ تھا کہ وہ ایک ایسے مرد کے ساتھ چلتی پھرتی دیکھی گئی تھی جو کہ اس کا خاوند نہیں تھا۔ سروں کی شناخت سے عاری یا لطیف جذبوں سے محروم فضل اللہ کے جہادیوں کی فوج نے یہ ویڈیو اپنی ہی قسم کی شریعت کے انصاف کی ایک مثال کے طور پر جاری کی تھی۔ جیسے ہی پاکستانی طالبان پنجاب کے قریب پہنچنے لگے عام پاکستانی خوف و دہشت میں مبتلا ہو گئے۔ جو چیز پہلے ایک دور دراز کا تصور لگ رہی تھی اب یکدم سر پر منڈلاتی ہوئی خوفناک حقیقت بن چکی تھی۔ یہ وہ طریقہ نہیں تھا جس کے مطابق بہت سے پاکستانی، جن کی اکثریت صوفیانہ اسلام کے بریلوی پیروکاروں پر مشتمل تھی، کسی کی حکمرانی میں رہنا چاہتے تھے۔ پاکستانی طالبان ان کے طرز زندگی کے لئے ایک خطرہ تھے۔

اپریل 2009 کے اختتام تک فوج بونیر میں داخل ہو کر فضل اللہ کے جہادیوں کو نکال باہر کرنے کا عمل شروع کر چکی تھی۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے سوات میں ایک بڑی کاروائی کرنے کی تیاریاں شروع کر دی تھیں جس کا نام انہوں نے ''رائٹ پاتھ'' یا راہ راست رکھا تھا۔ اپنی گزشتہ کوششوں کو داغدار کر کے رکھ دینے والی سویلین اموات/حادثات سے پوری طرح آگاہ ہونے کی وجہ سے فوج نے سویلین آبادی پر علاقہ چھوڑ دینے کے لئے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا۔ جس کی پیروی کرتے ہوئے لوگوں نے بڑی تعداد میں وہاں سے نکل کر صوبہ سرحد کے دوسرے علاقوں میں اپنے دوستوں اور رشتہ داروں کے ہاں پناہ لینی شروع کر دی، مگر ان کی اکثریت نے جلدی میں وادی سوات کے باہر حکومت کی طرف سے تعمیر کردہ پناہ گزین مراکز میں پناہ لے لی تھی۔ بعض اندازوں کے مطابق سوات اور اس سے متصل علاقوں میں ہونے والی لڑائی سے بچنے کے لئے کوئی 30 لاکھ کے قریب افراد اپنے گھر چھوڑ کر فرار ہو گئے تھے جو کہ سر چکرا دینے والی تعداد ہے۔ مئی کے اوائل میں فوج نے پورے عزم اور جوش کے ساتھ سوات میں داخل ہونا شروع کر دیا تھا۔ ماہ کے

آخر میں پاکستانی طالبان کوسوات کے سب سے بڑے شہر مینگورہ سے باہر دھکیل دیا گیا تھا اور فوج نے بڑے مخصوص انداز میں اوپر وادی کی طرف بڑھتے ہوئے ایک کے بعد دوسرے قصبے سے فضل اللہ کے جہادیوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا تھا۔ پاکستانی طالبان کو بہت زیادہ جانی نقصان اٹھانا پڑا تھا اگرچہ فضل اللہ بذات خود گرفتاری سے بچ جانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ جولائی کے اواخر تک فوج ساری کی ساری وادی خالی کروانے میں کامیاب ہو گئی تھی اور فضل اللہ کے بکھرے ہوئے جہادیوں کا صفایا کرنے کی کاروائیوں میں مصروف تھی۔ سوات کے باشندوں نے اپنے گھروں کو لوٹنا شروع کر دیا تھا۔ صوفی محمد کو گرفتار کر کے جیل میں ڈال دیا گیا تھا۔ فوج کو فتح حاصل ہو چکی تھی۔

فوج کی فتح کیونکر ممکن ہوئی؟ سویلین آبادی سے علاقے خالی کروانے کی حکمت عملی نے اہم کردار ادا کیا تھا کیونکہ اس طرح سے سویلین آبادی کو پہنچنے والے نقصانات کے خدشے سے نجات مل گئی تھی۔ مگر اصل وجہ یہ تھی فوج نے اس مرتبہ پہلے سے بہت زیادہ فوجی دستے روانہ کئے تھے۔ جون کے وسط میں جبکہ جارحانہ کاروائیاں ابھی پورے عروج پر تھیں، سوات میں ایک پاکستانی کمانڈنگ جنرل نے صحافیوں کو بتایا تھا کہ فوج نے اس کاروائی کے لئے چالیس ہزار جوانوں پر مشتمل دستے مخصوص کئے تھے۔ اس کے مطابق یہ تعداد لال مسجد کے واقعے کے بعد سوات سے فضل اللہ کے جہادیوں کو دھکیل باہر کر دینے کی کوششوں کے وقت مخصوص کئے گئے فوجیوں کی تعداد سے چار گنا زیادہ تھی۔ اس صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے کہ اس نے ماضی میں اپنے قبضے میں آنے والے علاقے طالبان کے رحم وکرم پر چھوڑ دیئے تھے، فوج نے اس مرتبہ اعلان کر دیا تھا کہ جب تک پاکستانی طالبان کا خطرہ موجود تھا تو وہ علاقہ چھوڑ کر نہیں جائے گی۔ 15 جولائی کو جبکہ کاروائی اپنے اختتامی مراحل تک پہنچ چکی تھی حکومت نے اعلان کیا کہ وہ جنوبی وزیرستان میں داخل ہو کر سوات میں اپنی کوششوں کا تسلسل چاہتی ہے۔ منصوبہ بندی کے مطابق بیت اللہ محسود کو وہاں سے نکال باہر کرنے کے بعد ملک کے اندر اس کی دہشت گرد کاروائیوں کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا جانا تھا۔ پاکستانی عوام کے مطابق سوات کوئی اکیلی یا ایسی الگ تھلگ کوشش نہیں تھی بلکہ ان پاکستانی طالبان کو تباہ کر کے رکھ دینے کی وسیع تر کوششوں کا پہلا مرحلہ تھا جنہوں نے ریاست کے خلاف ہتھیار اٹھا لئے تھے۔

اگرچہ 15 جولائی کے اعلان سے یہ توقعات پیدا ہو گئی تھیں کہ جنوبی وزیرستان پر

جارحانہ حملے کا آغاز ہونے والا تھا، مگر کارروائی کو آخر کار تین ماہ کے لئے ملتوی کر دیا گیا جس پر بہت سے حلقوں نے حیرت و ناپسندیدگی کا اظہار کر ڈالا۔ ایک مسئلہ ساز و سامان کی نقل و حمل کا بھی تھا۔ چونکہ فوج سوات کو دفاعی حصار میں رکھنے کا تہیہ کر چکی تھی، اس لئے اسے علاقے کے اندر درکار اضافی دستوں کے تعین اور انہیں وہاں منتقل کرنے کی ضرورت تھی تا کہ اسے یقین دہانی ہو جائے کہ جنوبی وزیرستان کے لئے اس کے پاس کافی تعداد میں دستے باقی ہیں۔ تاہم ایک اور مشکل بھی اپنا کردار ادا کرتی نظر آ رہی تھی۔ فوج کا منصوبہ یہ تھا کہ محسود پر حملے کے لئے شمالی اور جنوبی دونوں اطراف سے ان علاقوں کے ذریعے پیش قدمی کی جائے جو حافظ گل بہادر اور مولوی نذیر کے زیر انتظام تھے۔ خبر ملی تھی کہ جون کے اواخر میں ان دونوں پاکستانی طالبان رہنماؤں نے حکومت کے ساتھ اپنا اتحاد/معاہدہ ختم کر دیا تھا۔ اس کی اہم وجہ یہ بیان کی گئی تھی کہ انہیں قبائلی علاقوں میں امریکی پری ڈیٹر میزائلوں کے ڈرامائی حد تک بڑھتے ہوئے حملوں پر رنجش تھی۔

جنوری 2009 میں اوباما انتظامیہ نے اپنے عہدوں پر کام شروع کرتے ہوئے افغانستان اور قبائلی علاقوں کے حوالے سے سخت موقف اپنانے کا اعلان کر دیا تھا۔ انتخابی مہم کے دوران صدارتی امیدوار اوباما نے کہا تھا کہ وہ پاکستان کے لئے فوجی امداد کی منظوری اس وقت تک نہیں دے گا جب تک کہ افغان طالبان کو پاکستان کی سرزمین سے افغانستان کے اندر حملوں سے باز رکھنے کے حوالے سے کوئی پیشرفت نہیں دکھائی جائے گی۔ تاہم تازہ تازہ اقتدار سنبھالنے کے بعد اوباما کو ایک ایسے پاکستان سے واسطہ پڑا جو حتیٰ کہ طالبان کی پاکستانی قسم سے نمٹنے کی اہلیت سے بھی محروم نظر آتا تھا۔ پاکستان زیادہ سے زیادہ اس امر پر رضامند نظر آتا تھا کہ قبائلی علاقوں میں پری ڈیٹر میزائل حملوں میں اضافہ کر دیا جائے۔ اس حوالے سے بنیادی کام کا آغاز گزشتہ ستمبر میں ہی کر دیا گیا تھا جب حکومت چھوڑ کر جانے والی بش انتظامیہ نے پری ڈیٹر پروگرام میں اچھی خاصی توسیع کے لئے پاکستان کی رضامندی حاصل کر لی تھی۔ اس حوالے سے توسیع کردہ اہداف میں نہ صرف القاعدہ کے سخت جان جہادیوں کا اضافہ کر دیا گیا بلکہ طالبان کی دونوں اقسام کا بھی بشمول اس حقانی نیٹ ورک کے اس ذیل میں اضافہ کر دیا گیا جسے مبینہ طور پر پاکستان کی حمایت حاصل تھی۔ ڈرون حملوں کی تعداد میں اوبامہ کے اقتدار سنبھالنے سے قبل ہی نمایاں اضافہ ہو چکا تھا۔ 2008 کے پہلے آٹھ ماہ کے دوران صرف ایک درجن حملے دیکھنے میں آئے تھے۔ مگر سال کے آخری

چار ماہ کے دوران ان کی تعداد بائیس تھی۔ اوباما انتظامیہ نے وہیں سے آغاز کیا تھا جہاں پر بش انتظامیہ نے اختتام کیا تھا۔ 2009 کے پہلے نصف کے دوران افغان اور پاکستانی دونوں اقسام کے طالبان پری ڈیٹر میزائلوں کا نشانہ بننے لگے تھے۔ ان میں حکومت پاکستان کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے والی تنظیمیں بشمول حقانی نیٹ ورک اور حافظ گل بہادر و مولوی نذیر کے جہادی بھی شامل تھے۔ اس عرصہ کے دوران القاعدہ کی نسبت طالبان کے اہداف پر بہت زیادہ حملے کئے گئے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ افغانستان میں امریکہ کی مشکلات تیزی سے بڑھتی جا رہی تھیں کیونکہ وہاں طالبان کی بغاوت کچل دینے کی کوششیں اتنی کامیاب نہیں جا رہی تھیں۔ تاہم ڈرون حملوں کی مہم میں پاکستانی عوام کے سب سے اہم دشمن، بیت اللہ محسود کو بھی ہدف بنا لیا گیا تھا، نیو امریکن فاؤنڈیشن نامی ایک تنظیم کے سروے کے مطابق جولائی 2009 میں محسود کے جہادیوں پر چودہ الگ الگ ڈرون حملے کئے گئے تھے۔

محسود کے خلاف ڈرون حملوں سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ پاکستان اولاً وسیع تر اہداف متعین کرنے پر رضامند ہی کیوں ہوا تھا۔ بش انتظامیہ کے ساتھ ستمبر 2008 میں ہونے والا معاہدہ قبائلی علاقوں میں پاکستانی قسمت کے نقطہ زوال پر پہنچنے کے وقت طے پایا تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ محسود نے فوج کی جانب سے اسے جنوبی وزیرستان کے مضبوط ٹھکانے سے نکالنے کے لئے کی جانے والی کوششوں کو ناکام بنا دیا تھا اور ملکی دہشت گردی کی مہم کی منصوبہ بندی بلا دھڑک جاری رکھے ہوئے تھا۔ پری ڈیٹرز کی شکل میں پاکستان کو محسود سے نجات حاصل کرنے کا ایک نسبتاً کم لاگت وسیلہ ہاتھ آ گیا تھا۔ مگر اس کا ایک نقصان بھی تھا۔ امریکہ مدد کرنے پر تیار تھا لیکن صرف اس صورت میں جبکہ پاکستان اپنے حلیف حقانی نیٹ ورک اور گل بہادر مولوی نذیر کے جہادیوں کو ہدف بنانے پر خاموش رضامندی ظاہر کر دیتا۔ یہ ایک ایسی قیمت تھی جسے پاکستان ادا کرنے میں متامل تھا، تاہم آخر کار اسے رضامند ہونا پڑا۔ اس طرح ان پر لگنے والے ایسے الزامات کی تردید تو ہو گئی تھی کہ وہ ان تنظیموں کی پشت پناہی کر رہے تھے، مگر ان کے وجود کو کسی حقیقی خطرے سے دوچار کئے بغیر۔ ڈرون انفرادی طور پر لوگوں کو ہلاک کر سکتے تھے مگر پوری کی پوری تنظیم کو نشانہ نہیں بنا سکتے تھے۔ پاکستان جو کہ طالبان کے ساتھ دوہرے برتاؤ پر اتنا پریشان نظر نہیں آتا تھا جتنا کہ امریکیوں کے ساتھ، اب نتائج کا سامنا کرنے پر تیار ہو چکا تھا۔ اس حقیقت کے پیش نظر کہ اس نے پری ڈیٹر

حملوں کی تردید اور مذمت کی تھی اسے اپنے طالبانی حلیفوں کی شکایات کا سامنا کرنے میں اتنی مشکل پیش نہیں آئی۔ تاہم پاکستان ابھی بھی ایک حد سے آگے نہیں جا سکتا تھا۔ قبائلی علاقہ جات، جہاں ڈرون حملوں کی اجازت تھی، اور بلوچستان وصوبہ سرحد کے درمیان جہاں کہ ان کی اجازت نہیں تھی واضح خط امتیاز کھینچ دیا گیا تھا۔ اگرچہ ان دونوں صوبوں مین بہت سے ممکنہ ہدف، مُلا عمر کا نام ذہن میں آتا ہے، موجود تھے، مگر وہاں کسی قسم کے پری ڈیٹر حملے نہیں کئے گئے تھے۔ یہ پاکستان کے آباد علاقوں اور باقاعدہ طور پر انتظامی اکائیوں یعنی صوبوں میں شمار ہوتے ہیں اور پاکستان ان میں اور پنجاب وسندھ کے درمیان کوئی فرق روا نہیں رکھتا۔ قبائلی علاقوں میں ڈرون حملے بہت بڑے اثرات کے حامل تھے، مگر امریکہ کو ان علاقوں میں کاروائی کرنے کی اجازت دینے کا مطلب اپنی خودمختاری پر ضرورت سے زیادہ سمجھوتہ کرنا تھا۔ ملک کے اندر اس کی حمایت کا حصول ناممکن تھا۔

اگست2009 کی شام کو پاکستان کو ڈرون حملوں کی مہم کے حوالے سے ایک بہت ہی اہم فائدہ حاصل ہوا۔ پری ڈیٹر کیمروں کی آنکھ نے بیت اللہ محسود کو جنوبی وزیرستان میں ایک عمارت کی چھت پر بیٹھا ہوا دیکھ لیا تھا۔ اخباری خبروں کے مطابق وہ ذیابیطس کی بیماری کے باعث گلوکوز کی بوتل لگوانے کے ساتھ ہی اپنی تازہ تازہ بننے والی دوری بیوی سے ٹانگ کی مالش کروا رہا تھا۔ چند ہی لمحوں کے بعد گھر کے اندر میزائل آگرے جن کی زد میں آکر نو بیاہتا جوڑے سمیت بے شمار دیگر لوگ بھی ہلاک ہوگئے۔ محسود کی موت سے پاکستان میں ہر طرف اطمینان کی لہر دوڑ گئی۔ اس طمانیت میں اس وقت اور بھی اضافہ ہوگیا جب محسود کے ممکنہ جانشینوں کے درمیان اختلافات کی خبریں گردش کرنے لگیں، اگرچہ آخر کار، اس کا نائب حکیم اللہ محسود اس عہدے پر فائز ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس دوران پاکستان نے گل بہادر اور مولوی نذیر کی باغیانہ سرگرمیوں کو بھی نکیل ڈالنے میں کامیابی حاصل کر لی اور یوں فوج کو طویل عرصے کے انتظار کے بعد بالآخر جنوبی وزیرستان میں پیش قدمی کرنے کا موقع مل گیا۔ جیسا کہ سوات میں آپریشن رائٹ پاتھ کے آغاز سے قبل ہوا تھا، مقامی باشندے علاقہ چھوڑ کر فرار ہونے لگے اور یہ تعداد200,000 (دو لاکھ) سے تجاوز کر گئی تھی۔ کاروائی کا آغاز باقاعدہ طور پر17 اکتوبر کو ہوا اور اس کا نتیجہ بھی نجات کی راہ پر گامزن ہونے کی صورت میں نکلا۔ جیسا کہ منصوبہ بندی کی گئی تھی، نجات کا یہ راستہ گل بہادر

اور مولوی نذیر کے علاقوں سے ہو کر گزرتا تھا جس کے باعث فوج محسود کے جہادیوں پر دو محاذوں پر حملہ کرنے کے قابل ہوگئی تھی۔ اس وقت کی اخباری خبروں کے مطابق اس کاروائی کے لئے فوج نے تیس ہزار جوانوں پر مشتمل دستے متعین کر دیئے تھے۔ پہلے دو ہفتوں کے دوران شدید جھڑپیں دیکھنے میں آئیں، مگر جم کر مقابلہ کرنے کی بجائے، جیسا کہ فضل اللہ کے اکثر جہادیوں کا شیوہ تھا، محسود کے جہادیوں نے مقامی علم اور پتھریلے، ناہموار راستوں کا فائدہ اٹھاتے ہوئے فوج کی صفوں میں موجود دراڑوں کے اندر سے نکل کر فرار ہونا شروع کر دیا۔ فوج نے اگرچہ محسود کے علاقے پر خود کو جلد ہی قابض پایا مگر محسود کی فوجوں کو کوئی حقیقی نقصان پہنچائے بغیر۔

کھوئے ہوئے علاقوں کی بازیابی کے حوالے سے ہوسکتا ہے کہ سوات اور جنوبی وزیرستان کے علاقوں میں کامیابی حاصل ہوگئی ہو، مگر اس کے نتائج شہری علاقوں کے لئے ٹھیک نہیں تھے۔ لال مسجد کے واقعے کے ردعمل کے اعادے کے طور پر سنسنی خیزی کے حامل دہشت گرد واقعات میں اضافہ ہونے لگا جن کے ارد گرد چھوٹے چھوٹے ایسے حملے بھی کثرت سے بکھرنے لگے جن کی تعداد اکثر ہفتے میں دو یا اس سے بھی زیادہ ہوتی تھی۔ 27 مئی کو لاہور میں آئی ایس آئی کے علاقائی صدر دفاتر میں زوردار کار بم دھماکہ ہوا جس کے نتیجے میں عمارت کی بیرونی دیوار تڑخ کر رہ گئی اور 27 افراد ہلاک جبکہ 300 سے زائد زخمی ہو کر رہ گئے۔ اس حملے کی ذمہ داری پاکستان طالبان نے یہ کہتے ہوئے قبول کر لی کہ یہ سوات میں فوج کی طرف سے کی جانے والی جارحانہ کاروائی کا ردعمل ہے۔ 9 جون کو بارود سے بھرے ہوئے ایک بڑے ٹرک کو پشاور کا فائیو سٹار پرل کانٹینینٹل ہوٹل سے ٹکرا دیا گیا جس سے عمارت تباہ ہونے کے ساتھ ہی سترہ افراد ہلاک ہوگئے۔ امریکہ اس ہوٹل کو خریدنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا تاکہ اسے صوبہ سرحد کے دارالحکومت میں ایک نئے اور نسبتاً محفوظ تر قونصل خانے کے طور پر استعمال میں لایا جاتا۔ جنوبی وزیرستان میں فوج کی کاروائی کا وقت سر پر آ پہنچنے کے پیشگی اعلان کے طور پر اکتوبر میں حملوں کی شدت میں اور بھی تیزی آ گئی۔ 9 اکتوبر کو پشاور کے مرکز میں ایک پرہجوم بازار کے اندر ہونے والے خوفناک کار بم دھماکے میں 50 سے زائد افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ دہشت گردی کی لہر 15 اکتوبر کو لاہور واپس لوٹ آئی جس کے نتیجے میں تین عدد دہشت گرد ٹیموں نے علیحدہ علیحدہ حملوں میں دو عدد پولیس ٹریننگ مراکز اور وفاقی تحقیقاتی ادارے کے علاقائی صدر دفاتر پر حملہ کر

کے 38 افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔

سب سے خیرہ کن دہشت گرد حملہ فوج کے جنوبی وزیرستان میں داخلے سے محض چند روز قبل 10 اکتوبر کو دیکھنے میں آیا۔ فوجی وردی میں ملبوس دس عدد دہشت گرد بندوقوں سے شعلے اگلتے ہوئے راولپنڈی میں پاک فوج کے صدر دفاتر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے راستے میں کھڑے ہوئے بے شمار راہگیروں کو بھی بھون ڈالا جن میں ایک بریگیڈیئر جنرل بھی شامل تھا۔ اس سے بہت پہلے انہوں نے ایک عمارت کو قبضے میں لے لیا تھا اور وہاں چالیس سے زائد افراد کو یرغمال بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے۔ انہوں نے انہیں تعطل کی ایک ایسی صورتحال کے دوران وہاں قید کئے رکھا جو کہ رات بھر اس وقت تک جاری رہی جب تک کہ کمانڈو فوجی ان پر یکا یک حملہ آور ہونے کے بعد فوراً غالب نہ آ گئے۔ اموات کی شرح کافی زیادہ ہو جاتی اگر ایک خودکش حملہ آور خود کو دھماکے سے اچانک اڑانے میں ناکام نہ ہو جاتا۔ دہشت گرد اس حملے میں ہلاک ہو گئے تھے جب کہ ان کا قائد زندہ بچ گیا تھا۔ اس کا اصل نام محمد عقیل تھا مگر اس نے خود کو ڈاکٹر عثمان کے نام سے مشہور کروا رکھا تھا۔ آرمی کی میڈیکل کور کا ایک سابقہ رکن اور پنجاب کا رہائشی یہ شخص جنوبی وزیرستان پہنچنے سے قبل نہ جانے کتنی شدت پسند دیو بندی تنظیموں میں شامل رہا ہو گا۔ وہاں پہنچ کر اس نے امجد فاروقی بریگیڈ کی تشکیل کر ڈالی جو کہ جیش محمد کے اس جہادی کے نام پر بنائی گئی تھی جو کہ ڈینئیل پرل کے اغواء اور پرویز مشرف کو قتل کرنے کی کوشش کے لئے کی گئی وارداتوں میں شریک رہا تھا۔ ڈاکٹر عثمان پاکستانی حکام کے لئے پہلے ہی جانی پہچانی شخصیت تھی۔ اس کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا تھا کہ مارچ میں سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر ہونے والے حملوں کی منصوبہ بندی کے پس پردہ سب سے اہم ملزم یہی تھا۔

فوج کے صدر دفاتر پر حملے اور ڈاکٹر عثمان کی گرفتاری سے جو چیز پہلے شبے کی زد میں تھی اب واضح ہو کر سامنے آ گئی۔ پنجاب میں ہونے والے بہت سے دہشت گرد حملے پاکستانی طالبان سے وابستہ پشتون نہیں کروا رہے تھے بلکہ ان کے پس پردہ مقامی پنجابی باشندوں کی سرائیکی پٹی سے تھی۔ حتیٰ کہ فوج کے صدر دفاتر پر حملوں سے بھی پہلے اخبارات میں ان جہادیوں کو پنجابی طالبان کا خطاب دے دیا گیا تھا۔ وہ کسی ایسی واحد تنظیم سے تعلق نہیں رکھتے تھے جس کی پہچان کسی ایک نام سے ہوتی ہو۔ ان کی اکثریت اس طرح کی تنظیموں کے سابقہ یا موجودہ ارکان پر مشتمل

تھی، جیسے جیش محمد، لشکر جھنگوی اور سپاہ صحابہ وغیرہ۔ وہ قبائلی علاقوں کے اندر روپوش ہو گئے تھے جہاں انہوں نے پاکستانی طالبان کی صفوں میں شمولیت اختیار کر کے اپنی دہشت گرد صلاحیتوں میں اور بھی نکھار پیدا کر لیا تھا اور پھر واپس اپنے آبائی ٹھکانوں پر پہنچ کر دہشت گرد حملوں کی منصوبہ بندی و عملدر آمد کی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا تھا۔ نہ ہی وہ اس میدان مین اجنبی یا غیر معروف تھے۔ جیسا کہ ہم نے پہلے ملاحظہ کیا ان تنظیموں کے ارکان نے نائین الیون کے اثرات کے طور پر القاعدہ کے ساتھ مل کر مغربی اہداف اور پاکستانی حکومت کے عہدیداروں کے خلاف حملوں کی کاروائیوں میں پہلے بھی حصہ لیا تھا۔ جو چیز تبدیل ہوئی تھی وہ صرف حجم اور خاصیت میں ہونے والی تبدیلی تھی کیونکہ شدت پسند پنجابیوں کی زیادہ سے زیادہ تعداد قبائلی علاقوں کا رخ کر رہی تھی۔

آج کل کے اخبارات میں ڈاکٹر عثمان کے حوالے سے دی جانے والی خبریں اور تبصرے پڑھتے ہوئے بڑی دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔ اس کے بارے میں مختلف ذرائع سے یہی بتایا جاتا ہے کہ اس کا تعلق ماضی میں لشکر جھنگوی، جیشِ محمد اور سابقہ ایچ یو جے آئی رہنما الیاس کشمیری کی تنظیم 313 بریگیڈ سے رہا ہے۔ اس سے بظاہر الجھن یا باوثوق معلومات کے فقدان کی عکاسی ہوتی ہے، مگر پنجابی طالبان کی اصلاح کے بڑھتے ہوئے استعمال سے یہ حقیقت بھی ظاہر ہوتی تھی کہ ان تنظیموں کے مابین ساخت یا بناوٹ کا فرق ختم ہوتا جا رہا تھا اس موضوع پر خاصی معلومات رکھنے والے محکمہ خارجہ کے ایک اعلیٰ عہدیدار نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان میں دہشت گرد کاروائیوں کے لئے بھرتی کا طریق کار کافی حد تک کریگزلسٹ (Craigslist) دہشت گرد کی طرح ہے جس کے مطابق تنظیموں کے قائدین شدت پسند دیوبندی طبقے کے لوگوں سے عام کارکنوں کے ساتھ ہی خصوصی مہارت رکھنے والے افراد کا انتخاب بھی کرتے ہیں۔ تاہم یہ امر واضح نہیں ہے کہ آیا ان میں سے بعض تنظیمیں ابھی تک قائم بھی ہیں یا نہیں۔ جیش محمد کی مثال ہی لے لیں۔ اس کے بہت سے ارکان کئی برسوں سے تنظیم سے الگ ہوتے جا رہے ہیں جن کی اکثریت کو اب بہترین طور پر پنجابی طالبان ہی کہا جا سکتا ہے، تاہم ابھی تک یہ کشمیر میں کاروائیاں جاری رکھے ہوئے ہے۔ پاکستانی حکام اسے مسلسل ایک ملک دشمن تنظیم قرار دیتے چلے آ رہے ہیں اور اس کا بانی اور قائد مسعود اظہر روپوش ہو چکا ہے۔ تاہم اس صورتحال کے باوجود جنوبی پنجاب کے شہر بہاولپور میں اس کا صدر دفتر ابھی بھی نمایاں طور پر موجود چلا آ رہا ہے اور مبینہ طور پر اسے مزید وسیع کیا جا رہا ہے۔

اس کی ایک ممکنہ وجہ تو یہ ہے کہ اگرچہ اس تنظیم میں گزشتہ کئی برسوں سے مسلسل ٹوٹ پھوٹ ہوتی چلی آرہی تھی، تاہم اس کے وفاداروں کا ایک مرکزی گروہ جو کہ ابھی تک پاکستانی حکام کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہے، قائم و دائم ہے۔ جو لوگ اس امر سے یقینی طور پر آگاہ ہیں وہ خاموش ہیں۔ پنجابی طالبان کا یوں یکا یک منظر عام پر آنا جس امر کی عکاسی کرتا ہے وہ یہ ہے کہ پاکستانی طالبان اور پنجاب سے ابھرنے والی مختلف دیو بندی جہادی اور فرقہ ورانہ تنظیموں کے درمیان تنظیمی تفریقیں بتدریج ختم ہوتی جا رہی ہیں۔ وہ تیزی سے ایک دوسری کی طرف جھکاؤ ظاہر کرتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی سطح پر ایسی شکلوں میں منظم ہو رہی ہیں جو پاکستانی ریاست کو راستے سے ہٹا کر اپنی وضع کا غیر لچکدار قسم کا اسلام نافذ کرنے پر تل چکی ہیں۔ ان کا ابھی دور دور تک ایک واحد اور متحدہ قسم کی ملک گیر تنظیم کی شکل اختیار کرنے کا کوئی امکان نظر نہیں آتا۔ اس طرح کی کوئی بھی شخصیت یا تنظیم موجود نظر نہیں آتی جو بہ حیثیت مجموعی کوئی کردار ادا کرنے کے قابل ہو، مگر رجحان یقیناً اشتراک عمل میں اضافے اور مقصد کی واحدانیت کی طرف ہی نظر آتا ہے۔ ایک ریٹائرڈ اعلیٰ فوجی افسر نے جو کہ پاکستانی حکومت میں چند انتہائی اہم عہدوں پر بھی فائز رہ چکا ہے، مجھے بتایا تھا کہ یہ رجحان پاکستان کے پائیدار استحکام کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہے۔ اس نے ان خیالات کا اظہار 2010 کی گرمیوں میں اس وقت کیا تھا جب فوج کو جنوبی وزیرستان سے، جہاں کہ دہشت گردوں کی تربیت کے زیادہ تر مراکز قائم ہو چکے تھے، محسود کے جہادیوں کو نکالے ہوئے آٹھ ماہ سے زیادہ عرصہ گزر چکا تھا۔ مگر ان آٹھ مہینوں کے دوران دہشت گرد حملوں کے تسلسل یا شدت میں بہت کم یا کوئی بھی تخفیف نہیں دیکھی گئی تھی، نہ تو خیبر پختونخواہ میں، جیسا کہ اپریل میں صوبہ سرحد کا نام تبدیل کر کے یہ نام رکھ دیا گیا تھا اور جہاں تحریک طالبان کے ارکان وارداتوں میں ممکنہ طور پر ملوث تھے، اور نہ ہی پنجاب میں جہاں پنجابی طالبان کا تسلط تھا۔

اکتوبر 2009 کے اواخر کے میں پشاور شہر کے مرکزی حصے میں واقع ایک پرہجوم بازار میں ہونے والے کار بم دھماکے میں ایک سو سے زائد افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ نومبر کے اوائل میں ایک خودکش بمبار نے راولپنڈی میں ایک بینک کے باہر جہاں پر کہ فوج کے خصوصی ملازمین کے علاوہ فوج کے سویلین ملازمین بھی اپنی تنخواہوں کے چیک بھنا رہے تھے، خود کو دھماکے سے اڑا دیا اور اس کے نتیجے میں پینتیس افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ ایک ماہ بعد ہی اس وقت چالیس افراد بشمول

ایک میجر جنرل اور سولہ بچوں کے ہلاک ہو گئے جب ایک اور خودکش بمبار نے روال پنڈی کی اس مسجد پر حملہ کر دیا تھا جہاں زیادہ تر فوجیوں کے اہل خانہ نماز پڑھتے تھے۔ ایک مارا جانے والا بچہ پشاور کے کور کمانڈر کا بیٹا تھا۔ جنوری 2010 میں صوبہ سرحد میں والی بال کے ایک میچ کے دوران اس وقت سو سے زائد افراد ہلاک ہو گئے تھے جب ایک خودکش بمبار نے دھماکہ خیز مواد سے بھری اپنی ایس یو وی گاڑی ہجوم کے اندر گھسا دی۔ اس واقع کے بعد بھی کئی ماہ تک اس طرح کے حملے جاری وساری رہے، ایک کے بعد دوسرے ہفتے وارداتوں کا سلسلہ جاری رہا جس کے بظاہر کوئی اختتام نظر نہیں آتا تھا۔ 2010 کے دوران پاکستان میں چالیس سے زائد دہشت گرد حملے کئے گئے تھے جن میں ہر ایک میں 5 یا اس سے زائد افراد ہلاک ہوتے رہے۔ اگرچہ لال مسجد کے سانحے کے بعد اہداف کے خلاف حملوں میں ڈرامائی طور پر ہونے والے اضافے کے مقابلے میں بہت کم، مگر اس کے باوجود بھی خالصتاً فرقہ ورانہ حملوں کا سلسلہ خصوصاً شیعوں کے خلاف جاری وساری رہا۔ شیعوں کی طرف سے یوم عاشورہ کے جلوسوں کو تو خاص طور پر نشانہ بنایا جاتا رہا۔ دسمبر 2009 کے اواخر میں کراچی کے اندر عاشورہ کے ایک جلوس پر حملے کے دوران تو چالیس سے زائد شیعہ ہلاک ہو گئے تھے، جو کہ اس دن پیش آنے والے بے شمار سانحات میں سے ایک سانحہ تھا۔ چار ماہ بعد قبائلی علاقوں میں ہونے والی جنگ سے بھاگ کر آنے والے چالیس سے زائد شیعہ افراد کو صوبہ سرحد کے شہر کوہاٹ میں واقع پناہ گزین مرکز میں خودکش بمباروں نے حملہ کر کے ہلاک کر دیا۔ ایک عشرہ قبل جہادیوں اور فرقہ ورانہ فسادات میں ملوث افراد/ تنظیموں کے درمیان واضح فرق موجود تھا۔ تاہم جیسے جیسے شدت پسند دیو بندی ریاست کے خلاف اٹھ کھڑے ہوتے گئے، اور پنجابی طالبان کی شکل میں مستحکم ہونے لگے تو یہ فرق بھی مٹتا چلا گیا۔ وہی تنظیمیں اور افراد اب سیکولر اور فرقہ ورانہ دونوں اہداف کو نشانہ بنانے لگے تھے۔

مئی 2010 کے اواخر میں شدت پسند مسلح دیو بندی اپنے روایتی شیعہ اہداف سے آگے بڑھ کر متنازعہ احمدی فرقے کو بھی نشانہ بنانے لگے۔ انہوں نے لاہور میں عبادت گزاروں سے بھری ہوئی احمدیوں کی دو مساجد پر حملہ کر کے اَسّی سے زائد افراد کو ہلاک کر دیا تھا۔ تین روز بعد انہوں نے ایک ہسپتال پر جہاں بہت سے زندہ بچ والے زخمیوں کا علاج کیا جا رہا تھا، حملہ کر کے پانچ مزید افراد کو موت کے گھاٹ اتار دیا۔ ایک اور تباہ کن حملہ صرف ایک ماہ سے کچھ عرصہ اوپر یکم

جولائی کو اس وقت دیکھنے میں آیا جب دو خودکش بمباروں نے خود کو لاہور میں زائرین سے بھرے داتا دربار کے اندر دھماکے سے اڑا کر رکھ دیا۔ اس حملے میں 50 افراد ہلاک اور 200 زخمی ہو گئے تھے۔ یہ مزار جو کہ مشہور صوفی بزرگ داتا گنج بخشؒ کے نام سے منسوب ہے، لاہور کا سب سے بڑا مزار ہے۔ یہ شدت پسند دیوبندیوں کا بریلوی اہداف کے خلاف پہلا بڑا حملہ نہیں تھا۔ اس سے قبل کراچی میں اپریل 2006 میں حضرت محمد مصطفیٰ ؐ کے یوم پیدائش پر بریلویوں کی طرف سے نکالے گئے عید میلاد النبیؐ کے ایک بہت بڑے جلوس پر حملے کے نتیجے میں ستاون افراد ہلاک ہو گئے تھے۔ بعدازاں اس وقت ایک الگ تھلگ واقعے کی حیثیت رکھنے والے حملے کی ذمہ داری لشکر جھنگوی پر ڈال دی گئی تھی۔ نہ ہی یہ کسی صوفی بزرگ کے مزار کو حملے کا نشانہ بنایا تھا۔ مگر یہ حملہ رات کے وقت اس وقت کیا گیا تھا جب وہاں کوئی بھی موجود نہیں تھا اور یہ بھی ایک طرح سے الگ تھلگ قسم کا واقعہ ہی ثابت ہوا۔ مگر داتا دربار پر ہونے والا حملہ زائرین کے ہجوم سے پر کسی صوفی بزرگ کے مزار پر ہونے والا نہ صرف اپنی نوعیت کا پہلا حملہ بلکہ ایک رجحان کا آغاز بھی تھا۔ اکتوبر کے اوائل میں کراچی میں ایک صوفی بزرگ کے مزار کو نشانہ بنایا گیا جس میں نو افراد ہلاک ہو گئے۔ اس کی ذمہ داری پاکستانی طالبان نے قبول کر لی تھی۔ اس کے بعد اگلا ہدف پنجاب میں پاکپتن کے علاقے میں مشہور صوفی بزرگ بابا فرید شکر گنج کا مزار تھا جہاں ایک ماہ بعد بم دھماکے میں سات افراد جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس کے بعد ایک اور صوفی مزار کو لاہور میں فروری 2011 میں ہدف بنایا گیا تھا۔ اسی طرح اپریل کے شروع میں جنوبی پنجاب کے شہر ڈیرہ غازی خان میں مشہور بزرگ سخی سرور کے عرس کی تقریبات کے دوران ہونے والے ایک خودکش حملے میں 50 زائرین لقمہ اجل بن گئے تھے۔ ان حملوں نے پاکستان میں فرقہ ورانہ فسادات کو نئی اور زیادہ خطرناک بلندیوں کی سمت گامزن ہونے کے خطرے سے دوچار کر دیا تھا۔ اگرچہ ہو سکتا ہے شدت پسند دیوبندیوں کو اپنے اکثریتی پاکستانی بھائیوں کی مذہبی روایات سے اختلاف ہو، مگر اس سے قبل انہوں نے خود کو کھلے عام لڑائی سے باز رکھا ہوا تھا۔ داتا دربار کا حملہ اس امر کی جانب اشارہ کر رہا تھا کہ اب وہ کسی بھی ایسی تنظیم یا ادارے، سرکاری یا غیر سرکاری، سیکولر یا فرقہ ورانہ، سنی یا شیعہ کے خلاف ہتھیار اٹھانے پر تیار ہو چکے تھے جسے ان کے مخصوص جہادی اور شدت پسند قسم کے اسلام سے اختلاف تھا۔

اور اسی طرح خود بریلوی طبقے کے اندر بھی سیاست بازی کے بڑھتے ہوئے رجحان کی

علامات باعث تشویش تھیں۔ بریلوی مذہبی تنظیمیں 2010 میں زرداری حکومت کی جانب سے توہین رسالتؐ یا مذہبی جذبات کی بے حرمتی کے حوالے سے موجود قوانین میں ترامیم کے خلاف مظاہروں میں پیش پیش تھیں۔ جنوری 2011 کے اوائل میں پنجاب کے گورنر اور ان ترامیم کے حق میں سرگرم شخصیت سلمان تاثیر کو اس کی حفاظت پر مامور ایلیٹ پولیس کے ایک بریلوی رکن نے گولیاں مار کر ہلاک کر دیا تھا۔ جس نے بعد میں یہ اعتراف کر لیا تھا کہ اس نے یہ سب کچھ مذہبی جذبات کے تحت کیا تھا۔ پاکستان کی سب سے بڑی بریلوی تنظیم، جماعت اہلسنت نے بعد ازاں اس حملے کی ستائش کرتے ہوئے مسلمانوں کو اس کے جنازے میں شرکت کرنے سے باز رہنے کی تلقین کر دی تھی۔

پنجاب میں دہشت گردی کی بظاہر نہ ختم ہونے والی لہر نے جاگیردار سیاسی طبقے کے اندر شدید بے چینی پیدا کر دی۔ پہلے پہل نہ تو زرداری حکومت اور نہ ہی حزب مخالف کی جماعت پی ایم ایل۔ن کی سربراہی میں بننے والی پنجاب حکومت اس حقیقت کو تسلیم کرنے پر آمادہ تھی کہ دہشت گردی کی زیادہ تر وارداتیں مقامی پنجابی باشندوں کی طرف سے سرانجام دی جا رہی تھیں۔ ان کی ہچکچاہٹ قابل فہم تھی۔ اگر وہ مسئلے کا اعتراف کر لیتے تو ان پر اس کے حل کے لئے دباؤ بڑھ جانا تھا۔ یہ ظاہر کرنا یا اس طرح کا تاثر دینا آسان تھا کہ ملک کے اندر جاری دہشت گردی کی لہر کے پس پردہ قبائلی علاقوں میں سرگرم تحریک طالبان کا ہاتھ تھا۔ اور اس حوالے سے کچھ نہ کچھ پہلے ہی سے کیا جا رہا تھا۔ زرداری حکومت نے آخر کار جون کے آغاز میں احمدیوں پر ہونے والے اس حملے کے بعد خاموشی توڑ دی تھی جب وزیر داخلہ نے اس امر کا اعتراف کر لیا کہ جنوبی پنجاب میں جڑیں رکھنے والی دہشت گرد تنظیمیں بہت مضبوط ہو چکی ہیں اور ریاست کی بقاء کے لئے شدید خطرے کا باعث ہیں۔ اس کی طرف سے نکتہ نظر میں یوں یکایک تبدیلی کے بعد مارچ میں پنجاب کے وزیر اعلیٰ اور نواز شریف کے چھوٹے بھائی شہباز شریف نے بھی ایک متنازعہ بیان جاری کر دیا۔ اس نے دہشت گردوں پر زور دیتے ہوئے کہا تھا کہ وہ پنجاب کو نشانہ بنانا چھوڑ دیں کیونکہ صوبے میں اس وقت برسر اقتدار پاکستان مسلم لیگ (ن) پرویز مشرف اور اس کے امریکہ کے ساتھ اتحاد کی مخالفت میں ان کے ساتھ نظریاتی اشتراک رکھتی ہے۔ مسئلے کا اعتراف کر لینے کے بعد زرداری حکومت نے اس امر کا عندیہ دے دیا تھا کہ وہ سرائیکی پٹی کے علاقے میں فوج بھجوا سکتی

ہے، مگر بعدازاں اس تجویز پر عملدرآمد کرنے سے باز رہی۔ آخر فوج بھی ان تنظیموں کے خلاف کیا کرسکتی تھی جو خفیہ انداز میں زیرزمین کام کر رہی ہوں۔ پنجابی طالبان کو ان کے اپنے ہی علاقے سے نکال باہر کرنے یا شکست دینے کے لئے جاسوسی کے ایک اچھے نظام کے ساتھ ہی متحرک اور فعال پولیس کی ضرورت بھی تھی اور ان دونوں چیزوں کا بھی فقدان تھا۔ اس صورتحال سے باخبر فوج کے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار نے مجھے بتایا تھا کہ آئی ایس آئی کے زیادہ تر وسائل سے قبائلی علاقوں میں استفادہ کیا جا رہا تھا۔ اور ان کے پاس اتنی وافر گنجائش موجود نہیں تھی کہ باقی علاقوں کو بھی مستفید کیا جا سکے۔ نہ ہی شدت پسند نظریات کا پرچار کرنے والی ان مساجد یا مدارس کے خلاف کارروائی کے حوالے سے کسی قسم کا سنجیدہ بحث مباحثہ کیا جا رہا تھا جہاں سے پنجابی طالبان کو افرادی قوت فراہم کی جا رہی تھی، حالانکہ ان کی صفوں میں بھرتی ہر سال بڑھتی چلی جا رہی تھی۔ زرداری حکومت نے دو برس قبل ان کے خلاف اقدامات کرنے کا اعلان کیا تھا مگر اس پر کبھی عملدرآمد نہیں کیا گیا۔

جیسا کہ میں نے بعدازاں کافی عرصہ بعد ان واقعات کا دوبارہ جائزہ لیا تو مجھے طارق عزیز سے کی گئی دس برس قبل کی اس وقت کی گفتگو یاد آنے لگی جب وہ پرویز مشرف کا سب سے بڑا سویلین مشیر ہوا کرتا تھا۔ میں نے اس سے سوال کیا تھا کہ حکومت ان شدت پسند مذہبی تنظیموں کے خلاف کارروائی کرنے سے کیوں ہچکچا رہی تھی جو حتیٰ کہ خود ریاست کیلئے بھی ایک بہت بڑا مسئلہ بنے ہوئے تھے۔ اس نے مجھے بتایا کہ خدشہ پایا جاتا ہے کہ پاکستان کہیں ایک اور الجیریا بن کر نہ رہ جائے۔ اس کا اشارہ قتل و غارت سے بھرپور دہشت گردی کی اس لہر اور دوسرے ایسے حملوں کی طرف تھا جو گزشتہ عشرے کے دوران شمالی افریقہ کے اس ملک کے انتہاء پسندوں کی طرف سے کئے گئے تھے اور جن میں ہزاروں سے زیادہ لوگ اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ میری طارق عزیز سے ہونے والی اس گفتگو کے دس برس بعد بھی پاکستان نے ابھی تک پنجاب کے مرکز میں موجود شدت پسندوں کے ماخذ کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی۔ تاہم، اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ پاکستان ایک اور الجیریا بن چکا ہے۔

ملکی سطح مسلسل جاری دہشت گردی کی لہر، خصوصاً خیبر پختونخواہ میں، اس امر کی عکاسی کرتی تھی کہ پاکستانی طالبان ابھی تک مکمل شکست سے دوچار نہیں ہوئے۔ حکیم اللہ محسود کے بہت

سارے جہادی، دہشت گردی کی تربیت حاصل کرنے کے بعد اپنی ماہرانہ صلاحیتوں سمیت کہیں روپوش ہو چکے تھے۔ ان کی ایک منزل شمال میں اورکزئی قبائلی علاقہ تھا، جہاں پہلے حکیم اللہ محسود کا آبائی ٹھکانہ ہوا کرتا تھا۔ لگتا تھا فوج قریب سے ہی ان پر نظر رکھے ہوئے تھی کیونکہ 2010 کے اوائل سے ہی پاکستانی اخبارات اورکزئی میں جہادیوں کی لاشوں کی گنتی کی خبروں سے پر ہوتے جا رہے تھے اور یہ تعداد اس سے قبل جنوبی وزیرستان میں ہونے والی لڑائی کے نتیجے میں سامنے آنے والی ہلاکتوں سے بہت زیادہ نظر آتی تھی۔ یہ لڑائی پھیل کر ساتھ متصل کرم اور خیبر ایجنسی کے علاقوں تک پہنچ چکی تھی۔ اگرچہ فوج نے جون میں اورکزئی کے علاقے میں ہونے والی جنگ میں فتح حاصل کرنے کا اعلان کر دیا تھا، مگر مقامی باشندوں کا اصرار تھا کہ ابھی بھی بعض علاقوں میں علیحدہ علیحدہ گروہوں کی صورت میں مزاحمت جاری ہے۔ ان کی اس بات میں وزن نظر آتا تھا کیونکہ باقی حصے میں بھی فوج کے خلاف اس علاقے میں مہلک حملے جاری رہے تھے۔ 2011 کے اوائل میں آنے والی نئی خبروں کے مطابق فوج شمال کی طرف اور بھی فاصلے پر واقع مہمند قبائلی علاقے میں ایک بہت بڑے جارحانہ حملے میں مصروف تھی۔

ایک قبائلی علاقہ جو کافی حد تک اس صورتحال سے بچا ہوا نظر آتا تھا وہ شمالی وزیرستان کا علاقہ تھا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ جنوبی وزیرستان سے فرار ہونے والے محسود کے جہادی وہاں جانے سے گریز کر رہے تھے۔ اس امر کا ثبوت موجود تھا کہ حافظ گل بہادر نے انہیں محفوظ پناہ گاہ فراہم کر دی تھی باوجود اس حقیقت کے کہ اس نے قبل ازیں پاکستانی حکومت سے وعدہ کیا تھا کہ وہ ایسا نہیں کرے گا۔ اس کے محرکات ابھی تک واضح نہیں ہوئے، مگر یہ ممکن ہے کہ اسے پختونوں کی اس روایت کے تحت انہیں واپس بھیجنا اچھا نہ لگا ہو جس کے مطابق دشمنوں کو بھی پناہ دینے سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ فوج شمالی وزیرستان میں کارروائی کرنے سے اس لئے گھبرا رہی تھی کہ کیونکہ وہ نہ تو گل بہادر کے ساتھ اور نہ ہی حقانی نیٹ ورک کے ساتھ کسی قسم کی محاذ آرائی کا خطرہ مول لینا چاہتی تھی جو دونوں ایک ہی علاقے پر تسلط جمائے ہوئے تھے۔ یہ واضح طور پر امریکہ کا حالات کے حوالے سے اپنا ہی تجزیہ تھا۔ اگرچہ اس نے سوات اور جنوبی وزیرستان میں پاکستان کی طرف سے کی گئی کارروائیوں پر اس کی ستائش کی تھی، مگر حقانی نیٹ ورک کے خلاف کسی قسم کی پیش قدمی نہ کرنے پر اسے شدید تنقید کا نشانہ بھی بنا ڈالا تھا۔ امریکہ کی پریشانیوں کا بنیادی محرک اس خطے میں

اس کے اپنے کلیدی مفادات تھے۔ حقانی نیٹ ورک مشرقی افغانستان میں امریکہ کے خلاف برسرپیکار اہم افغان طالبان طاقت تھی۔ علاقے میں امریکہ کی کامیابی کا درومدار اس طاقت کو غیر موثر کر کے رکھ دینے پر تھا۔ اس لئے یہ کوئی حیرتناک امر نہیں تھا کہ امریکہ نہ صرف پاکستان کے ساتھ اس لئے ناراض تھا کہ وہ حقانی نیٹ ورک کے خلاف کسی طرح کی کاروائی سے ہچکچا رہا تھا بلکہ اس لئے بھی کہ الٹا وہ ان کی مدد کرنے اور حتیٰ کہ شراکت عمل کرنے پر بھی آمادہ تھا۔ اس پر دباؤ بڑھانے اور اس کے ساتھ ہی پاکستان کے راستے محدود تر کر دینے کی کوشش میں امریکہ نے حقانی نیٹ ورک کو بھی دہشت گرد تنظیموں کی اپنی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ 2010 کی گرمیوں تک حقانی نیٹ ورک کے لئے پاکستانی حمایت وتعاون امریکہ۔ پاکستان تعلقات کا ایک انتہائی متنازعہ مسئلہ بن چکا تھا۔

شمالی وزیرستان میں صورتحال سے نمٹنے کے لئے پاکستان نے ذرا مختلف حکمت عملی اختیار کی تھی۔ فوج کی اعلیٰ قیادت سے قریبی تعلقات رکھنے والے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستانی فوج کو درپیش بنیادی مسئلہ صلاحیت یا گنجائش کا مسئلہ تھا۔ اس نے خطے میں رسمی فوج کی پہلے ہی اچھی خاصی تعداد روانہ کر دی تھی اور اب مزید فوج بھیجنے کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی تھی۔ میں نے پاکستانی فوج کے ایک اعلیٰ عہدیدار سے، جس نے اپنا نام پوشیدہ رکھنے کی درخواست کی تھی، سنا تھا کہ 2010 کی بہار تک قبائلی علاقوں اور سوات میں متعین فوجی جوانوں کی کل تعداد تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہو چکی تھی۔ ان میں سے نوے ہزار باقاعدہ فوجی تھے جن کا تقرر اٹھاسی بٹالینوں میں کیا گیا تھا جو کہ نو ڈویژنوں کے برابر تھے۔ باقی فرنٹیئر کور کے جوان تھے۔ اس کے برعکس معمول کے زمانے میں فوج کا ادارہ پشاور کے صدر دفتر کی حدود میں آنے والے علاقے میں بھی صرف دو ڈویژن فوج رکھتا ہے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پاکستان نے علاقے میں 7 اضافی فوجی ڈویژنوں کے مساوی فوج روانہ کر دی تھی۔ اس طرح کل مخصوص کی جانے والی فوج رسمی پاکستانی فوج کے پورے یونٹوں کے تقریباً ایک تہائی کے مساوی تھی۔ مجھے اس وقت کافی تعجب ہوا جب میں نے اس تعداد کے بارے میں میں پہلی مرتبہ سنا۔ اس امر کی ایک اہم وجہ کہ قبائلی علاقوں اور سوات میں پاکستانی فوج کی گزشتہ یورشیں کیوں ناکام ہو گئی تھیں یہ تھی کہ پاکستان بھارتی سرحد پر متعین اپنی فوجیں ہٹانے پر تیار نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ ایسی کونسی

تبدیلی آ گئی تھی؟ میں نے اپنے شناسا سابقہ اعلیٰ فوجی افسر سے یہی سوال کیا۔ اس نے بتایا کہ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے۔ حکومتِ پاکستان اس نتیجے پر پہنچ گئی ہے کہ پاکستانی طالبان کا خطرہ اس قدر شدت اختیار کر چکا ہے کہ اس کے سوا اور کوئی راستہ نہیں رہا تھا۔

یہ نکتہ قابل غور ہے کہ 2009 کے موسم بہار کے وقت سے قبائلی علاقوں اور سوات میں داخل ہونے والی پاکستانی فوجیوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی جتنی کہ اس وقت پورے افغانستان میں امریکی فوجیوں کی تھی۔ وہاں متعین امریکی فوجیوں کی تعداد اس سے زیادہ تھی اگست 2010 تک اوبامہ کی طرف سے تعداد میں مزید اضافے سے قبل ایک لاکھ تک بھی نہیں پہنچی تھی۔ اس کے باوجود متذکرہ بالا سابقہ افسر اعلیٰ بظاہر اس امر پر حقیقتاً پریشان نظر آتا تھا کہ پاکستانی طالبان کے پاس قبائلی علاقوں اور سوات سے پاکستانی طالبان کے خطرے سے نمٹنے کے لئے مناسب تعداد میں فوج دستیاب نہیں ہے۔

فوج نے سوات اور شمالی وزیرستان سے پاکستانی طالبان کو نکال باہر کرنے میں تو کامیابی حاصل کر لی تھی، مگر اسے اس حوالے سے ذرا بھی اعتماد نہیں تھا کہ فوج ان جہادیوں کو شکست دے سکتی ہے جو اگر فرار ہونے میں تو کامیاب ہو گئے تھے مگر اس علاقے پر ابھی تک تسلط جمائے ہوئے تھے جو فوج کے زیر انتظام آ چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ فوج کو سویلین سیکیورٹی اداروں میں تعطل کی کیفیت ختم کرنے کی صلاحیت کے فقدان کے باعث سخت بیزاری محسوس ہوتی تھی، مگر اسے اس مسئلے کے حل کا بھی کوئی واضح ادراک نہیں تھا۔ اگرچہ ہم نے شمالی وزیرستان میں کاروائی کے امکان کے حوالے سے براہ راست کوئی تبادلہ خیال نہیں کیا تھا۔ تاہم اس کا پیغام بالکل واضح تھا۔ اگر فوج شمالی وزیرستان میں داخل ہو گئی تو باقی علاقوں پر سے اس کی گرفت کمزور پڑ جانے کا خطرہ تھا جبکہ اس کے ساتھ ہی حقانی نیٹ ورک اور گل بہادر جیسے طاقتور گروہوں کی صورت میں نئی دشمنیاں بھی سامنے آ جائیں گی۔ وہ، صاف ظاہر ہے کہ علاقے میں اور بھی زیادہ فوجیں بھجوا سکتی تھی۔ مگر کتنی فوج کافی رہتی؟ کیا آدھی فوج؟ دو تہائی؟ فوج اندازہ ہی نہیں لگانا چاہتی تھی۔ اس نے اپنی بھارتی سرحد سے پہلے ہی اس سے کہیں زیادہ فوجیں ہٹالی تھیں جتنی کہ اس کے خیال میں مناسب رہتیں۔

اس کے علاوہ صورتحال کے اور بھی پہلو تھے۔ افغانستان میں پاکستان کے مقاصد

امریکہ سے بہت ہی مختلف نظر آتے تھے۔ جیسا کہ ہم نے ملاحظہ کیا ہے، گزشتہ عشرے کے زیادہ تر حصے میں پاکستان نے افغان طالبان کو افغانستان میں اس خطرے کے خلاف ایک تحفظ کے طور پر دیکھا تھا جو اس کے خیال میں امریکہ کے وہاں سے نکل جانے کی صورت میں اسے بھارت کے غلبے کی صورت میں درپیش رہتا۔ یہ انداز فکر اس سے مختلف نہیں تھا جس کا اظہار بھارت کے ساتھ امن مذاکرات کے دوران لشکر طیبہ کے حوالے سے کیا گیا تھا، یعنی مذاکرات کی ناکامی کے خطرے کے خلاف ایک آڑ۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوسکتا تھا کہ پاکستان نے شدت پسند اسلامی قوتوں کے حوالے سے ہونے والے اپنے تجربے سے کچھ بھی نہیں سیکھا تھا۔ مگر یہ مکمل سچ نہیں تھا۔ اس پر یہ حقیقت نائین الیون سے بھی قبل واشگاف ہونا شروع ہوگئی تھی کہ وہ افغان طالبان کو مکمل طور پر اپنے تابع نہیں رکھ سکتا تھا۔ نائین الیون کے بعد کے برسوں میں اس کے پاکستانی طالبان کے ساتھ تجربے اور ملک کے اندر دہشت گردی کی لہر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی مشکلات اور تکالیف نے یہ واضح کر دیا تھا کہ اس طرح طاقتیں کتنی خطرناک ثابت ہوسکتی ہیں۔ 2010 کے آغاز تک فوج نے میدان جنگ میں تقریباً نو ہزار فوجی کھو دیئے تھے اور جنگی علاقے کی حدود سے باہر دہشت گردی کا بنیادی شکار بھی یہ خود تھی۔ نہ ہی آئی ایس آئی کو استثنٰی حاصل تھا۔ لال مسجد کے سانحے کے وقت سے دہشت گرد حملوں میں آئی ایس آئی کے 73 افسران جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ متذکرہ بالا افسر نے جس کے تبصروں کا میں نے اوپر حوالہ دیا ہے، مجھے بتایا تھا کہ فوج کو یہ تکلیف دہ احساس ہو چکا تھا کہ یہ شدت پسندوں کی فطرت تھی کہ ان کو بزور طاقت روک نہ دیا جائے۔ اس نے اصرار کرتے ہوئے کہا کہ پاکستان افغان طالبان کو اب کسی طرح بھی افغانستان میں اپنے مسائل کا بہترین حل نہیں سمجھتا تھا۔ ایک سابقہ اعلیٰ پاکستانی سفارت کار نے بھی جو اکثر فوج کے خیالات کی عکاسی کرتا ہے، بالکل یہی نکتہ پیش کیا۔ مگر پاکستان کو حقیقت کا سامنا بھی کرنا تھا۔

2009 کے اواخر میں اوباما انتظامیہ نے افغانستان میں 30,000 اضافی فوجیں بھجوانے کا فیصلہ کیا اور اس طرح وہاں متعین کل فوجیوں کی تعداد ایک لاکھ تک پہنچ گئی۔ اب امید تھی کہ اضافی فوج بھجوانے کے بعد جنگ کا نقشہ بدل جائے گا اور اس طرح امریکی افواج کی واپسی کا عمل شروع ہونے تک

*سابق وائس چانسلر، جامعہ ملیہ دہلی

افغان فوج اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو جائے گی۔ امریکہ افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کرنے کے خلاف نہیں تھا مگر وہ یہ مذاکرات ایک مضبوط فریق کی حیثیت سے کرنا چاہتا تھا۔ تاہم متعین فوجیوں کی تعداد میں اضافے کا اعلان کرنے کے ساتھ ہی انتظامیہ نے اس اضافے کی تکمیل کے محض گیارہ ماہ بعد جولائی 2011 کی تاریخ بھی قرار دے دیا۔ یہ فیصلہ مبینہ طور پر اس عوامی تنقید سے بچنے کے لئے کیا گیا تھا کہ امریکہ ایک اور ایسی طویل جنگ میں شکست خوردہ ہو رہا تھا جس میں اسے فتح ہو سکتی تھی۔ پاکستان نے اس پر ایک محتاط ردعمل ظاہر کیا تھا، مگر افواج کی واپسی کے لئے بہت قریبی تاریخ دینے کا مطلب ان کے نزدیک بہت کچھ تھا۔ قبائلی علاقوں کے اس پار کئی برس تک پاکستانی طالبان کا پیچھا کرنے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ اس کے لئے ابھی کئی برسوں تک مسلسل کوشش درکار ہوگی، اور غالباً اس سے بھی زیادہ تعداد میں فوجیں بھی تا کہ امریکہ افغان طالبان کے خلاف فیصلہ کن اقدام کر کے جنگ کا پانسہ پلٹ سکے۔ یہ کام 12 ماہ میں نہیں ہونے لگا تھا۔ نہ ہی انہیں یہ یقین تھا کہ افغان فوج تعطل ختم کرنے یا کمی پوری کرنے کے قابل ہو سکے گی۔ میں نے 2010 کے موسم بہار میں پاکستانی فوج کے ایک بہت اعلیٰ عہدیدار کو اس تجویز یا نظریئے کی تضحیک کرتے دیکھا۔ افغان فوج پر براہ راست تنقید سے اجتناب کرتے ہوئے، اس نے محض یہی کہا کہ نئے بھرتی ہونے والے جوان کی تربیت میں افواج پاکستان کو صرف چھ ماہ لگتے ہیں مگر ایک اعلیٰ فوجی افسر کی شخصیت کی تعمیر و تشکیل میں 30 برس صرف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بیان کا اصل مفہوم بالکل واضح تھا۔ افغان فوج کی قیادت اتنی اہل نہیں تھی کہ وہ امریکی فوجوں کی واپسی کے بعد افغان طالبان کا برابری کی سطح پر مقابلہ کر سکے۔

اس ساری صورتحال سے پاکستان نے یہی نتیجہ اخذ کیا تھا کہ افغان طالبان کو شکست نہیں دی جا سکتی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی اپنی پالیسیاں بھی اس طرح کی صورتحال کی مساوی طور پر ذمہ دار تھیں جو کہ اس خوف کی عکاسی کرتی تھیں کہ کابل میں کہیں بھارت کا تسلط قائم نہ ہو جائے کیونکہ اس کا کوئی بہتر متبادل موجود نہیں تھا۔ تاہم 2010 کے موسم گرما تک اس نے افغانستان کا حل مذاکرات کے ذریعے نکالنے کے حوالے سے دلچسپی کی ابتدائی علامات ظاہر کر دی تھیں۔ یہ غالباً اس کی اس خواہش کی عکاسی کرتی تھی کہ امریکہ کی طرف سے فوجی دستوں کی تعداد میں اضافہ اگر ان کی توقع سے زیادہ موثر ثابت ہو جائے تو ان کے مفادات محفوظ رہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وقت

کے زیاں کی ایک چال ہو، جس کا مقصد یہ تاثر دینا ہو کہ آگے کی سمت پیش رفت ہو رہی ہے جبکہ درحقیقت کوئی با معنی سرگرمی نہ ہو رہی ہو۔ تاہم یہ اس خواہش کی عکاسی بھی ہو سکتی تھی کہ اگر امریکہ افواج افغانستان چھوڑ کر چلی جاتی ہیں تو ایسی صورت میں افغان طالبان کے اثر ورسوخ کو محدود تر کر کے رکھ دینے کی کوشش کی جائے۔ کابل میں طالبان کے قدم مضبوط ہونے کی صورت میں افغان طالبان کے اثر ورسوخ کو محدود تر کر کے رکھ دینے کی کوشش کی جائے۔ کابل میں طالبان کے قدم مضبوط ہونے کی صورت میں بھارت کو یاد رکھنے میں مدد ملنے کے ساتھ ہی پاکستان کو بھی ایک ایسی افغان حکومت سے نمٹنے کے جھنجھٹ سے نجات مل جائے گی جو صرف شدت پسند ملاؤں پر مشتمل ہو۔ اسے پہلے بھی اس کا تجربہ ہو چکا تھا اور اس کا نتیجہ سیدھا نائین الیون کے واقعے کی صورت میں برآمد ہوا تھا۔ اس ساری جدوجہد میں ان کا غیر امکانی حلیف حامد کرزئی تھا جس نے افغانستان میں امریکہ کے قیام کی سکت کے حوالے سے اس وقت تک بالکل یہی نتائج اخذ کیے تھے۔ دونوں فریق اس حق میں تھے کہ کم سے کم افغان طالبان کے کچھ نہ کچھ نمائندوں سے ضرور مذاکرات کیے جائیں۔

پاکستان کے نزدیک اس کا مطلب اول و آخر حقانی نیٹ ورک کے نمائندگان ہی تھے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں آئی ایس آئی اور حقانی نیٹ ورک کے بانی جلال الدین کے مابین سوویت مخالف جہاد کے زمانے سے ہی روابط چلے آرہے ہیں۔ وہ ایک مجاہد کا پس منظر رکھتا تھا اور کوئی سخت جان طالبان نہیں تھا اور تحریک میں 1995 میں صرف اس وقت شامل ہوا تھا جب وہ کابل کے دروازوں پر پہنچ چکے تھے۔ ائی ایس آئی نے نائن الیون کے بعد کی صورت حال کے نتیجے میں حقانی کی طرف سے شمالی وزیرستان کی طرف پسپائی کے بعد بھی اس سے تعلقات جاری رکھے ہوئے تھے۔ یہ علاقہ ان کا جانا پہچانا تھا کیونکہ جلال الدین نے سوویت مخالف جہاد کے دوران یہاں سے کاروائیاں کرنے کے لئے اسے اپنے پاکستانی گڑھ کے طور پر استعمال کیا تھا۔ مگر وہ اب بستر کے ساتھ ہی لگتا جا رہا تھا اور اس نے اپنے نیٹ ورک کی سرپرستی بھی اپنے سب سے بڑے بیٹے سراج الدین کے حوالے کر دی تھی جو کہ طالبان کے ساتھ زیادہ مماثلت رکھتا تھا۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا نوجوان حقانی خطے میں پاکستانی مفادات کا بہت زبردست حمایتی تھا جس نے کہ محسود قبائل کے افراد کے علاوہ دیگر کو بھی اس امر کا قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تھی کہ وہ پاکستانی فوج کے

خلاف اپنی جنگ ختم کر دیں۔ حقانی کے کارکنوں نے جولائی 2008 اور اکتوبر 2009 میں کابل میں بھارتی سفارت خانے پر حملے کرنے میں بھی آئی ایس کی معاونت کی تھی کی تھی۔ پاکستانی حکومت و فوج کو یقین تھا کہ حقانی ان کا آدمی تھا اور اسے کرزائی حکومت کے ساتھ شراکت اقتدار کے حوالے سے رضامند کیا جا سکتا تھا۔

یہ امر اتنا واضح نہیں تھا کہ پاکستان نے ملا عمر کے لئے کیا کردار سوچا ہوا تھا۔ دوسرے طالبان رہنما، خواہ افغانی تھے یا پاکستانی، کم از کم طالبان کے بانی اس شخص کو بظاہر اپنا قائد تسلیم کرتے تھے۔ اس دوران اس کی کوئٹہ شوریٰ جنوبی افغانستان کے اندر طالبان کاروائیوں میں ملوث نظر آتی تھی۔ فوج کے ایک سابق اعلیٰ عہدیدار نے جو کہ پاکستانی انداز فکر سے واقف تھا، 2010 کی گرمیوں میں میرے سامنے اس امر کا اعتراف کر لیا تھا کہ پاکستان افغان اتحاد میں حقانی کی شمولیت کو خوش آمدید کہہ دے گا مگر اسے ملا عمر کے بارے میں اتنا یقین نہیں تھا۔ اس کی بے یقینی کی ایک وجہ کا تعلق غالباً کئی ماہ قبل کراچی میں ملا عمر کے نائب معاون ملا برادر کی پراسرار گرفتاری سے بھی تھا۔ اس وقت بہت سے تجزیہ نگاروں کا خیال تھا کہ یہ گرفتاری اس امر کا اشارہ بھی ہو سکتی تھی کہ پاکستان آخر کار افغان طالبان کے خلاف کاروائی پر آمادہ ہو چکا تھا۔ مگر ایسا نظر نہیں آ رہا تھا۔ پاکستان کے دفاعی اداروں کے افسران اعلیٰ نے اگست میں نیویارک ٹائمز کو بتایا تھا کہ انہوں نے برادار کو اس لئے گرفتار کیا تھا کیونکہ وہ ان کو آگاہ کئے بغیر کرزئی حکومت سے مذاکرات کرتا رہا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان اور کرزئی حکومت مذاکرات پر مبنی حل کے لئے مختلف مقاصد کے تحت کوشاں تھے۔ حقیقت جو بھی ہو، اپریل 2011 تک وہ افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کا عمل پروان چڑھانے کے لئے اعلیٰ سطحی کمیشن کی تشکیل پر رضامند ہو چکے تھے۔ اس عمل کے ایک جزو کے طور پر انہوں نے ترکی کی طرف سے طالبان کو ان کے اپنے ملک میں دفتر کھولنے کی تجویز سے بھی اتفاق کر لیا تھا۔

اگرچہ امریکہ نے ایک مرحلے پر افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات کی ضرورت کو تسلیم کر لیا تھا، تاہم امریکہ نے ایک مسئلے پر واقع حدِّ فاصل کھینچ دی تھی، یعنی کابل میں کسی بھی ایسی طالبان تنظیم کے کردار کی مخالفت جو القاعدہ کی حمایت جاری رکھے ہوئے ہو۔ پاکستان اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھا اور حقانی گروپ کو قائل کرنے کی کوشش کرتا رہا تھا کہ وہ عرب ممالک سے

اپنے روابط ختم کر دیں، مگر بظاہر اسے کوئی کامیابی نہ ہوئی۔ امریکہ بھی مذاکرات میں ایک مضبوط فریق کی حیثیت سے شامل ہونا چاہتا تھا۔ اور اوباما کی طرف سے افغانستان میں متعین امریکی فوجوں کی تعداد میں اضافے کے پس پردہ کافی حد تک یہی محرک کارفرما تھا: طالبان کو کافی حد تک کمزور کر کے رکھ دو اور پھر دیکھو کہ آیا انہیں مذاکرات کی میز پر لا کر اپنے حق میں زیادہ سے زیادہ شرائط منوانے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ امریکہ کی بری افواج کی طاقت میں اضافے کے پس پردہ پری ڈیٹر می کا عنصر بھی اہمیت رکھتا تھا۔ پاکستان کی طرف سے شمالی وزیرستان میں جارحانہ کاروائی کے حوالے سے مسلسل ہچکچاہٹ کو مدنظر رکھتے ہوئے امریکہ نے پاکستان کو ڈرون حملوں میں ایک مرتبہ پھر اضافہ کرنے کی پالیسی سے اتفاق کرنے پر مجبور کر دیا۔ 2009 کے اواخر میں ان حملوں کی تعداد تقریباً تین فی ماہ سے بڑھ کر پانچ تا دس فی ماہ تک پہنچ گئی۔ ان حملوں کا زیادہ تر ہدف شمالی وزیرستان کا وہ علاقہ تھا جہاں حقانیوں کا تسلط تھا۔ سراج الدین کا چھوٹا بھائی محمد حقانی بھی فروری 2010 میں ایک ایسے ہی حملے کی زد میں آ کر ہلاک ہو گیا تھا۔ بعد ازاں ستمبر 2010 میں ان حملوں کی رفتار ایک مرتبہ پھر بڑھنے لگی۔ سال کے آخر تک پری ڈیٹر میزائل حملے تقریباً ایک روز کے وقفے سے مسلسل کئے جانے لگے اور بعض اوقات تو ایک دن میں کئی کئی حملے کئے جاتے۔

تاہم ڈرون حملوں کی تعداد میں تیزی سے اضافہ بھی امریکہ کو مطمئن کرنے کیلئے کافی نہیں تھا۔ یہ نکتہ ستمبر کے اواخر میں اس وقت واضح ہو گیا جب امریکہ نے حقانی نیٹ ورک کے بھاگتے ہوئے جہادیوں کے پرجوش تعاقب میں پاکستانی حدود کے اندر حملہ آور ہیلی کاپٹر روانہ کر کے پاکستان کی برداشت کا امتحان لینے کا فیصلہ کر لیا۔ اس طرح کے تین حملے دیکھنے میں آئے جن میں سے ایک کا نتیجہ فرنٹیئر کور کے ان تین جوانوں کی ہلاکت کی صورت میں برآمد ہوا جنہوں نے ان ہیلی کاپٹروں کو واپس لوٹ جانے پر مجبور کرنے کی کوشش میں ہوا میں فائرنگ کی تھی۔ ان حملوں نے پاکستان کی سرزمین پر امریکہ کی جنگی کاروائیوں کے حوالے سے طویل عرصہ سے نافذ پابندیوں کی خلاف ورزی کر کے رکھ دی تھی۔ پاکستان نے امریکہ کی توقعات کے برعکس کچھ زیادہ ہی منفی ردعمل کا اظہار ان دو راستوں میں سے ایک کی بندش کی صورت میں کیا جو امریکہ افغانستان میں اپنی، فوجیں بھجوانے کے لئے استعمال کرتا تھا۔ اس کے تقریباً فوراً بعد ہی سرحد کی بندش کے باعث رسد فراہم کرنے والے امریکی قافلے کی راستے میں جگہ جگہ رکی ہوئی گاڑیوں پر حملے شروع

کر دیئے گئے۔ اگرچہ تحریک طالبان نے ان حملوں کی ذمہ داری قبول کر لی تھی، مگر اس امر کا بہت ہی کم امکان ہے کہ ان کے جہادی اہداف کا یقین کر کے انہیں نشانہ بنانے کی اہلیت رکھتے تھے۔ بعض حملے ایسے علاقوں میں واقع ہوئے، مثلاً اندرون سندھ، جہاں پر کہ پاکستانی طالبان کا کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ ایک انتہائی امکانی وضاحت یہ بھی ہوسکتی ہے کہ پاکستان نے یہ حملے اپنا موقف واضح کرنے یا کوئی خاص پیغام دینے کے لئے خود ہی کروادیئے ہوں۔ انہیں اس حوالے سے بظاہر کامیابی ہوگئی تھی، کیونکہ کچھ ہی دنوں کے اندر اندر امریکہ کو اعلانیہ معافی مانگنی پڑی اور یوں اس کے نتیجے میں پاکستان نے امریکہ اور نیٹو کے رسد فراہم کرنے والے قافلوں کے لئے درّہ خیبر کا راستہ دوبارہ کھول دیا۔

2010 کے اواخر میں اس طرح کی خبریں منظر عام پر آنے لگ گئیں کہ حقانی نیٹ ورک کے بعض عناصر کرم ایجنسی میں داخل ہونا شروع ہو گئے تھے جو کہ شمالی وزیرستان کے شمال میں بالکل قریب ہی واقع ہے۔ پاکستانی اخبارات میں یہ افواہیں گردش کر رہی تھیں کہ یہ سب کچھ اس لئے ہو رہا تھا تا کہ حقانیوں کے زیر تسلط علاقے پر امریکہ کے مسلسل ڈرون حملوں سے پناہ حاصل ہو سکے۔ تاہم یہ بھی ممکن ہے کہ حقانی لوگ شمالی وزیرستان پر پاکستانی فوج کے ممکنہ جارحانہ حملے سے بچنے کی پیشگی کوششیں کر رہے ہوں۔ اس طرح کی کاروائی کرنے کے لئے پاکستان پر نہ صرف امریکہ مسلسل دباؤ ڈال رہا تھا بلکہ اس مقصد کے لے خود ان کے پاس بھی وجوہات موجود تھیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے 2009 کی خزاں میں جنوبی وزیرستان سے باہر دھکیل دیئے جانے کے بعد محسود کے بہت سے جہادیوں کو شمالی افغانستان میں پناہ لینی پڑ گئی تھی۔ اور یہ جلد ہی پاکستانی طالبان کی ریاست مخالف سرگرمیوں کا انتظامی گڑھ بن کر رہ گیا تھا۔ اگرچہ پاکستان کو ابھی تک یہی فکر تھی کہ کہیں دو دوسرے علاقوں پر اس کی گرفت کمزور نہ پڑ جائے، مگر انہوں نے پھر بھی یہ فیصلہ کر لیا ہوگا کہ شمالی وزیرستان میں داخلے کا خطرہ مول لینا مناسب رہے گا۔ چونکہ حقانی لوگ، ممکنہ طور پر پاکستان کے اکسانے پر ہی بحفاظت کرم ایجنسی میں پناہ لے چکے تھے، اس لئے فوج وہاں بلا دھڑک داخل ہونے پر تیار ہوگئی ہوگی۔ امریکہ شمالی وزیرستان پر کاروائی کروانے میں کامیاب ہوگیا تھا مگر یہ اس کی شرائط کے مطابق نہیں تھا۔ تاہم پاکستان کے طرف سے اس امر کی مسلسل تردید کی جاتی رہی کہ وہ متنازعہ قبائلی علاقوں میں کسی فوری کاروائی کا ارادہ رکھتا تھا۔ امریکہ اور

پاکستان کے درمیان شمالی وزیرستان کے اندر کارروائی کی نوعیت کے حوالے سے اختلافات دو ممتاز حلیفوں کے درمیان پائے جانے والے غیر مربوط اور متناقص تعلقات کی انتہائی واضح علامت تھے۔ پاکستان نے القاعدہ کے بہت سے اعلیٰ عہدیداروں و کارکنان کو انصاف کے کٹہرے تک پہنچانے میں امریکہ کی مدد کی تھی۔ اس نے ملک کے اندر کڑی تنقید کا سامنا کرنے کے باوجود قبائلی علاقوں میں القاعدہ اور طالبان کے اہداف کو نشانہ بنانے کی اجازت دی تھی۔ جیسا کہ 2009 کے اوائل میں منکشف کیا گیا تھا بعض ڈرون اندرون بلوچستان کے دوردراز مقام سے پاکستانی علاقے کے باہر بھی کاروائی میں استعمال ہو رہے تھے۔ ان میں سے بہت سے ڈرون پاکستان کی طرف سے فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر ہی اپنے ہدف کو نشانہ بنانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ اسی طرح افغانستان کے اندر امریکی کاروائیوں کے لئے بھی پاکستان کا تعاون فیصلہ کن حیثیت رکھتا تھا۔ جیسا کہ امریکی ہیلی کاپٹروں کے قبائلی علاقوں کے اندر بلا اجازت حملوں پر پاکستان کے ردعمل سے صاف ظاہر ہوتا تھا، امریکہ کو افغانستان کے اندر اپنی فوجیں بھجوانے کے لئے پاکستان کی نیک نیتی پر بہت زیادہ انحصار کرنا پڑتا تھا۔ مگر جب اس ملک میں امریکہ کے مقاصد کی حمایت کا مرحلہ آیا تو پاکستان ایک حلیف کی نسبت اچھا خاصا حریف ثابت ہوا۔ اسی طرح وہ اسامہ بن لادن کی تلاش کی کوششوں میں بھی ناکام ہو کر رہ گئے تھے حالانکہ عام طور پر یہ یقین پایا جاتا تھا کہ وہ یہیں کہیں اس ملک کے اندر ہی چھپا بیٹھا تھا۔ اکتوبر 2009 کے اپنے دورے کے دوران انتہائی برہم دکھائی دینے والی امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن نے پاکستانی اخبارات کے ایڈیٹروں کو بتایا تھا کہ اس کے لئے یہ یقین کرنا مشکل ہے کہ پاکستانی حکام میں سے کسی کو بھی یہ علم نہیں تھا کہ بن لادن کہاں ہے۔

امریکہ نے اپنے طور پر پاکستان کو اچھی خاصی مادی اور مالی امداد اسے نوازا تھا۔ 2004 میں اس نے پاکستان کو غیر نیٹو حلیف کا درجہ عطا کیا تھا جو کہ پوری دنیا میں ایسے تیرہ اور ممالک کے پاس تھا، اور جس کی بنیاد پر اسے دفاعی ساز و سامان کے ترجیحی بنیادوں پر حصول کا حق حاصل ہو گیا تھا (ان چودہ ممالک میں بھارت شامل نہیں ہے)۔ 2010 تک امریکہ پاکستان کو سالانہ تقریباً 2 ارب ڈالر کی دفاعی امداد سے نواز رہا تھا جس میں سے زیادہ کا تعلق قبائلی علاقوں میں کاروائیوں پر پاکستانی فوج کے مصارف کی ادائیگی سے تھا۔ اس کے علاوہ امریکہ نے پاکستان

کو جدید ایف ۔ سولہ طیارے اور غیر مسلح نگران ڈرون بھی، جن کا واضح مقصد تو طالبان کے خلاف استعمال کرنا تھا مگر جنہیں بھارت کے خلاف بھی استعمال کیا جا سکتا تھا، فروخت کرنے پر رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ امریکہ نے پاکستان کو خوش کرنے کے لئے وزیر خارجہ کی سطح پر باقاعدہ اجلاس کی خصوصیت کے حامل وسیع تر موضوعات کا احاطہ کرنے والے ''کلیدی مذاکرات'' کا سلسلہ استوار کرنے پر بھی رضا مندی ظاہر کر دی تھی۔ ایک اعلیٰ کے سابقہ پاکستانی سفارت خار نے مجھے بتایا تھا کہ پاکستان کو یہ سب کچھ اس لئے بھی اچھا لگا تھا کیونکہ اس طرح اسے امریکہ کو وہ سب کچھ سنانے کا موقع مل جاتا جو کہ وہ کہنا چاہتا تھا۔

سویلین شعبے میں بھی پاکستان کی امداد 105 بلین ڈالر پہنچ چکی تھی جس کے پس پردہ 2009 میں منظور ہونے والا کیری لوگر بل تھا۔ اس قدر فیاضی اور دریا دلی کے مظاہرے کے باوجود کیری لوگر بل کی حتمی منظوری کے نتیجے میں پاکستان کے اندر بڑے پیمانے پر احتجاج شروع کر دیا گیا۔ مسئلہ پیسوں کا نہیں تھا؛ پاکستان کو معاہدے کی زبان بڑی مربیانہ اور مبنی بر الزام تراشی لگی جس کے تحت اسے دہشت گردی کی حمایت سے باز رہنے کے ساتھ ہی اوباما انتظامیہ پر یہ شرط عائد کی گئی تھی کہ وہ اس امر کی تصدیق کرے کہ فوج ملک کے ''سیاسی عدالتی معاملات'' میں دخل اندازی کی کوشش نہیں کر رہی تھی۔ صورتحال اس وقت مزید بگڑ کر رہ گئی جب امریکہ نے اسلام آباد میں اپنی سفارتی سہولتوں میں خاطر خواہ اضافے اور اپنے سفارتی عملے کی تعداد میں تقریباً سو فیصد اضافے کا اعلان کر دیا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی یہ افواہیں بڑی شدت اختیار کر گئیں کہ امریکہ بری و بحری جنگی ماہر ایک ہزار اضافی تربیت یافتہ فوجی (marine guards) بھجوانے کے ساتھ ہی بلیک واٹر سیکیورٹی کمپنی کی خدمات بھی حاصل کر رہا ہے تاکہ ان کو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کے لئے استعمال کر سکے۔ یہ حقیقت بھی سامنے آئی کہ بہت سے نئے عملے کی خدمات اس لئے حاصل کی جا رہی ہیں تاکہ وہ کیری لوگر بل کے تحت ملنے والی امداد کی نگرانی کر سکیں کہ یہ کن مقاصد کے لئے خرچ کی جا رہی ہے، اگرچہ اس کا شاید کچھ جواز تو بنتا تھا، مگر اسے آخر کار استعمال کرنے والے پاکستانیوں کی دیانت پر بمشکل ہی اعتماد کا مظہر گردانا جا سکتا تھا۔ صورتحال کے اس رخ کے باعث امریکہ کے پاکستان کے حوالے سے حتمی عزائم کے بارے میں پائے جانے والے

1936 سے مسٹر جناح اور مسلم لیگ کے ساتھ قریبی طور پر وابستہ تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی کے کم عمر ترین رکن بھی تھے۔

MashalBooks.org

فرسودہ نظریات کو ہوا ملنے لگی۔ امریکہ واقعی کسی خاص مقصد کے حصول کی جانب پیش رفت کرنے لگا ہے۔ پیو ریسرچ کے رائے عامہ سے متعلق ایک جائزے میں، جو کہ کئی ماہ بعد لیا گیا تھا، انکشاف کیا گیا کہ تقریباً 60 فی صد پاکستانی امریکہ کو اپنا دشمن سمجھتے ہیں۔

ان واقعات نے پاکستانی حکام کو بھی پریشان کر کے رکھ دیا تھا۔ انہوں نے پیسے تو لے لئے، مگر سرحد بند کرنے کے ایک پیشگی واقعے کے طور پر آنے والے سفارتی عملے کے لئے ویزے جاری کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی انہوں نے دارالحکومت میں گشت کرنے والے امریکی سفارت کاروں کو بھی ہراساں کرنا شروع کر دیا اور جب بھی کسی امریکی سفارت کار کی گاڑی پر نظر پڑتی تو گاڑی میں بیٹھے ہوئے افراد کو باہر نکال کر تلاشی لینے پر اصرار کیا جاتا۔ اس طرح کی نازیبا حرکات کا سلسلہ کئی ماہ تک جاری رہا۔ یہ ان کے خیال میں امریکہ کی پاکستان کے حساس معاملات اور پریشانیوں کے حوالے سے انتہائی بے رحمانہ غفلت کا ثمرہ تھا۔ جیسا کہ ہمیشہ سے ہوتا آیا ہے پاکستان امریکہ سے اس لئے بھی شدید ناراض تھا کیونکہ امریکہ بھارت کے حوالے سے پاکستان کے تفکرات کے ازالے کے لئے کچھ بھی کرنے پر رضا مند نظر آتا تھا۔ امریکہ نے ممبئی کے مسئلے پر تو اس کی سرزنش کی تھی مگر کشمیر کے حوالے سے اس طرح کی کوئی خاص مدد کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس حقیقت سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ اوباما انتظامیہ نے شروع شروع میں اقوام متحدہ میں اپنے سابقہ سفیر رچرڈ ہالبروک کو جسے کہ پاکستان اور افغانستان کے لئے نمائندہ خصوصی مقرر کیا گیا تھا مگر انڈیا کی طرف سے مخالفت کے اظہار کے بعد یہ تجویز ترک کر دی گئی تھی۔

اور بالکل اسی طرح امریکہ کی طرف سے افغانستان میں بھارت کی موجودگی کے حوالے سے پاکستانی تفکرات کو سنجیدگی سے نہ لینے پر بھی پاکستان کو شدید مایوسی تھی۔ بھارت کو اپنی سرگرمیوں میں کمی کرنے کی نصیحت تو دور کی بات، امریکی عہدیدار الٹا بھارت کے کردار کو سراہنے میں ہوئے تھے جو کہ اس امر کی تردید کے مترادف تھا کہ بھارت کی وہاں موجودگی سے پاکستان کو کوئی حقیقی خطرہ لاحق ہے۔

جہاں تک امریکہ کا تعلق ہے تو پاکستان کے لئے افغانستان کے حوالے سے اپنے تحفظ کے خدشات دور کرنے کا بہترین طریقہ یہی تھا کہ وہ کرزئی حکومت سے قریبی تعلقات قائم

کرے۔ تاہم پاکستانی حکام اور کرزئی کے مابین شدید عدم اعتماد اور معاندانہ جذبات کے ہوتے ہوئے یہ انتہائی مشکل امر دکھائی دے رہا تھا۔ حتمی بات یہ کہ نہ تو امریکہ اور نہ ہی پاکستان ایک دوسرے کو ان مسائل کے حوالے سے مطمئن کرنے کے قابل یا تیار نظر نہیں آتے تھے جو ان کے نزدیک بہت اہمیت کے حامل تھے۔ دونوں ممالک نے ایک دوسرے کے لئے بہت کیا تھا مگر پھر بھی یہ کافی نہیں تھا۔ تعلقات پر شکوک وشبہات اور عدم اعتماد کے سائے مزید گہرے ہوتے چلے جا رہے تھے۔

دسمبر 2010 میں سی آئی اے نے اپنے اعلیٰ ترین نمائندے کو موت کی دھمکیاں ملنے کے بعد اسلام آباد سے واپس بلا لیا۔ نیویارک ٹائمز کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے امریکی عہدیداروں نے بتایا کہ آئی ایس آئی نے اس کی خفیہ سرگرمیوں کا راز فاش کر دیا تھا۔ بعدازاں جنوری 2011 کے اواخر میں تعلقات ڈرامائی طور پر اس وقت مزید کشیدگی کا شکار ہو گئے جب امریکہ کا سفارتی پاسپورٹ رکھنے والے ایک کارکن ریمنڈ ڈیوس کو لاہور میں دو ایسے افراد کو گولی مار کر ہلاک کرنے کے جرم میں گرفتار کر لیا گیا تھا جو اس کے دعوے کے مطابق اسے لوٹنے کی کوشش کر رہے تھے۔ اس واقعے سے پاکستانی عوام میں اشتعال کی لہر دوڑ گئی تھی جو امریکہ کے اس اصرار پر بعدازاں مزید برافروختہ ہو کر رہ گئے تھے کہ ڈیوس کو سفارتی استثنیٰ حاصل تھا اس لئے اسے فوری طور پر رہا کر دیا جائے۔ اس کے بعد منکشف ہوا کہ ڈیوس اصل میں ٹھیکیدار تھا جو لاہور میں سی آئی اے کی ایک ایسی پراسرار ٹیم کے لئے کام کر رہا تھا جس کی سرگرمیوں سے پہلے آئی ایس آئی بھی بے خبر تھی اس واقعے نے پاکستان کے ان بدترین شکوک وشبہات کی بھی تصدیق کر دی کہ امریکہ ان کے ملک میں کیا کچھ کر سکتا ہے۔ پاکستانی حکام کا دعویٰ تھا کہ سی آئی اے کی ٹیم مقامی طور پر سرگرم اسلامی انتہا پسندوں کے معمولات کی جاسوسی میں مصروف تھی۔ ان کا یہ بھی اصرار تھا کہ مارے جانے والے دو افراد ڈاکو نہیں بلکہ آئی ایس آئی مخبر تھے جنہیں ڈیوس کے تعاقب کا فریضہ سونپا گیا تھا۔ اگرچہ پاکستان نے براہ راست تو اعتراف نہیں کیا، مگر سی آئی اے جن اسلامی انتہا پسندوں کی نگرانی کر رہی تھی وہ تقریباً یقینی طور پر لشکر طیبہ کے کارکن تھے جو کہ لاہور سے کام کرنے والی واحد انتہا پسند اسلامی تنظیم ہے۔ پاکستانی حکام کے لشکر طیبہ کے ساتھ تعلقات کی حساس نوعیت کے پیش نظر یہ کوئی ایسی صورتحال نہیں تھی جسے آئی ایس آئی اتنی آسانی سے نظرانداز کر سکتی۔ اس

واقعے کے نتیجے میں یہ خدشات بھی سر ابھارنے لگے کہ ہو سکتا ہے کہ سی آئی اے ملک کے دیگر علاقوں میں بھی اس طرح کی ناخوشگوار سرگرمیوں میں ملوث رہی ہو۔ پنجاب کے صوبائی حکام نے جن کی قیادت حزب مخالف کی پی ایم ایل کر رہی تھی، امریکہ اس اصرار کے باوجود کہ ڈیوس کو سفارتی استثنیٰ حاصل تھا، اس کے خلاف قتل کے الزامات عائد کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ زرداری حکومت جو کہ ملکی مسائل کو حل کرنے میں ناکامی کے باعث پہلے ہی بہت کمزور پڑ چکی تھی اور اس تازہ واقعے پر عوام کے شدید ردعمل سے بوکھلائی ہوئی بھی تھی، مداخلت کرنے سے ہچکچا رہی تھی۔

یہ مسئلہ آخر کار کہیں مارچ میں جا کر اس وقت حل ہوا جب آئی ایس آئی نے سی آئی اے سے یہ یقین دہانی حاصل کر لی کہ لاہور کی طرز پر کی جانے والی کسی بھی کاروائی سے قبل اس کی اجازت حاصل کی جائے گی۔ ایک دوسرے کی ساکھ بچانے کے لئے ایک ایسا معاہد کیا گیا جس کے تحت امریکہ مقتولین کے گھر والوں کو دیت یعنی خون بہاء ادا کرنے پر تیار ہو گیا بشرطیکہ اس کے بدلے عائد شدہ الزامات واپس لے لئے جائیں۔ ڈیوس کچھ ہی دنوں کے اندر اندر طیارے میں بیٹھ کر پاکستانی حدود سے باہر نکل چکا تھا جبکہ پاکستانی عوام کو ابھی اس کی خبر ہی نہیں ملی تھی۔ دیت کے قانون کے باعث، جو کہ ایک ایسا شرعی اصول ہے جس سے شاذ و نادر ہی رجوع کیا جاتا ہے، معاملے کو حل کرنے کے ساتھ ہی جماعت اسلامی کے زیر اہتمام کئے جانے والے مظاہروں کی شدت کم کرنے میں بھی مدد ملی۔

ان معاملات کو خوش اسلوبی سے نمٹا دینے کے بعد دوطرفہ تعلقات میں نظر آنے والی بہتری کی امیدیں یکا یک اس وقت چکنا چور ہو کر رہ گئیں جب ڈیوس کی رہائی کے اگلے دن ہی ایک امریکی میزائل حملے کے نتیجے میں شمالی وزیرستان میں اڑتالیس افراد جاں بحق ہو گئے جو کہ پری ڈیٹر کی جنگ کے دوران سب سے زیادہ ہلاکتوں والے واقعات میں سے ایک واقعہ تھا۔ اگرچہ امریکہ کا اصرار تھا کہ جاں بحق ہونے والے سب افراد دہشت گرد تھے، مگر پاکستان نے اس کی پرزور تردید کر دی تھی۔ اس واقعے کی تحقیق کرنے والے پشاور کے ایک ممتاز صحافی کے دعوے کے مطابق میزائلوں کا نشانہ مقامی جرگے میں شرکت کے لئے اکٹھے ہونے والے وہ افراد تھے جو وہاں کرومائٹ کی ایک مقامی کان کو پٹے پر دینے کے انتظامات کے حوالے سے تبادلہ خیال کر رہے تھے۔ جنرل کیانی کی آواز پاکستان میں پرزور احتجاج کرنے والوں میں سب سے زیادہ نمایاں تھی کہ وہ یا تو پری ڈیٹر حملے بند کر دے یا پھر ان میں خاطر خواہ کمی لے آئے۔ مسلسل بڑھتے

ہوئے ڈرون حملوں کے پس پردہ نیم رضامندانہ خاموشی کے دو سے زیادہ برسوں کے بعد پاکستان نے یہ تاثر دینا شروع کر دیا تھا کہ جیسے اس کی برداشت جواب دینے لگی ہے۔

تاہم ابھی صورت حال اس سے بھی بدتر ہونے لگی تھی۔ یکم مئی 2011 کو فوجی تاریخ کے ایک بلاشبہ طویل ترین اور انتہائی بے باکانہ اور کامیاب نظر آنے والے کمانڈو حملوں کے دوران امریکہ نے اسامہ بن لادن کو مارنے کی مہم کے لئے پاکستان کی سرزمین کے اندر دور تک اپنے خصوصی فوجی اتار دیئے۔ وہ قبائلی علاقے کی کسی غار کے اندر نہیں چھپا بیٹھا تھا جیسا کہ اس سے پہلے سوچا جا رہا تھا، بلکہ آخرکار اسلام آباد سے صرف چند میل کے فاصلے پر خیبر پختون خواہ کے اندر واقع ایبٹ آباد نامی شہر کے گرد و نواح میں ایک بہت بڑی عمارت کے اندر روپوش تھا۔ ایبٹ آباد محض ایک شہر ہی نہیں ہے بلکہ یہ ایک فوجی چھاؤنی بھی ہے جہاں پاکستان ملٹری اکیڈمی، کاکول بھی واقع ہے جو کہ پاکستان کا ویسٹ پوائنٹ ہے۔ بن لادن کا احاطہ کچھ ہی فاصلے پر ایک ایسے متمول علاقے میں تھا جہاں فوج کے بہت سے ریٹائرڈ افسروں بھی رہائش پذیر تھے۔ یہ کمانڈو آپریشن جسے نیوی سیل (Navy SEAL) کی اس حملہ آور ٹیم نے سرانجام دیا تھا جسے افغانستان سے ہیلی کاپٹروں کے ذریعے یہاں لایا گیا تھا، مبینہ طور پر پاکستانی حکام کے علم یا رضامندی کے بغیر ہی شروع کیا گیا تھا۔ اگرچہ امریکی وزیر خارجہ ہیلری کلنٹن کے اعلان کے مطابق اسامہ بن لادن کا سراغ لگانے میں پاکستان کی طرف سے فراہم کی گئی خفیہ معلومات بہت معاون ثابت ہوئی تھیں، مگر پاکستان کو اس انکشاف پر بہت ندامت کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ نہ صرف یہ کہ انہیں اس کاروائی کے حوالے سے کسی قسم کی پیشگی اطلاع کے قابل نہیں سمجھا گیا تھا بلکہ یہ بھی کہ سب کچھ عین ان کی ناک کے نیچے ہوتا رہا۔ اس حقیقت کو چھپانا مشکل تھا کہ بن لادن نے خود کو روپوش رکھنے کے لئے ایک ایسے شہر کا انتخاب کیا تھا جو کہ پاکستانی فوج کا گڑھ تھا۔ فوج کو یا تو اس کی موجودگی کا بالکل ہی علم نہیں تھا، جس سے اس کی نااہلیت ثابت ہوتی ہے یا پھر اگر اسے علم تھا تو اس نے اس کے خلاف کوئی کاروائی کرنے سے گریز ہی کیا۔

یہ دھماکہ خیز واقعات جو کہ نائین الیون کے تقریباً ایک عشرے کے بعد وقوع پذیر ہوئے، پاکستان اور امریکہ کے مابین باہمی متصادم مفادات اور شدید عدم اعتماد کی عکاسی کرتے نظر آتے تھے۔ وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ ضرورت کے تحت حلیف بنے تھے، جن کے لئے ایک دوسرے کو شک یا دشمنی کی نظر سے نہ دیکھنا مشکل تھا۔ اور یہی لگتا ہے کہ ان تعلقات کے مابین واحد مشترک عنصر صرف یہ خوف تھا کہ اگر یہ تعلقات خراب ہو گئے تو اس کے نتائج تباہ کن ہو سکتے ہیں۔

9

مستقبل میں حالات کیا رخ اختیار کر سکتے ہیں

اس کا آغاز نیک نیتی سے ہوا تھا۔ پاکستان نے اوّل اوّل مذہبی جذبات سے سرشار، معروف مجاہدین کو افغانستان پر سوویت قبضے کے دوران اپنے خارجہ پالیسی کے مقاصد کے فروغ کے لئے استعمال کیا تھا۔ امریکہ نے اس سارے عمل میں پاکستان کو مکمل یا تعاون دیا تھا۔ امریکہ نے اس سارے عمل میں پاکستان کو مکمل حمایت وتعاون سے نوازنے کے ساتھ ہی سوویت یونین کو افغانستان سے بے دخل کرنے کے لئے ایک عشرے پر محیط جدوجہد میں اس کے حلیف اور مربی کا کردار ادا کیا تھا۔ اور اس وقت دونوں فریق افغانستان پر ایک دوسرے کے ساتھ یک جان تھے اور اس کے مطلوبہ نتائج بھی برآمد ہوئے تھے۔ بلکہ اس حکمت عملی سے اتنا فائدہ حاصل ہوا کہ پاکستان نے انتہاء پسند جہادیوں کو سستے جنگی ہتھیاروں کے طور پر مسلسل استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور کیوں نہیں؟ وہ انہیں افغانستان میں تابع فرمان رکھنے کا قابل ہو گئے تھے۔ اور یقیناً وہ انہیں اب بھی اپنے تابع فرمان رکھ سکتے تھے۔ اور ایک مرتبہ پھر شروع میں سب کچھ درست طریقے سے ہوتا نظر آرہا تھا۔ جہادیوں نے کشمیر میں بھارتیوں کی زندگی عذاب بنا کر رکھ دی تھی، اور افغانستان میں ان کے طالبان نمائندے / قائم مقام تیزی سے برسرِاقتدار آچکے تھے۔ پاکستانی بڑے شاداں وفرحاں نظر آرہے تھے۔ مگر پھر یہ سب کچھ سامنے آنا شروع ہو گیا اور گتھیاں سلجھنے لگیں۔ یہ مذہبی تنظیمیں یا جہادی تعاون کے لئے تیار تھے مگر صرف ایک حد تک۔ وہ مذہبی محرکات کے تحت سرگرم عمل تھے اور ان کا مقصد ان جاگیردار سیاستدانوں کی مدد کرنا نہیں تھا جن کی اکثریت اس اسلام کی پیروکار تھی جس سے وہ بیزار ہو چکے تھے۔ طالبان بن لادن کو حوالے کرنے پر تیار نہیں تھے۔

MashalBooks.org

جہادیوں نے کشمیر میں پہاڑوں اور دیگر جگہوں پر گھومنے والے مغربی سیاحوں کو اغواء کر کے ان کے سرتن سے جدا کر ڈالے تھے اور نیو دہلی میں بھارتی پارلیمنٹ پر بھی حملہ کیا تھا۔ نائین الیون کے بعد پاکستان کی خارجہ پالیسی کے ان سابقہ آلہ کاروں کی اکثریت بڑی تیزی اور بے رحمی سے ریاست مخالف سرگرمیوں کی طرف مائل ہوتی چلی گئی۔ مگر یہ بھی ایک حقیقت تھی کہ وہ قدم جما چکے تھے، جہاں وہ ہر گزرتے برس کے ساتھ اس طرح پھلتے پھولتے جا رہے تھے جس طرح جسم کے اندر سرطان جو ایک عضو سے دوسرے عضو میں سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کا آغاز تو بڑی نیک نیتی سے ہوا تھا مگر یہ سب کس طرح اختتام پذیر ہوگا؟

اس کا بہت حد تک انحصار اس پر بھی ہوسکتا ہے کہ افغانستان میں واقعات و حالات کیا رخ اختیار کریں گے۔ اگر پاکستان کے پاس کوئی جادو کی چھڑی ہوتی تو وہ افغانستان میں قابل اعتماد پاکستان نواز سیکولر پشتونوں کو برسر اقتدار لے آتے۔ مگر اس اس طرح کی مخلوق کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہاں صرف حامد کرزئی کا وجود ہے اور اسے بمشکل ہی پاکستان دوست کہا جاسکتا ہے۔ اس کے سامنے صرف دو ہی راستے موجود ہیں، یعنی یا تو ایک ایسا افغانستان جہاں شمالی اتحاد کی شکل میں موجود ان تاجک یا ازبک نسل کے باشندوں کا راج ہو جن کے بارے میں انہیں یقین ہے کہ بھارت کے ساتھ مشترکہ مفاد کے لئے کام کریں گے، یا پھر وہ افغانستان جہاں افغان طالبان کا غلبہ ہو۔ یہ ان کے لئے کوئی خوشگوار انتخاب نہیں ہے، مگر کوئی ایسا مشکل انتخاب بھی نہیں ہے۔ نائن الیون سے لے کر اب تک جو کچھ بھی ہوا ہے، اس کے باوجود پاکستان کے نزدیک بھارت ابھی تک ایک اہم خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ بھارت آخر اس کا یقینی دشمن ہے، جبکہ افغان طالبان صرف ممکنہ دشمن ہی ہیں۔ پاکستان کے ذہن میں یہ اب محض دو صورتوں سے کسی ایک صورت کے انتخاب کی بات ہی نہیں رہی۔ وہ اس نتیجے پر پہنچتے نظر آتے ہیں کہ افغان طالبان کو نہ تو امریکہ شکست دے سکتا ہے جب تک وہ افغانستان میں موجود ہے اور نہ ہی امریکہ کے جانے کے بعد افغان فوج اسے شکست سے دوچار کرسکتی ہے۔ اگرچہ پاکستان مذاکرات کے ذریعے حل نکالنے پر آمادہ ہوسکتا ہے، مگر صورتحال کو مسلسل تعطل کا شکار رکھنے میں بھی اس کا اتنا ہی مفاد نظر آتا ہے۔ جب تک افغان طالبان باغیانہ سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہیں، اس وقت تک افغانستان میں بھارتی عزائم کی راہ مسدود رہے گی۔ تاہم اس کے باوجود اسے یعنی بھارت کو قندھار یا کابل میں

افغان طالبان کی حکومت کے نتائج کا سامنا نہیں کرنا پڑتا۔

مگر یہ نتائج پاکستان کے لئے پریشان کن ہیں۔ وہ نائن الیون سے قبل طالبان کو اپنی مرضی کے تابع نہ کر سکا، اور اب بھی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آتی کہ وہ ایسا کر سکے گا۔ چنانچہ امکان یہی نظر آتا ہے کہ وہ کابل میں شراکت اقتدار کی کسی ایسی صورت پر رضا مند ہو جائے جس کے نتیجے میں طالبان کی سرگرمیاں یا اثر ورسوخ محدود ہو کر رکھ دے۔ دوسری طرف اس پر غالباً یہ بھی واضح ہو چکا ہے کہ مختلف جماعتوں کے اتحاد پر مبنی حکومت وہ واحد راستہ ثابت ہو سکتی ہے جو طالبان کے مکمل اقتدار کی جانب رہنمائی کرتا نظر آتا ہو۔ اتحادی حکومت میں شامل ہوں یا نہ ہوں، مگر اسے بلاشبہ یہی امید نظر آ رہی تھی کہ کابل میں اگر طالبان کی حکومت بحال ہو جاتی ہے تو وہ پاکستان نواز نہ بھی ہو تو کم از کم پاکستان مخالف بھی نہیں ہو گی اور نہ ہی اس کے پاکستانی طالبان دشمنوں کے ساتھ مشترکہ عزائم کی حامل ہو گی۔ اس امید کے پس پردہ یہ حقیقت کام کرتی نظر آتی ہے کہ ملا عمر اور حقانی نیٹ جہادیوں کو پاکستان میں ایک ایسے وقت میں پناہ دینے کے ساتھ ہی مادی امداد بھی فراہم کی گئی تھی جب کہ انہیں بڑی آسانی سے ان کے حال پر بھی چھوڑا جا سکتا تھا۔ اس احسان کا بدلہ افغان طالبان نے پاکستان کو پاکستانی طالبان مسئلے کے حل میں معاونت کی کوشش کی صورت میں دیا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، حقانیوں نے خاص طور پر اپنے پاکستانی ہم منصبوں پر مسلسل دباؤ ڈالا ہے کہ وہ پاکستانی ریاست کے خلاف جنگ کرنے سے باز رہیں۔ اس کے حافظ گل بہادر اور مولوی نذیر جیسے لوگوں کے حوالے سے مثبت نتائج برآمد ہوئے ہیں۔ تاہم افغان طالبان کی کوششیں خود ان کے اپنے مفاد کے لئے بھی ہیں، کیونکہ ان کا بنیادی مقصد پاکستان کی مدد کرنا نہیں بلکہ اپنے پاکستانی بھائیوں کو اس امر پر آمادہ کرنا ہے کہ وہ اپنی توجہ دوبارہ افغانستان پر مرکوز کریں۔

چنانچہ وہ اگر یا جب بھی افغانستان میں دوبارہ برسر اقتدار آ گئے تو ایسی صورت میں کیا ہو گا؟ بہت سے پاکستانیوں کو یقین ہے کہ افغان طالبان کی ریاست کے خلاف جنگ میں ان کی معاونت کریں گے۔ میں نے خود بھی ایک معروف پاکستانی صحافی کو ایک عوامی اجتماع سے خطاب کے دوران یہ پیش گوئی کرتے ہوئے سنا ہے، جس کے نزدیک یہ ایک یقینی امر کی طرح ہے۔ مگر پاکستان کو دراصل جو لوگ چلا رہے ہیں انہیں لازماً یہ امید کرنی چاہئے اور یقین بھی کہ افغان طالبان کے پاس ان سے تعاون کرنے کے سوا کوئی خاص راستہ نہیں ہو گا، کیونکہ اس کے علاوہ کوئی

اور متبادل راستہ تقریباً عالمی تنہائی کے مساوی ہوگا۔

امریکہ، اپنے طور پر بعض اوقات سخت گیر کوششیں جاری رکھے گا کہ پاکستان کو افغان طالبان کی حمایت سے باز رکھے۔ مگر امریکہ حتمی طور پر کسی ایسی متبادل افغان ریاست کی منظر کشی کرنے کے قابل نہیں ہوسکا جو پاکستان کو دلفریب نظر آسکے۔ حامد کرزئی کی صورت میں اس نے جانے پہچانے پاکستان میں بھارت کی موجودگی کے حوالے سے پاکستان کی تشویش دور کرنے کے لئے کچھ بھی نہیں کیا اور تقریباً یقینی طور پر اگر ایسی کوشش کرے بھی سہی تو کوئی خاص نتائج برآمد ہونے کی توقع نہیں ہے۔ امریکہ جنوبی ایشیاء میں نئی ابھرتی ہوئی عظیم طاقت کے ساتھ اپنے وسیع ہوتے ہوئے تعلقات کو خطرے میں ڈالنے پر تیار نہیں ہے اور نہ ہی بھارت کے لئے یہ قابل قبول ہوگا کہ امریکہ اس پر افغانستان کے حوالے سے کسی قسم کا دباؤ ڈالے۔ وہاں پر بھارت کی موجودگی کے حوالے سے پاکستان کی تشویش دور کرنے میں ناکامی پر امریکہ نے اس کے بدلے خاطر خواہ مالی اور فوجی امداد کرنے کے ساتھ ہی خطے میں اور خود پاکستان کے ساتھ مستقل طور پر سرگرمیاں/روابط جاری رکھنے کا وعدہ بھی کیا ہے۔ دونوں ممالک کے درمیان وزارتی سطح کے کلیدی مذاکرات کا مقصد جن کا آغاز مارچ 2010 میں کیا گیا تھا، اس دیرپا خلوص یا وابستگی کا اظہار کرنا تھا۔ اس میں دراصل یہ پیغام مضمر ہے کہ پاکستان کو افغانستان میں بھارت کی موجودگی، افغان حکومت اور فوج میں شامل اتحاد کے نمائندوں کی اکثریت، اور اس حقیقت سے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے کہ حامد کرزئی پاکستان کے بارے میں نیک جذبات نہیں رکھتا کیونکہ امریکہ پاکستان کو کوئی نقصان نہیں پہنچنے دے گا۔ مگر مسئلہ یہ ہے کہ اگر امریکہ اس وقت مخلص بھی ہو تو ماضی میں صرف اچھے وقت کا ساتھ ہونے کی بناء پر پاکستان کے پاس اس پر اعتماد کرنے کے لئے کوئی خاص جواز نہیں رہتا۔

ہوسکتا ہے کہ پاکستان کو امریکہ کے خلوص اور افغانستان میں قیام کی طاقت پر شک ہو، مگر یہ تصور ہی مشکل ہے کہ امریکہ اس خطے کو اس وقت تک اس کے حال پر چھوڑے رکھے جب تک کہ یہاں القاعدہ کی موجودگی کے آثار نمایاں ہیں۔ یہ بات حتیٰ کہ اس وقت بھی حقیقت ہوگی اگر امریکہ افغان طالبان کو کوئی بڑا نقصان پہنچائے بغیر یا کابل میں شراکت اقتدار کے حوالے سے کوئی بندوبست کرنے سے پہلے افغانستان سے اپنی فوجیں نکالنا شروع کر دیتا ہے۔ امریکہ یقیناً

پاکستان میں پری ڈیٹر حملوں کی مہم اس وقت تک جاری رکھنا پسند کرے گا جب تک قبائلی علاقوں کے اندر القاعدہ کے اہداف کو نشانہ بنانے کی ضرورت باقی رہے گی۔ تاہم ہو سکتا ہے کہ پاکستان کو یہ یقین ہو کہ اسامہ بن لادن کی موت کے ساتھ ہی امریکہ کو اس امر سے آخر کار اتنی دلچسپی نہیں رہے گی کہ کابل میں کس کی حکومت بنتی ہے۔ جیسا کہ پاکستان کا انداز نظر ہے، امریکہ افغانستان سے نکلنے کے لئے پہلے ہی بے چین تھا اور اس لئے اسامہ بن لادن کی موت اس عمل کو تیز کر دے گی۔ ایسا یقیناً ان کے فائدے میں ہوگا کیونکہ اس طرح افغانستان میں بھارت کی دہشت ناک موجودگی کے خلاف ان کے لئے افغان طالبان کا پتہ کھیلنا بہت آسان رہے گا۔ چنانچہ اس یقین کی کہ پاکستان کو دراصل ایبٹ آباد کے اندر اسامہ بن لادن کی موجودگی کا علم نہیں تھا باوجود اس حقیقت کے وہ پاکستانی فوج کی نظروں کے عین سامنے ہی چھپا بیٹھا تھا، غالباً بہترین وجہ یہی ہے۔ پاکستان کو یہ امید بھی ہو سکتی ہے کہ اسامہ بن لادن کی موت ان بندھنوں کو ڈھیلا کر دے گی جن کے ذریعے افغان طالبان القاعدہ کے ساتھ بندھے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے گذشتہ باب میں دیکھا وہ یہ چاہتا تھا کہ حقانی لوگ القاعدہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے جان چھڑوا لیں تاکہ ان مذاکرات کا حصہ بن سکیں جن کے نتیجے میں کابل میں مختلف جماعتوں پر مبنی اتحاد کی حکومت تشکیل پانی تھی۔ یہ ایک ایسا نتیجہ ہے جو کہ امریکہ کے لئے یقیناً مثبت ثابت ہو سکتا تھا اگر اس طرح القاعدہ کی تباہی یا خطے سے اس کا مستقل اخراج ممکن ہو سکتا۔

مگر پاکستان کے لئے القاعدہ کی یہاں سے روانگی کی خواہش کے پس پردہ اور وجوہات بھی موجود ہیں۔ پاکستانی طالبان کو پاکستانی ریاست کے خلاف اکسانے میں القاعدہ نے بہت اہم کردار ادا کیا تھا، اور بن لادن کی موت کے باوجود یہ تنظیم قبائلی علاقوں میں ایک مبہم وجود کے طور پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے ہے اور تحریک طالبان اور اس کے پنجابی حلیفوں کے ساتھ مل کر ملکی سطح پر دہشت گردی کی منصوبہ بندی میں مشغول رہتی ہے۔ پاکستان کی سرزمین پر اس کی موجودگی ایک ایسے ٹائم بم کی طرح ہے جو پاک۔امریکہ تعلقات کے مرکز میں کسی بھی وقت پھٹ سکتا ہے۔ اگر نائن الیون کی طرح کا اتنا ہی سنسنی خیز واقعہ امریکہ میں دوبارہ پیش آ گیا اور اس کی جڑیں بھی قبائلی علاقے میں نکل آئیں تو پھر ایسی صورت میں کیا ہو گا؟ پہلی مرتبہ نائن الیون کے نتیجے میں امریکہ نے افغانستان پر حملہ اور قبضہ کرتے ہوئے طالبان کو اقتدار سے بے دخل

کرنے کے ساتھ ہی القاعدہ کی قیادت کو پاکستان کی طرف فرار ہونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اب اگر اسی طرح کا واقعہ دوبارہ پیش آ گیا تو امریکہ کے اندر اسی شدت کی جوابی کاروائی کے حوالے سے بہت شدید سیاسی دباؤ ہوگا۔ ان حالات میں پاکستان کے پاس بہترین راستہ یہی ہوگا کہ وہ قبائلی علاقوں کو القاعدہ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پاک صاف کرنے کے لئے مشترکہ کاروائی کی پیشکش کر دے۔ اس حوالے سے ڈرون حملے زیادہ عرصے تک موثر ثابت نہیں ہوں گے۔ امریکہ ایک بہت ہی زیادہ مستحکم و موثر کوشش کی خواہش ظاہر کرے گا جس کی اہم خصوصیت زمینی اور فضائی کاروائی کا حسین امتزاج ہوگا۔ اور ایسی بے شمار کوششیں درکار ہوں گی۔

اس حوالے سے یقین کے ساتھ کوئی بھی کچھ نہیں کہہ سکتا کہ پاکستان کے اندر اس کا کیا ردِّ عمل ہوگا۔ ایک اور نائین الیون کی صورت میں حالات جو ڈرامائی رخ اختیار کر لیں گے، ان کو مدنظر رکھتے ہوئے ہوسکتا ہے، بلکہ اغلب امکان یہی ہے کہ وہ رضامند ہو جائیں گے۔ کیونکہ پہلے نائین الیون کے بعد بھی انہوں نے یہی ردِّ عمل ظاہر کیا تھا۔ ان کے پاس اب بھی امریکہ کو دشمن بنانے کے لئے ماضی سے زیادہ کوئی وجوہات نہیں ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ اس مرتبہ یہ پاکستان کی اپنی سرزمین ہی ہوگی جو امریکی فوجی کاروائیوں کے لئے میدان جنگ کا کام دے گی۔ ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ پاکستان اپنی جغرافیائی خودمختاری کی خلاف ورزی کی کس قدر شدت سے مخالفت کرتا ہے، اور امریکی عزائم کو کس قدر شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ پاکستان پر نگاہ رکھنے والے بعض حلقوں کو یقین ہے کہ پاکستانی سرزمین پر امریکی فوجوں کی موجودگی کے باعث پاکستانی فوج کے اندر بغاوت بھی ہوسکتی ہے اور امکان ہے کہ بعض فوجی پاکستانی فوج کو چھوڑ کر پاکستانی طالبان کے ساتھ مل جائیں گے تاکہ مل کر امریکی فوجوں کا مقابلہ کریں۔ اگرچہ ایک اور نائین الیون کے بعد پیدا ہونے والی فوری صورت حال کے نتیجے ہوسکتا ہے کہ بعض پاکستانیوں کو امریکہ کے ساتھ ہمدردی محسوس ہوا، مگر یہ جلد ہی ہوا میں تحلیل ہو جائے گی۔ جب تک کہ فوی طور پر کامیاب زمینی کاروائی کر کے امریکی فوجیں جلد از جلد پاکستانی علاقہ خالی نہیں کر دیں گی اس وقت تک یہی توقع ہے کہ امریکی موجودگی کی مخالفت میں تیزی سے اضافہ ہوتا جائے گا۔ ان حالات میں کسی بھی مرحلے پر، بالکل شروع میں امریکی موجودگی پر بمشکل رضامندی سے لے کر بعد ازاں امریکی فوجوں کے بڑھتے ہوئے اصرار تک، صورت حال قابو سے باہر ہونا شروع ہوسکتی ہے۔

یقیناً یہ وہ راستہ نہیں جس پر چلنے کی پاکستان خواہش رکھتا ہو۔

اس لئے اس امر کی یقینی امید ہونی چاہئے کہ اگر حقانی لوگ القاعدہ کا ساتھ چھوڑنے پر رضامند ہوتے نظر آئے تو وہ کم ازکم اس کے ساتھ ہی رہیں گے۔ یہ ایک اور فائدہ ہے جو پاکستان کو افغانستان میں افغان طالبان کو دوبارہ برسر اقتدار لانے کوششوں کے حوالے سے کوئی معاہدہ کروانے میں حاصل ہونے کی امید ہے۔ حقانیوں کو شمالی وزیرستان میں قیام کی مزید کوئی ضرورت نہیں رہے گی اور وہ اپنے جہادیوں کو مستقل طور پر واپس افغانستان کے اندر دھکیل سکتے ہیں۔ جیسا کہ ہم نے پہلے دیکھا ہے کہ شمالی وزیرستان میں محسود کے روپوش جہادیوں کا سنجیدگی سے تعاقب نہ کرنے کی ایک بنیادی وجہ یہ ہے کہ پاکستان کو ڈر ہے کہ کہیں اس کی حقانیوں سے محاذ آرائی نہ شروع ہو جائے۔ اگر حقانی چلے جاتے ہیں تو پھر یہ اتنا اہم مسئلہ نہیں رہے گا۔ اور اگر ان کے ساتھ محسود کے طالبان بھی فرار ہو کر افغانستان چلے جاتے ہیں تو اور بھی بہتر رہے گا۔

یہ، یا پھر اس سے ملتی جلتی صورت حال یہی پاکستانی منصوبہ نظر آتا ہے، تاہم حقیقت اس سے تقریباً یقیناً مختلف ہوگی۔ پاکستان ایک عشرے سے افغان طالبان کا ساتھ دیتا چلا آرہا ہے اور ان کا اصل مقصد اسی پالیسی پر کاربند رہنا ہے۔ اس کے برعکس کے لئے دلخراش تصور یہ ہوگا کہ وہ افغانستان میں دوبارہ برسر اقتدار آکر پاکستانی طالبان اور القاعدہ کے ساتھ پاکستان کی مخالفت میں ایکا کر لیں۔ بھارت کے خلاف ان کی عداوت کا یہ کوئی چھوٹا ثبوت نہیں ہے کہ وہ اس طرح کے انجام کا خطرہ مول لینے پر بھی اس لئے تیار ہیں تاکہ بھارت کے افغانستان کے اندر ایک غالب بیرونی طاقت کے طور پر ابھرنے کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ بہرحال بہت سی چیزوں کا انحصار وہاں پر امریکی کوششوں کی حتمی کامیابی پر ہوگا۔ جب تک افغان طالبان پاکستان کی طرف سے فراہم کردہ تحفظ اور امداد پر انحصار کرتے رہیں گے اس وقت تک اس امر کا کوئی امکان نہیں ہے کہ وہ اسلام آباد کو درپیش شدت پسند اسلامی خطرات میں اضافے کا باعث بن سکیں گے۔ تاہم اگر وہ اس طرح کے انحصار سے کسی بھی وقت خود کو آزاد کرانے کے قابل ہو جاتے ہیں تو پھر ہر طرح کے امکانات کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ جیسا کہ فوج کے اس سابقہ اعلیٰ عہدیدار نے اصرار کرتے ہوئے کہا تھا، جس کا میں گذشتہ باب میں حوالہ دے چکا ہوں، کہ افغانستان میں پاکستانی مسائل کے حوالے سے افغان طالبان مثالی حل کی حیثیت نہیں رکھتے تھے، ''ایک ملاّ پھر ملاّ ہی ہوتا ہے''۔

اگرچہ افغان طالبان ایک ممکنہ خطرے کی حیثیت رکھتے ہیں، تاہم پاکستانی طالبان اور ان کے القاعدہ تنظیم والے مربی حقیقت میں اہم خطرہ ہیں۔ فوج ان کو سوات اور جنوبی وزیرستان سے نکال باہر کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے، اور شمالی وزیرستان کو چھوڑ کر باقی ماندہ قبائلی علاقوں کے اندر بڑی لڑائیوں میں مصروف ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ان کارروائیوں کے دوران پاکستان نے اپنی باقاعدہ فوج کا تقریباً تیسرا حصہ اور فرنٹیئر کور کی کثیر تعداد کو استعمال کیا ہے۔ تاہم پاکستانی طالبان بذات خود پاکستانی ریاست کے وجود کے لئے اتنا بڑا خطرہ نہیں ہیں۔ اس طرح کا کوئی خطرہ کبھی بھی موجود نہیں رہا تھا کہ وہ قبائلی علاقہ جات اور خیبر پختونخواہ سے نکل کر پنجاب کے مرکزی علاقوں میں پہنچ جائیں گے۔ پاکستانی فوج کے عزم واستقلال اور رعب و دبدبے کے سامنے اس طرح کی صورتحال پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آیا پاکستانی طالبان اس قابل ہوسکیں گے۔ بونیر کے واقعہ کے سخت ردعمل سے، جہاں سویلین اور فوجی قیادت بھرپور جوابی کارروائی پر متفق ہوگئی تھی، یہی ظاہر ہوتا ہے کہ پاکستان پر جن لوگوں کی حکومت ہے وہ انہیں چھوڑنے پر تیار نہیں ہیں۔ اب جب کہ فوج اصل میں کھویا گیا بہت سا علاقہ واپس حاصل کرنے میں کامیاب ہوگئی ہے، تو یہ دیکھنا ابھی باقی ہے کہ وہ ابھی اور کتنا آگے جانے کی صلاحیت یا ارادہ رکھتی ہے۔

فوج کے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار نے جو کہ فوج کی حالیہ سوچ سے کافی حد تک اتفاق رکھتا نظر آتا ہے، مجھے بتایا کہ اسے اس حوالے سے کافی شکوک شبہات نظر آتے ہیں کہ فوج پہلے سے آزاد کرائے گئے علاقے پر قابض رہتے ہوئے باقی ماندہ پاکستانی طالبان کو شکست دینے کے قابل ہوسکے گی۔ اس کا مطلب یہی نظر آتا تھا کہ فوج نے علاقے میں اتنے فوجی دستے روانہ کر دیئے ہیں جتنے کہ وہ اپنے خیال میں روانہ کر سکتی ہے اور ابھی اس نے ملکی سرحدوں کا بھارتی خطرات کے خلاف تحفظ بھی کرنا تھا۔ اس نے اس امر پر بھی جھنجھلاہٹ کا اظہار کیا، مایوسی کی حد تک، کہ سویلین دفاعی ادارے مطلوبہ کمی کو پورا کرنے میں ناکام ہوگئے ہیں۔ یہ فوج کی طرف سے کی جانے والی ایک عام شکایت ہے۔ جاگیردار سیاست دان یہ تو چاہتے ہیں کہ فوج انہیں شدت پسند مذہبی نظریات رکھنے والوں سے بچائے مگر فوج کو سویلین دفاعی اداروں کی تعمیر واستحکام کے حوالے سے جس دباؤ کا سامنا ہے اس میں کمی لانے کے لئے کچھ کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ یہ حکمت عملی انہیں

مہنگی پڑے گی۔ یہ ان کی سیاسی زندگی کے لئے بھی خطرناک ثابت ہوسکتی ہے کیونکہ ایک وسیع تر اور زیادہ پیشہ ورانہ دھوکہ دہی اور بدعنوانی کی روایات پر مبنی ان سرگرمیوں کی راہ میں رکاوٹ ثابت ہوسکتی ہے جو کہ مربیانہ سیاست کا جزولازم ہیں۔ اس طرح رویے کے انتہاء پسندوں کی طرف سے بڑھتے ہوئے خطرات کے پیش نظر سویلین اداروں کے اپنی ذمہ داریوں سے فرار کی علامت ہیں۔ ملک کو درپیش مصائب و مشکلات کے حل کی تیاری کی صلاحیت سے محرومی اور جاگیردارانہ طرز زندگی وروایات میں کسی طرح کی بنیادی تبدیلی لانے کے حوالے سے پائے جانے والے تذبذب کی باعث انہوں نے اس ساری کی ساری افسوسناک صورت حال کی ذمہ داری فوج پر ڈال دینے کی کوشش کرڈالی۔ اس کی ایک واضح علامت کافی حدتک وہ مثالی فیصلہ تھا جو صدر زرداری نے 2010 کی گرمیوں میں فوج کے سربراہ اشفاق کیانی کی مدت ملازمت میں تین برس کی توسیع کے حوالے سے کیا تھا۔

اگر فوج قبائلی علاقوں اور سوات میں اپنی موجودہ تعداد کو برقرار رکھنے پر رضامند ہو یا اس کی اہلیت رکھتی ہوتو پھر غالبًا پاکستانی طالبان کو فرار ہونے پر مجبور کیا جاسکتا ہے۔ جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ آیا یہ انہیں مکمل شکست سے دوچار کردینے کی صلاحیت رکھتی ہے یا نہیں، یہ ایک بالکل ہی الگ معاملہ ہے۔ کسی زمانے میں سوات اور جنوبی وزیرستان پر راج کرنے والے پاکستانی طالبان کی اکثریت اب ادھر اُدھر فرار ہوچکی ہے۔ جو طالبان بھاگ کر اورکزئی اور مہمند ایجنسی چلے گئے تھے ان پر بھی باری آنے پر حملہ کیا گیا تھا، مگر فرار ہونے والے جہادیوں کی اکثریت خود اپنے طور پر شمالی وزیرستان پہنچ گئی تھی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ فوج اس علاقے میں کاروائی کرنے سے اس لئے گریزاں ہوتی رہی ہے کیونکہ یہ حقانی نیٹ ورک کا گڑھ بنا ہوا ہے۔ مگر یہ وہ علاقہ بھی ہے جہاں افغان اور پاکستان دونوں قسم کے طالبان جہادیوں کی اکثریت اس وقت روپوش ہے۔ فوج کی ابتدائی فتوحات کے باوجود یہ علاقے مکمل طور محفوظ و مامون نہیں ہیں۔ اگرچہ فوج ان کا محاصرہ جاری رکھے ہوئے اور بہت سے سویلین یا شہری اپنے گھروں کی طرف لوٹ آئے ہیں، مگر ان کے ساتھ ہی طالبان بھی لوٹ آئے ہیں جو اگرچہ فوج کے تسلط کا مقابلہ کرنے کی سکت تو نہیں رکھتے، تاہم ان کی تعداد اتنی ضرور ہے کہ وہ فوج کے جوانوں کو نشانہ بنا کر واپس بھاگ جانے، مخصوص بستیوں میں خوف و ہراس پھیلا دینے، اور قتل و غارت و دیگر

دہشت گرد کارروائیاں جاری رکھنے کی صلاحیت کا مظاہرہ کر سکیں۔

پاکستانی طالبان یہ سب کچھ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں باوجود اس حقیقت کہ پاکستان کی باقاعدہ فوج کا تیسرا حصہ قبائلی علاقوں اور سوات مین متعین ہے۔ تاہم اس امر کی کوئی ضمانت نہیں ہے کہ فوج اس مخصوص تعداد کے ساتھ ان علاقوں میں غیر معینہ مدت تک رہنے پر تیار ہے یا اس کی اہلیت کا مظاہرہ کر سکے گی۔ اگرچہ فوج کا کہنا ہے کہ وہ اس وقت تک وہاں رہے گی جب تک اس کی ضرورت ہوگی، مگر بیرونی واقعات، مثلاً بھارت کے ساتھ کسی بھی قسم کے بحران کی صورت میں اسے علاقے سے اپنے جوان واپس بلانے پڑ سکتے ہیں۔ یہ صورت حال پاکستانی طالبان کے حق میں جا سکتی تھی اور یوں پاکستان کے عوام خود کو دوبارہ ان کے چنگل میں پھنسا ہوا پاتے۔ حتیٰ کہ اگر ایسا نہ بھی ہو، پھر بھی حالیہ واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے پاکستانی طالبان ایک ممکنہ باغی طاقت کے طور پر غیر معینہ مدت تک خطرہ بن کر منڈلاتے رہنے کے قابل ہو سکتے ہیں۔ بونیر واقعے کے وقت سے اچھا خاصا علاقہ کھو دینے کے باوجود بھی وہ سارے کے سارے علاقے میں فوج کے خلاف گوریلا کارروائیاں کرنے کی اپنی صلاحیت برقرار رکھے ہوئے ہیں اور اس کے ساتھ ہی خیبر پختونخواہ کے اندر دہشت گرد حملوں کی مہم جاری رکھنے کی صلاحیت بھی کسی طرح سے کمزور پڑتی نظر نہیں آتی۔ اس میدان میں وہ اپنے افغان طالبان بھائیوں کے نقش قدم پر چلتے نظر آتے ہیں جو افغانستان میں اقتدار سے بے دخل کر دیئے جانے کے باوجود پھر ایک ممکنہ باغی طاقت بن کر اسی شدت کے ساتھ وہیں واپس پہنچ گئے تھے۔ اس جدوجہد کا نتیجہ امریکہ کے لئے بھی اچھی خاصی اہمیت کا حامل ہے۔ اگست 2009 میں بیت اللہ محسود کی ایک پری ڈیٹر حملے میں ہلاکت کا غیر مطلوبہ نتیجہ بھی اس کے جہادیوں کا امریکہ کے پکے دشمن بن جانے کی صورت میں نکلا تھا۔ اس کا جانشین حکیم اللہ محسود اس خودکش حملے میں بھی براہ راست ملوث تھا جس کی زد میں آکر سی آئی اے کے ساتھ تربیت یافتہ کارکن صرف تین ماہ بعد ہی مشرقی افغانستان کے ایک دور دراز علاقے میں مارے گئے تھے۔ اس بظاہر انتقامی واقعے کے بعد مئی 2010 میں ٹائمز اسکوائر میں کار بم کے ذریعے دہشت گردی کا ایک اور ناکام واقعہ پیش آ گیا۔ اس واقعہ میں فیصل شہزاد نامی ایک پاکستانی نژاد امریکی شہری ملوث تھا جو کہ جہاد کے شوق میں پاکستان کے قبائلی علاقوں کے سفر پر گیا تھا اور وہاں اسے اس حملے کے لئے پاکستانی طالبان کی

طرف سے بھرتی کر کے تربیت فراہم کی گئی تھی۔

اگرچہ پاکستانی طالبان ابھی تک ایک دہشت ناک قسم کی طاقت کے طور پر اپنا وجود برقرار رکھے چلے آ رہے ہیں، مگر ایک عسکری طاقت کے طور پر وہ خالصتاً ایک علاقائی خطرہ ہی ہیں جو کہ خاص طور پر شمال مشرقی پاکستان کے پشتون علاقوں تک ہی محدود ہے۔ وہ بذات خود، اپنے القاعدہ والے مربیوں کی مدد کے ساتھ بھی، پاکستان کی ریاستی طاقت کے جزوی یا کلی حصول کی لڑائی لڑنے کی اہلیت نہیں رکھتے۔ تاہم ایک اور عظیم خطرہ ان ہم خیال پنجابی جہادیوں کے ساتھ ان کی شراکت عمل کی صورت میں منڈلا رہا ہے جو سرائیکی پٹی کو اپنا گڑھ بنانے والی دیوبندی تنظیموں سے نکل کر آ رہے ہیں، اور جو جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پنجابی طالبان کے معروف نام کے تحت تیزی سے یکجا ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہ پنجابی طالبان ہی ہیں جنھوں نے پاکستان کے اہم شہری علاقوں میں سب سے زیادہ بے باکانہ حملے سرانجام دیئے ہیں جن میں کہ لاہور میں سری لنکا کی کرکٹ ٹیم پر ہونے والا حملہ اور راولپنڈی میں فوج کے صدر دفاتر پر ہونے والا حملہ بھی شامل ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ایسے بہت سے پنجابی طالبان علاقوں کا رخ کرتے ہیں جہاں انہیں اپنے القاعدہ کے ساتھیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے ساتھ ہی تربیت کا موقع بھی فراہم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ وہ ممکنہ جہادیوں کے بظاہر نہ ختم ہونے والے اس ذخیرے سے بھی استفادہ کرتے ہیں جو خطے کے اندر واقع ان دیوبندی مساجد اور مدارس سے اخذ کیا جا رہا ہے جو پاکستانی حکام کی دستبرد سے محفوظ چلے آ رہے ہیں۔ تاہم یہ قوتیں ابھی تک نہ تو بذات خود اور نہ ہی پاکستانی طالبان کے تعاون سے کسی ایک متحرک وحدت کی صورت میں یکجا ہو سکی ہیں۔ اگر کبھی ایسا ہو گیا تو پھر یہ بہت بڑا خطرہ ثابت ہوں گی۔

تاہم، اس طرح کے خطرے کی امکانی حد یا اثرات کو تناظر میں رکھنے کی ضرورت ہے۔ پنجابی طالبان نامی جہادیوں کی اصل طاقت یا حجم کے بارے میں کسی کو بھی درست اندازہ نہیں، تاہم پشتون طالبان کے مقابلے میں ان کی تعداد بہت ہی کم ہے۔ قبائلی علاقوں اور سوات میں پاکستانی طالبان کی تعداد کے حوالے سے پائے جانے والے تخمینوں میں بھی اختلافات پایا جاتا ہے، مگر میرے علم میں تیس سے لے کر پچاس ہزار سے زیادہ کے اعداد و شمار آئے ہیں۔ مثال کے طور پر جنوبی وزیرستان میں محسود کے جہادیوں کی تعداد کا اندازہ آپریشن پاتھ

ٹو سالویشن (آپریشن راہ نجات) کے آغاز پر دس سے بیس ہزار کے درمیان لگایا گیا تھا۔ تاہم لشکر جھنگوی، جو کہ پنجابی طالبان میں شامل تنظیموں کے ایک اہم جزو کی حیثیت رکھتا ہے اس سے بہت ہی چھوٹی تنظیم ہے جس میں شامل جہادیوں کی تعداد چند سو سے زائد نہیں ہے۔ اس حوالے سے کسی کو بھی یقینی طور پر کچھ معلوم نہیں ہے کہ قبائلی علاقوں کے اندر پنجاب سے اب تک کتنے افراد تربیت لینے اور اپنے پشتون بھائیوں کے شانہ بشانہ لڑنے کے لئے جا چکے ہیں، تاہم پاکستان کے خفیہ اداروں سے منسوب ایک رپورٹ کے مطابق 2005 سے لے کر 2007 کے درمیان 2000 پنجابی محسود کے جہادیوں سے جا ملے تھے۔ پاکستان کے وزیر داخلہ رحمٰن ملک نے 2010 کی بہار میں اخباری نمائندوں کو بتایا تھا کہ حکومت نے جنوبی پنجاب سے تعلق والے 729 دہشت گردوں کو مطلوبہ افراد کی فہرست میں شامل کر لیا تھا۔ یہ یقیناً پنجابی طالبان کی مجموعی تعداد کا بہت ہی کم تناسب ہے، مگر پھر بھی یہ مل جل کر کل دس ہزار سے زیادہ نہیں بنتے اور کافی حد تک ممکن ہے کہ اس سے بھی کم ہوں گے۔

پنجابی طالبان لال مسجد کے واقعے کے وقت سے ہی پاکستان کے اندر دہشت گردی کے بہت سے انتہائی لرزہ خیز واقعات میں ملوث چلے آتے رہے ہیں، مگر ان واقعات کی تعداد نسبتاً کم ہے اور یہ زیادہ سے زیادہ ماہانہ نہ کہ ہفتہ وار بنیادوں پر پیش آتے رہے ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ دہشت گردوں کی بہت تھوڑی تعداد، زیادہ سے زیادہ سو کے قریب، ان حملوں کی منصوبہ بندی اور عملدر آمد میں ملوث رہی ہے۔ پاکستان میں زیادہ تر دہشت گرد حملے خیبر پختونخواہ کے اندر ہی کیئے جاتے رہے ہیں اور ان کے پس پردہ زیادہ تر طالبان کی پشتون قسم کا ہاتھ ہے جس کی اہم وجوہات انکی بہت زیادہ تعداد اور علاقے کے اندر ایک قسم کا عمومی انتشار ہے۔ تاہم، پنجابی طالبان اپنے زیادہ لرزہ خیز حملوں کی وجہ سے شہری علاقوں کی آبادی پر دہشت بٹھانے اور جاگیردار سیاسی طبقے میں اشتعال کی لہر دوڑانے میں کامیاب رہے ہیں۔ وہ ایک طرح سے دہشت یا خوف کی فضا قائم کرنے میں کامیاب ہو گئے ہیں جو کہ ان کی اصل کامیابیوں سے بھی زیادہ کارگر حربہ ثابت ہوئی ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ وہ نہ تو کسی علاقے پر اپنا تسلط قائم کر سکے ہیں، نہ ہی کسی سرکاری عمارت کی تعداد یا شدت میں اتنی تیزی سے اضافہ کر سکے ہیں کہ جس کے نتیجے میں روز مرّہ زندگی کا تسلسل ٹوٹ سکتا۔ اس کی وجہ ان کی نسبتاً کم تعداد ہے یا پھر جوش وخروش کا فقدان، یہ

ابھی پوری طرح واضح نہیں ہے۔ تاہم یہ نتیجہ بڑی آسانی سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ فی الحال، کم پنجابی طالبان خود اپنے طور پر، یا پھر پاکستانی طالبان اور القاعدہ کے ساتھ مل کر، ریاست کے لئے کوئی دائمی خطرہ بنتے نظر نہیں آتے۔ وہ اپنے مسائل میں گھرے ہوئے عام پاکستانیوں کی زندگی اجیرن کر سکتے ہیں یا پھر بڑے بڑے وزیروں مشیروں کو پریشان کر سکتے ہیں۔ وہ جس خطرے کی علامت ہیں وہ محض ممکنہ ہے نہ کہ حقیقی۔

تاہم اگر ان کی تعداد میں اضافہ ہوتا چلا گیا اور یہ زیادہ مربوط قسم کا تنظیمی ڈھانچہ تشکیل دینے میں کامیاب ہو گئے تو پھر بلاشبہ یہ ایک بڑھتے ہوئے حقیقی خطرے کی علامت بن جائیں گے۔ فی الحال بہت سے پاکستانی آپ کو یہی کہتے ہوئے ملیں گے کہ ایک اور الجیریا بننے کا تصور ہی خوفناک ہے۔

خطرہ خاطر خواہ طور پر بڑھتا ہی چلا جائے گا اگر انتہا پسند مذہبی قوتیں جو ابھی تک ریاست دشمنی کے راستے پر نہیں چل رہیں مگر ایک دن ایسا کرنے کا فیصلہ کر لیتی ہیں۔ اس حوالے سے لشکر طیبہ سر فہرست نظر آتی ہے۔ تاہم جیش محمد کی باقیات اور اسی طرح سپاہ صحابہ بھی جس کے چند ایک ارکان جنوبی پنجاب کے مقامی سطح کے انتخابات میں حصہ لیتے رہتے ہیں جس کے لئے انہیں کبھی کبھار بڑے پیمانے کی سیاسی جماعتوں کی حمایت بھی حاصل ہو جاتی ہے اس زمرے میں آجاتی ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، اس وقت لشکر طیبہ جس کا شمار پاکستان کی سب سے منظم اور انتہائی پیشہ ورانہ انتہاء پسند اسلامی تنظیم میں ہوتا ہے، بیس ہزار یا اس سے زائد ممکنہ خطرے کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگرچہ ممبئی واقعے کا نتیجہ لشکر اور سرکاری حکام کے درمیان اعتماد کے بڑھتے ہوئے بحران کی صورت میں نکلا، تاہم دونوں فریق وقت کے ساتھ ساتھ اس بحران سے نکلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور ان کا باہمی تعلق بھی نسبتاً مربوط نظر آتا ہے۔ جیسا کہ شروع سے سچ ثابت ہوتا آرہا ہے، مستقبل میں اس تعلق کی صحت کا انحصار زیادہ تر پاکستان اور بھارت کے تعلقات میں خصوصاً کشمیر کے حوالے سے ہونے والی پیشرفت پر ہوگا۔ ممبئی کو لشکر کے ایسے تیر کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے جو حکومت کی کمان سے چلایا گیا تھا اور جس نے پاکستان اور بھارت کے درمیان امن کے اس عمل سے اسے پرے دھکیل کر رکھ دیا تھا جو ویسے ہی بے نتیجہ نظر آ رہا تھا۔

لشکر امن مذاکرات / عمل کو تو اختتام پذیر کرنے میں کامیاب ہو گیا، مگر پاکستان

کو مستقبل کی منصوبہ بندی کے حوالے سے ورطہ حیرت میں چھوڑ گیا۔ ممبئی واقعے نے یہ واضح کر کے رکھ دیا تھا کہ یا تو لشکر کو کسی مفید کام پر لگانے کی ضرورت تھی یا پھر انہیں مستقبل میں کسی بھی ناخوشگوار صورتحال کا مقابلہ کرنے پر تیار رہنا چاہیے۔ چنانچہ یہ امر کوئی اتنا حیران کن نہیں تھا جب افغانستان میں لشکر کی بڑھتی ہوئی موجودگی کا ثبوت نمایاں طور پر سامنے آنے لگا۔ اس پر 2010 کی بہار میں کابل شہر کے مرکز میں واقع ان دو گیسٹ ہاؤسز پر خودکش حملوں سمیت جہاں پر بھارتی شہریوں کا اکثر آنا جانا ہوتا تھا، بھارتی عہدیداروں اور بحالی کا کام کرنے والے کارکنوں پر دیگر بے شمار حملوں کا الزام بھی عائد کیا گیا تھا۔ اسی طرح مشرقی افغانستان میں امریکی فوجیوں کو بھی لشکر کے جہادیوں کا سامنا کرنا پڑا تھا، جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ حقانی نیٹ ورک کے شانہ بشانہ کاروائیاں کر رہے تھے۔ لشکر کو ایک اور ممبئی کی منصوبہ بندی جیسے کام سے دور رکھنے کا اس سے بہتر اور کیا طریقہ ہوسکتا تھا کہ انہیں ڈیورنڈ لائن کے اس طرف موجود بھارتی شہریوں/شخصیات سے ٹکرا دیا جائے؟ اس طرح پاکستان کو ایک انتہائی نمایاں متبادل پر غور کرنے کی ضرورت سے بھی نجات مل گئی تھی: یعنی کشمیر میں جہادیوں کے سرایت کر جانے کے عمل کی از سر نو بھرپور حمایت۔

جیسا کہ معاملات چل رہے تھے، کشمیر میں بھارت کو جہادیوں کی عدم موجودگی میں بھی بڑھتی ہوئی مشکلات کا سامنا تھا۔ نائین الیون کے حملوں کو فوری بعد آنے والے برسوں کے دوران وادی میں نسبتاً سکون سا چھا گیا تھا کیونکہ جنگ سے اکتائے ہوئے کشمیری اپنے طور پر پسپا ہونے لگے تھے۔ مگر 2008 کی گرمیوں میں یہ سب کچھ اس وقت تبدیل ہونا شروع گیا جب بھارتی حکومت کے اس فیصلے کے خلاف بڑے پیمانے پر احتجاج شروع ہوگیا جس کے تحت کشمیر میں سو ایکڑ پر مشتمل قطعہ زمین کو ایک ایسی ہندو تنظیم کے نام منتقل کر دیا گیا جسے ایک مقامی مزار کے زائرین کے قیام کے لئے اس کی ضرورت تھی۔ اس سلسلے میں نکلنے والا سب سے بڑا احتجاجی جلوس 5 لاکھ افراد پر مشتمل تھا جس کے دوران سیکیورٹی فورسز سے ہونے والے تصادموں کے نتیجے میں درجنوں افراد ہلاک ہوگئے تھے۔ یہ احتجاجی مظاہرے اگلی گرمیوں میں اس فیصلے کے بعد بھی جاری رہے جس کے تحت بھارتی تفتیشی اداروں نے مقامی پولیس کو دو کشمیری خواتین کی عصمت دری اور بعد ازاں ہلاکت کے الزام سے بری کر دیا تھا۔ 2010 کی گرمیوں میں صورت حال اور بھی خراب ہوگئی جب ہزاروں کی تعداد میں کشمیری عوام نے بھارتی بالادستی/راج کے خلاف مظاہروں پر

مظاہرے شروع کر دیئے تھے۔ اکثر جلوسوں میں جو شیلے نوجوان پتھراؤ کرتے نظر آتے تھے، جن میں سو سے زائد اس وقت ہلاک ہو گئے جب بھارتی پیرا ملٹری فورسز نے آتشیں اسلحہ استعمال کرنے والے ہجوموں پر فائرنگ کر دی تھی۔ کشمیر میں انتفاضہ کی لہر دوبارہ اٹھ کھڑے ہونے سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ کشمیر کے مسلمانوں کی اکثریت بھرپور طریقے سے بھارتی بالادستی کی مخالفت پر تلی ہوئی ہے۔ اس کا ایک ثبوت 2009 کی خزاں میں چھٹم ہاؤس میں ہونے والی رائے شماری سے ملتا تھا۔ وادی کشمیر میں شامل مختلف اضلاع میں بھارت سے آزادی کے حق میں رائے دینے والے لوگوں کا تناسب 74 فی صد سے لے کر 98 فی صد کے درمیان تھا۔ انکار کرنے والوں کی اکثریت مفروضہ طور پر شیر کشمیر کے پوتے عمر عبداللہ کی بھارت نواز سانجھی حکومت کے حمایتیوں پر مشتمل تھی۔

اس رائے شماری کا ایک اور دلچسپ نتیجہ اس حقیقت کے طور پر سامنے آیا جس کے مطابق کسی بھی ضلع میں کشمیر کے پاکستان کے ساتھ الحاق کے حق میں رائے دینے والوں کا تناسب 7 فی صد سے زیادہ نہیں تھا۔ بہت سے کشمیری اس امر سے آگاہ تھے کہ ان کے مسلمان ہمسایہ ملک کے اندرونی حالات کیا رخ اختیار کیے ہوئے تھے؛ یعنی شدید غربت، اندھادھند جاگیردارانہ طرز حکومت کے ساتھ ہی فوجی آمریت، دندناتی ہوئی انتہا پسند مذہبی طاقتیں، اور یہ سب کچھ ان کے نزدیک کوئی پسندیدہ صورت حال نہیں تھی۔ اور وہ پاکستان کی طرف سے جہادیوں کی طرف سے تشدد کی کارروائیاں مسئلہ کشمیر کے حوالے سے مثبت اثرات کی حامل ثابت ہوئی ہیں۔ سیدھی سادھی حقیقت تو یہ ہے کہ پاکستان جو مرضی کر لے مگر اسے بھارت کی طرف سے کشمیر کے معاملے پر اس سے زیادہ رعایت نہیں مل سکتی جتنی کہ اسے 2007 کے ان مذاکرات کی میز پر پیش کی گئی تھی جو کامیابی سے ہمکنار ہونے لگے تھے۔ سوال محض یہ ہے کہ آیا وہ کبھی اس مقصد کے حصول کے قریب بھی پہنچ سکے گا۔ پاکستان کے مقتدر سیاسی حلقوں کی اکثریت مسلسل یہی خواب دیکھتی رہتی ہے کہ کشمیر پاکستان کا حصہ بن گیا ہے، باوجود اس حقیقت کے کہ خود کشمیریوں کی اکثریت اس نظریئے کی مخالف ہے۔ پاکستانیوں کے اس طرز عمل کے پس پردہ جو جذبہ ابھی تک کارفرما ہے، اور اس کے جو غیر مطلوبہ نتائج نکلتے چلے آ رہے ہیں، اس کا ادراک مجھے 2010 کی بہار میں ایک معروف اور بہت اعلیٰ عہدے پر فائز رہنے والے سابقہ پاکستانی عہدیدار سے ملاقات کے دوران ہوا۔ اس وقت جو کہ مجھے ایک لمحہ غفلت کی طرح محسوس ہو رہا تھا، اس مقامی پنجابی سابقہ افسر اعلیٰ نے جس کے فوج

کے ساتھ قریبی روابط تھے مجھے انتہائی سرکش لہجے میں بتایا کہ پاکستان اس وقت تک کشمیر میں مصروف عمل جہادی تنظیموں کے خلاف کاروائی نہیں کرے گا جب تک کہ وہ کشمیر کے مسئلے کا کوئی تسلی بخش حل نہیں پا لیتا۔

یہ یقیناً ایک ایسا طرز عمل ہے جس کے باعث دو جنوبی ایشائی طاقتوں کے درمیان تعلقات مسلسل تناؤ کا شکار ہیں۔ پاکستان نے، ہوسکتا ہے، لشکر طیبہ کو عارضی طور پر افغانستان کا فریضہ تفویض کر دیا ہو، مگر وہ کسی بھی وقت کشمیر کے اندر جہادیوں کے داخلے کی بھرپور حمایت کا دوبارہ فیصلہ کر سکتے ہیں، خاص طور پر اس صورت میں جب کہ بھارت کے ساتھ تعلقات میں بھی کوئی خاص بہتری نظر نہیں آتی۔ اس امر کی ایک اہم وجہ کہ ممبئی کے واقعے کے باوجود اب تک ایسا کیوں نہیں کیا گیا، امریکہ کی طرف سے پڑنے والا مسلسل دباؤ ہے۔ کشمیر میں جہادیوں کے سرایت کر جانے کے عمل کی بھرپور حمایت سے باز رہنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ پاکستان امریکہ کو خوش رکھنا چاہتا ہے۔ اگرچہ اس کی کوشش غالباً یہ ہوگی کہ لشکر کی توجہ ادھر ادھر مبذول رکھنے کے ساتھ اس کی سرگرمیوں کی بھرپور نگرانی کی جائے، مگر انہیں اس سے زیادہ کامیابی نہیں ہوسکتی جتنی کہ ممبئی سے قبل حاصل تھی۔ میں نے قبل ازیں اس باب میں فوج کے جس اعلیٰ عہدیدار کا حوالہ دیا ہے، اس نے مجھے بتایا تھا کہ آئی ایس آئی کے پاس اتنے وسائل نہیں ہیں کہ وہ لشکر کی تمام توانائیاں اور وسائل قبائلی علاقوں پر صرف ہو رہے تھے۔ بدقسمتی سے ممبئی جیسے واقعے کی کسی بھی وقت تکرار ایک ایسے بحران کو جنم دے سکتی ہے جس کے باعث فوج مجبور ہو کر اپنے جوانوں کو دوبارہ بھارتی سرحدوں پر تعینات کر سکتی ہے اور نتیجہ پاکستان اور بھارت کے درمیان ایک اور جنگ کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ کیونکہ بھارت آخر کس حد تک برداشت کر سکتا ہے؟ بھارت جنگ کا آغاز آزاد کشمیر میں لشکر کے مشکوک تربیتی مراکز پر فضائی حملوں کے ذریعے بھی کر سکتا ہے۔ اگرچہ امریکہ اس بحران کے خاتمے کے لئے بھرپور کوششیں کرے گا، تاہم بدترین امکانی صورت حال میں واقعات قابو سے باہر بھی ہوسکتے ہیں۔ لائن آف کنٹرول کے ساتھ ساتھ پتھریلے پہاڑی راستوں پر غیر فیصلہ کن قسم کی بڑی لڑائیوں کا نتیجہ جنوب کی طرف وسیع تر پنجابی میدانوں میں خودکار ہتھیاروں سے لڑی جانے والی جنگ کی صورت میں بھی نکل سکتا ہے۔ اگر بہت زیادہ تعداد میں بھارتی ٹینک ڈویژن پاکستانی دفاع کا حصار توڑنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں تو ایسی صورت میں پاکستان کے

پاس مجبوراً صرف دو ہی راستے رہ جائیں گے؛ یا تو ذلت آمیز شکست قبول کر لے یا پھر غصے میں آ کر ایٹمی اسلحے کے استعمال میں پہل کر ڈالے جس کی ناگاساکی کے زمانے سے اب تک کوئی مثال نہیں ملتی۔

یہ ہیں تباہی کے وہ چند ایک مناظر جن سے لشکرِ طیبہ پاکستان اور خطے کو مستقبل میں دوچار کر سکتا ہے، چاہے وہ ریاست کی مخالفت میں اپنے طور پر کوئی کارروائی نہ بھی کرے۔ اس کی طرف سے ایسا نہ کرنے کی ایک اہم وجہ یہ بھی ہے کہ پاکستانی عوام اس کے بھارت مخالف موقف کی حمایت کرتے چلے آ رہے ہیں اگرچہ اس کی سرگرمیوں کو محدود تر کر دینے یا ان کا رخ موڑ دینے کی کوششیں بھی ساتھ ساتھ جاری ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ لشکر کو بھی اس امر کا احساس ہو کہ پاکستان طاقت کے مظاہرے سے اتنا کیوں ہچکچا رہا ہے۔ یہ امر یقیناً واضح نہیں ہے کہ صورت حال کا کیا نتیجہ برآمد ہوگا۔ کم سے کم بھی یہ کہ اگر لشکر ریاست مخالف سرگرمیوں پر اتر آتا ہے تو اسے زیرِ زمین جانا پڑے گا۔ حافظ سعید اینڈ کمپنی کو اپنے مرید کے والے مرکز سے محروم ہونا پڑے گا، ان خیراتی و فلاحی سرگرمیوں کو ترک کرنا پڑے گا جن کے نتیجے میں اسے پاکستان میں کچھ نہ کچھ حقیقی عزت و احترام حاصل ہوا ہے، اور اس کے ساتھ ہی آزاد کشمیر میں اپنے بے شمار تربیتی کیمپ بھی خالی کرنے پڑیں گے۔ بھارت کے خلاف اس کا جہاد ثانوی اہمیت اختیار کر جائے گا۔ اس طرح کی صورت حال کے نتیجے میں یقیناً قیادت کا بحران یا تعطل بھی پیدا ہو جائے گا۔ تاہم بہت سے مبصرین کا کہنا ہے کہ لشکر اور ریاست کے مابین تصادم ناگزیر ہے۔ لشکر پر تحقیق کرنے والے ایک پاکستانی صحافی نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے حتمی مقاصد نوعیت کے حساب سے عالمگیر ہیں، جو کہ اس کی ہم نژاد وہابی تنظیم القاعدہ سے مماثلت رکھتے ہیں اور بھارت اس کا صرف عارضی اور حکمت عملی پر مبنی ہدف ہے۔ وہ اس نظریئے کا قائل نظر آتا تھا کہ جلد یا بدیر وہ اس نتیجے پر پہنچ جائے گی کہ اس کو اب تک جو کچھ بھی حاصل ہوا ہے، جس کی کہ اسے تمنا تھی، وہ پاکستان کے ساتھ اس کی نرالی یا نوکھی دوستی کا نتیجہ ہے اور وہ ریاست مخالف سرگرمیوں پر آمادہ ہو جائے گی۔

بعض تجزیہ نگاروں کو یقین ہے کہ لشکر اپنے عالمگیر ہدف کے حصول کی جانب پہلے سے ہی رواں دواں ہے اور وقت آنے پر یہ تنظیم القاعدہ سے بھی بڑا خطرہ ثابت ہوسکتی ہے۔ امریکہ کے نیشنل انٹیلی جنس ڈائریکٹر، ڈینس بلیئر نے فروری 2010 میں سینٹ انٹیلی جنس کمیٹی کو بتایا تھا کہ

لشکر نے اپنے یورپین اہداف کا تعین پہلے سے ہی کر رکھا تھا۔ چنانچہ اس طرح سے صورت حال ممبئی سے بھی زیادہ خطرناک رخ اختیار کر سکتی ہے۔ اگر چہ لشکر نے بھارت کے مالیاتی دارلحکومت میں جان بوجھ کر ان ہوٹلوں کو نشانہ بنایا تھا جہاں مغربی ممالک کے باشندوں کا آنا جانا رہتا تھا، تاہم پھر بھی یہ بنیادی طور پر ایک ایسی کاروائی تھی جس کا مقصد بھارتی مفادات پر ضرب لگانا تھا تا کہ اس طرح بھارت کو ذلت کا شکار کیا جا سکے۔ اگر لشکر نے الٹا یورپ یا امریکہ میں لرزہ خیز قسم کی دہشت گرد کاروائیاں شروع کر دی ہوتیں تو مغربی ممالک کا ردّعمل بہت فوری اور شدید ہوتا۔ پاکستان اب زیادہ عرصہ حافظ سعید کو گھر میں نظر بند کر دینے یا پھر قربانی کے چند بکروں کو سزا دینے جیسے جوابی اقدامات کے قابل نہیں رہے گا۔ اس کے پاس اب فیصلہ کن اقدامات کرنے یا پھر امریکہ کے ساتھ تعلقات کے اچانک اور ممکنہ طور پر متشدد اختتام کے سوا بمشکل ہی کوئی اور راستہ رہ گیا ہے۔ لہذا مغربی اہداف پر لشکر کے حملے عملی طور پر ریاست مخالف حملوں کے مساوی ہوں گے۔

اگر لشکر نے ریاست کی مخالف کا فیصلہ کر لیا تو یہ ایک ہیبت ناک دشمن ثابت ہوگا، اور اگر اس نے انتہاء پسند دیوبندیوں اور القاعدہ میں خود اپنے ہی ہم مشرب وہابیوں سے بھی گٹھ جوڑ کر لیا تو مزید ہیبت ناک ثابت ہوگا۔ اگر چہ ہو سکتا ہے کہ لشکر لاہور پر ایک ہی دن میں قبضہ کرنے کے قابل نہ ہو، جیسا کہ آٹھویں باب میں حوالہ دیئے گئے لاہوری صحافی نے یقینی انداز میں کہا تھا، تاہم یہ خاص طور پر ایسی صورت میں اچھے خاصے خطرے کا باعث بن سکتا ہے اگر یہ مبینہ طور پر اپنے بیس ہزار یا اس سے زائد جہادیوں کو متحرک کرنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ کوئی بھی یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا کہ ایسی صورت حال میں واقعات کیا رخ اختیار کریں گے۔ لگتا ہے کہ پنجاب میں بڑے بڑے دہشت گرد واقعات میں ڈرامائی طور پر تیزی سے اضافہ ہوتا چلا جائے گا جن کا مقصد شہری آبادیوں میں خوف وہراس پھیلانے کے ساتھ ہی لوگوں کو مایوسی اور حوصلہ شکنی میں مبتلا کرنا ہوگا۔ چونکہ پنجاب میں سیاسی شخصیات کی بہت فراوانی ہے اس لئے غالب امکان یہ ہے کہ ان سیاسی شخصیات کے ساتھ ساتھ بڑے بڑے حکومتی عہدیداروں کو بھی قتل کرنے کی کوششوں میں تیزی سے اضافہ ہو جائے گا جس کا مقصد شہری جاگیردار طبقے میں خوف وہراس و مایوسی وحوصلہ شکنی پھیلانا ہوگا۔ اس کے بعد اگلا ہدف تھانوں پر حملے اور سرائیکی پٹی اور صوبے کے دوسرے علاقوں میں واقع قصبوں اور شہروں میں سرکاری عمارتوں پر قبضہ کرنا بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ادھر ادھر سے محاصرے

کے بعد کیا پولیس اس قابل رہ جائے گی کہ اس صورت حال سے نمٹ سکے یا پھر وہ راہ فرار اختیار کرے گی جیسا کہ لاہور کے صحافی نے یقینی انداز میں کہا تھا اور یہی کچھ سوات کے قصبوں اور وادیوں میں اکثر پولیس والوں نے کیا تھا۔

اس امر میں کوئی زیادہ شبہ نہیں ہے کہ اگر واقعات قابو سے باہر نکلتے دکھائی دیئے تو حکومت کے سویلین ادارے فوری طور پر فوج کی طرف رجوع کریں گے۔ تاہم یہ امر اتنا واضح نہیں ہے کہ اگر فوج کو پنجاب کے شہری علاقوں میں دہشت گردوں کے تعاقب میں مارا مارا پھرنا پڑا تو اس کا ردعمل یا کارکردگی کیسی رہے گی۔ فوج دریائے سندھ کے دور دراز تک پہلے ہی گنجائش سے زیادہ پھیلی ہوئی ہے۔ جب کہ یہ پنجاب میں اہم کاروائیاں کر رہی ہوگی تو کیا ساتھ ساتھ قبائلی علاقوں اور سوات پر اپنا تسلط برقرار رکھنے علاوہ بھارتی سرحدوں کا بھی مناسب طور پر احاطہ کرنے کے قابل رہ جائے گی؟ اس سوال کے جواب کا واضح طور پر انحصار خطرے کی نوعیت اور خطے کے لئے درکار وسائل کے حجم پر ہے۔ خطرے کی نوعیت اور خطے کے لئے درکار وسائل کے حجم پر ہے۔ ایک مرحلے پر یہ ایک طرح سے اعداد و شمار کا کھیل بن کر رہ جاتا ہے۔ فوج بیک وقت ہر جگہ موجود نہیں رہ سکتی۔ اگر بہت سے بدقماش لوگ بہت سی جگہوں پر بہت سے برے کاموں میں مشغول ہوں تو ایسی صورت میں فوج بھی کچھ نہیں کر سکتی۔ ان حالات میں پاکستان کا کیا ردعمل ہوگا۔ اس کا اندازہ لگانا کوئی مشکل امر نہیں ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ سمجھوتے کی کوششیں کی جائیں جن کے تحت بعض علاقوں میں شریعت کی حکمرانی کی پیش کش بھی کی جائے گی تاکہ طوفان کو مزید آگے بڑھنے سے روکا جا سکے۔ میں چشمِ تصور میں جماعت اسلامی کو ایک ایسے منظر کے حصے کے طور پر دیکھ رہا ہوں جس میں کہ حکام بالا، فوج کے تعاون یا اس کے اکسانے پر جماعت کو جہادی تنظیموں کے مکمل غلبے یا تسلط کی نسبت ایک باوقار متبادل کی حیثیت دے رہے ہیں۔ کیا کوئی ایسا مرحلہ بھی آسکتا ہے جس میں کہ فوج خود ہی پسپائی اختیار کر لے جیسا کہ انقلاب ایران کے دوران شاہ کی گھمنڈی فوج نے کیا تھا؟ فوج پاکستان کا سب سے طاقتور اور پیشہ ور ادارہ ہے، مگر ہر فوج کسی نہ کسی مرحلے پر شکست خوردہ ہو جاتی ہے۔ اہم سوال یہی ہے کہ کیا انتہاء پسند مذہبی قوتیں اتنی مضبوط ہو سکتی ہیں کہ وہ متذکرہ بالا منظر سے ملتی جلتی صورتحال میں متوقع قسم کی کاروائی کرتے ہوئے ریاست پر واقعی قابض ہو جائیں۔

حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کو بھی اصل میں کچھ پتہ نہیں اور نہ ہی کوئی جاننا چاہتا ہے۔ اتنی بری صورت حال میں جیسا کہ پاکستانیوں اور غیر ملکیوں کو دکھائی دے رہی ہے، اور جتنی بدتر اصل میں ہے، یہ قوتیں ابھی تک کسی لحاظ سے کبھی اس قابل نہیں ہوئی کہ واقعی ریاستی اقتدار کی امیدوار بن سکیں۔ لشکر طیبہ کے اندر اس رجحان کا فقدان ہے جبکہ شدت پسند دیو بندی تنظیموں میں اتنی طاقت ہی نہیں ہے۔ مگر یہ صورت حال صرف موجودہ وقت کے لئے ہے۔ آنے والے برسوں بلکہ عشروں میں کیا ہوگا اگر یہ قوتیں اسی طرح بغیر کسی ریاستی مزاحمت کے پروان چڑھتی رہیں؟ بونیر کی ذلت سے دوچار ہونے کے بعد پاکستانی حکام اگرچہ پاکستانی طالبان کے عزائم کی راہ میں عارضی طور پر حائل ہونے میں کامیاب ہو گئے تھے مگر شدت پسندوں کی ان مساجد اور مدارس کو پھیلنے سے روکنے کے لئے کچھ نہیں کیا گیا جہاں سے انتہا پسند دیوبندی تنظیموں کے لئے افرادی قوت فراہم کی جاتی ہے۔ میرے ایک اچھے خاصے واقف کار ریٹائرڈ فوجی افسر نے، وہی شخص جس کی پشتون اور پنجابی طالبان کے بڑھتے ہوئے گٹھ جوڑ پر تفکرات کا حوالہ پہلے دیا جا چکا ہے، مجھے بتایا کہ اس نے مشرف کی طرف سے برپا کی گئی فوجی بغاوت کے تھوڑے ہی عرصے بعد فوج کے ہیڈ کوارٹرز کے دورہ کیا تھا اور فوج کے اعلیٰ درجے کی قیادت کے سامنے بالکل یہی موضوع اٹھایا تھا۔ اس نے پوچھا تھا کہ آیا شدت پسند اسلامی تنظیموں کی طرف سے منڈلاتا ہوا خطرہ گزشتہ پانچ برسوں کے دوران مزید شدت اختیار نہیں کر گیا تھا۔ انہوں نے اعتراف کیا کہ ایسا ہی ہوا تھا۔ اس کا اگلا سوال یہ تھا کہ پھر اس حوالے سے کوئی اقدام کیوں نہیں کیا گیا تھا؟ ان کا جواب یہ تھا کہ یہ بہت مشکل کام تھا اور پھر اس کے لئے مطلوبہ وسائل بھی دستیاب نہیں تھے۔

ہوسکتا ہے کہ ایسا ہی ہو۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فوج نے کم از کم اس مسئلے پر غور ہی نہیں کیا۔ مشرف کی طرف سے بغاوت کے کئی ماہ بعد، میری ملاقات ایک اور سابقہ اعلیٰ فوجی عہدیدار سے ہوئی، ایک ایسی شخصیت سے جو کم از کم بلاشک وشبہ یہ ادراک رکھتا تھا کہ وہ کس موضوع پر گفتگو کر رہا تھا، جس نے مجھے بتایا کہ نواز شریف نے بطور وزیر اعظم اپنے دوسرے دور اقتدار کے دوران فوج سے کہا تھا کہ وہ شدت پسند تنظیموں کو غیر فعال بنانے کے لئے کوئی ہنگامی منصوبہ تیار کرے۔ اس جنرل کے بقول بعد ازاں جو منصوبہ منظر عام پر آیا اس میں فوج کے منتخب کردہ یونٹوں کو خصوصی تربیت دینے کی تجویز بھی شامل تھی۔ وہ اس سلسلے میں مزید کچھ کہنے کے لئے

تیار نہیں تھا مگر اس کی باتوں سے یہ گہرا تاثر چھلکتا نظر آتا تھا کہ وہ ''نائٹ آف دالانگ نائیوز'' جیسے کسی منصوبے کی طرف اشارہ کر رہا تھا جس کے مطابق فوج کے کمانڈو ایک ہی ہلے میں بڑی بڑی تنظیموں کے قائدین کو اچانک کاروائی کر کے جان سے مار دیتے، اس منصوبے پر، یقیناً کبھی عملدرآمد نہیں ہوا اور غالباً فوج کے صدر دفاتر میں کسی طاقچے میں پڑا دھول کی نذر ہو رہا ہوگا۔ بہر حال اب ایک مدت ہوئی کہ اس پر عملدرآمد کا وقت گزر چکا ہے کیونکہ بہت سی شدت پسند دیو بندی تنظیموں کے قائد اب روپوش ہو چکے ہیں اور ان کی اکثریت نے پاکستانی طالبان کے پاس پناہ لے لی ہے۔ جو ابھی تک پنجاب کے اندر ہی موجود ہیں انہیں تلاش کرنے کے لئے بھی مخبری اور پولیس کے ایک وسیع نظام کی ضرورت ہے، جن دونوں شعبوں میں وسائل کا فقدان پایا جاتا ہے۔ جیسا کہ پہلے یہ نکتہ اجاگر کیا جا چکا ہے، فوج کے مخبری کے نظام کا زیادہ تر حصہ قبائلی علاقوں کے لئے مخصوص کر دیا گیا تھا اور اس وجہ سے اگرچہ اسے اس حوالے سے مزید ذمہ داریاں بھی سونپ دی جائیں تو پھر بھی اس کے پاس وسائل کا فقدان رہے گا۔ اس حقیقت سے آگاہی بھی کسی طرح سے فائدہ مند نہیں نظر آتی کہ پنجابی طالبان نے آئی ایس آئی کو مخصوص سلوک کا نشانہ بنانے کیلئے چن کر الگ کر دیا ہے جس کا ثبوت لاہور میں آئی ایس آئی کے صدر دفتر اور اس کے دفاتر کو نقصان پہنچانے والی مثالوں سے ملتا ہے۔

طویل عرصہ میں شاید اس سے بھی زیادہ پریشان کن حقیقت شدت پسند نظریات کا پرچار کرنے والی مساجد اور مدارس کی تعداد میں کسی روک تھام کے بغیر تیزی سے ہونے والا اضافہ ہے۔ 2010 کی بہار میں پاکستان کے وزیر داخلہ نے اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ ملک کے اندر مدارس کی تعداد بڑھ کر بیس ہزار سے زائد ہو چکی تھی۔ اس کے اعتراف کے مطابق، ان میں سے تقریباً آدھے، یعنی 44 فی صد مدارس سرائیکی پٹی کے اندر واقع تھے۔ اگرچہ ان میں سے اکثر مدارس شدت پسند دیو بندی تنظیموں کے لئے افرادی قوت کا ماخذ نہیں ہوں گے، تاہم یہاں شدت پسند مدارس کی تعداد غالباً ملک کے باقی علاقوں کی نسبت کافی زیادہ ہے۔ پنجابی طالبان کے برعکس، جو کہ زیر زمین چلے گئے ہیں، یہ مساجد اور مدارس اپنی سرگرمیاں کھلے عام جاری رکھے ہوئے ہیں اور عوام کے لئے ان کے دروازے ہر وقت کھلے ہوئے ہیں۔ کاروائی کی راہ میں صرف خوف حائل ہے۔ جیسا کہ فوج میں میرے جاننے والے ایک سابقہ اعلیٰ عہدیدار نے بتایا تھا کہ

حکومت ان کے خلاف کسی قسم کی کاروائی سے اس لئے بھی گریزاں ہے کیونکہ اسے خدشہ ہے کہ لال مسجد جیسے مزید واقعات سامنے آسکتے ہیں۔ اس طرح کا ایک تجزیہ ہی انتہائی تلخ ثابت ہوا تھا، مگر ایسی صورت میں کیا ہوگا اگر حکام بالا نے درجنوں بلکہ سینکڑوں اور مدرسے بند کرنے کی کوشش کی؟ یہ ایک اور سوال ہے، جس کا جواب دینے کے لئے کوئی بھی بے تاب نہیں ہے۔ لہذا، رجحان ایک مرتبہ بھی یہی نظر آتا ہے کہ فی الحال تصادم سے گریز کیا جائے اور جوں توں کوئی راستہ نکالنے کی کوشش جاری رکھی جائے۔ مگر جتنا عرصہ تک کچھ نہ کرنے کی حکمت عملی اختیار کی جاتی رہے گی مسئلہ اتنا ہی پیچیدہ ہوتا چلا جائے گا۔ پاکستان کی افزائش کے نمایاں ہوتے ہوئے آثار پہلے ہی پریشانی اور فکر کا باعث ہیں۔ مجھے ستمبر2009 میں پاکستان کے ایک انگریزی روزنامے ''ڈیلی ٹائمز'' میں چھپنے والے ایک ایسے اداریے نے خاص طور پر حیران و پریشان کر کے رکھ دیا جس میں اس نکتے پر زور دیا گیا تھا کہ اسلام آباد کے شہری علاقوں میں رہنے والے غریب طبقے کے افراد طالبانی نظریات سے متاثر ہو چکے ہیں اور ان کی اکثریت کو اس راہ پر، بلاشبہ، انہی مساجد نے ڈالا ہے اگر یہ سب اسلام آباد میں ہو رہا ہے تو پھر اس کا مطلب ہے کہ باقی جگہوں پر بھی یہی کچھ ہو رہا ہوگا۔ اس امر کی تصدیق پاکستان کے معاملات پر نگاہ رکھنے والے ایک بہت ہی تجربہ کار شخص اناطول لیون کی طرف بھی کی گئی ہے جس نے2009 میں سرائیکی پٹی اور پنجاب کے دوسرے علاقوں کے اپنے سفر کے دوران شہری علاقوں کے غریب طبقے میں اسی طرح کے طرز عمل/رجحان کی نشاندہی کی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ ان بے یارومددگار لوگوں کی اکثریت نے کسی شدت پسند تنظیم میں شمولیت اختیار نہ کی ہو، تاہم یہ امکانی طور پر وہ چلتا پھرتا ہجوم ہے جو ملک کو بھی ایرانی انقلاب کے راستے پر ڈگمگاتے دیکھ کر سڑکوں پر نکل سکتا ہے۔

جیسے جیسے2010 اختتام کے قریب آ رہا تھا، تو ایک نئے رجحان نے پاکستان میں مذہبی شدت پسندی کی انتہاء کے حوالے سے مزید تفکرات کو جنم دینا شروع کر دیا۔ یہ رجحان تیزی سے ابھرتی ہوئی اس تحریک کی شکل میں سامنے آیا جو کہ روایتی طور پر روادار بریلوی علماء کی طرف سے مذہبی بے حرمتی/توہین رسالت سے متعلق ضیاء دور کے ان سخت گیر قوانین میں مجوزہ ترامیم کے خلاف شروع کی گئی تھی جن کو زرداری حکومت نے زیرغور لانے کا کام شروع کر دیا تھا۔ جیسا کہ ہم نے آٹھویں باب میں ملاحظہ کیا تھا، پنجاب کے گورنر اور ان ترامیم کے ایک پرجوش حامی، سلمان

تاثیر کو 2011 کے اوائل میں اس کے اپنے ہی حفاظتی دستے میں شامل بریلوی عقیدے کے پیروکار محافظ نے قتل کر دیا تھا، اور اس نے بعد ازاں اعتراف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اسنے یہ کام مذہبی محرکات کے تحت کیا تھا۔ اس قتل کی بعد میں بریلوی فرقے کے معروف علماء نے ستائش بھی کی تھی اور ملک کی سب سے بڑی بریلوی تنظیم نے اسے جائز قرار دے دیا تھا۔ مگر اس فعل کی حمایت صرف بریلوی علماء کی طرف سے ہی نہیں کی گئی تھی۔ اسلام آباد کی عدالت میں جہاں مجرم کو پیش کیا گیا تھا، وکیلوں کی طرف سے اس کے راستے میں پھولوں کی پتیاں بچھا دی گئی تھیں اور جلوس کی شکل میں اسے عدالت کے اندر لے جایا گیا۔ اس کے علاوہ بظاہر مغربی طرز فکر کے حامل پاکستانیوں کی طرف سے بھی اس قتل کو تحسین کی نگاہ سے دیکھا گیا تھا۔ یہ امر ابھی واضح نہیں ہو سکا کہ اس صورتحال کا پس منظر کیا ہے یا آیا کہ یہ بریلوی طبقے کے اندر بھی رویے میں ایک اہم تبدیلی کے آثار کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ مذہبی جذبات کی بے حرمتی بہت سے مسلمانوں کے لئے بلا کسی فرقہ ورانہ تفریق کے زندگی، موت کا مسئلہ ہے، اور ضروری طور پر بلکہ غالباً بھی اس کا تعلق شدت پسندی یا سیاسی اسلام کے ساتھ نہیں جوڑا جا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ بریلوی علماء اس مسئلے کو ایک ایسے محرک کے طور پر دیکھ رہے ہوں جیسے بروئے کار لاتے ہوئے وہ اپنی صفوں پر زیادہ جارحانہ عزائم رکھنے والے دیوبندی مبلغین کے جاری حملوں کے مقابلے میں اپنے دستوں کے اندر نئی روح پھونکنا چاہتے ہوں۔ محرک کچھ بھی ہو، اس واقعے نے سیکولر خیالات رکھنے والے مقتدر سیاسی حلقوں کو بھونچکا کر کے رکھ دیا جو مذہبی جذبات کی بے حرمتی جیسے اہم مسئلے کے حوالے سے مقبول عام رویوں کی شدت کا اندازہ کرنے میں ناکام ہو گئے تھے۔ اس سے یہی ثابت ہوتا ہے کہ اگر چہ پاکستان میں سیاسی زندگی بظاہر سیکولر اور جاگیردارانہ روایات کی عکاس ہے مگر درحقیقت اس کی تہہ میں دنیا کے کسی بھی اور حصے کی طرح گہری مذہبی روایات پوشیدہ طور پر جڑیں پکڑ چکی ہیں۔ پاکستان میں اگر چہ عملی طور پر جس جنوبی ایشیائی طرز کے صوفی اسلام کی پیروی کی جاتی ہے وہ اتنا ہی روادار ہے جتنا کہ ہمیشہ سے چلا آ رہا ہے، مگر مذہبی جذبات کی بے حرمتی کا معاملہ بہت ہی واضح طور پر یہ حقیقت اجاگر کرتا نظر آتا ہے کہ حتیٰ کہ اس رواداری کی بھی ایک حد ہے۔ کیا عام بریلوی طبقہ اس چلتے پھرتے قابل متحرک ہجوم پر مشتمل ہے جسے کسی آنے والے وقت میں مذہبی شدت پسندی پر مبنی حل کے طور پر تیار کیا جا سکتا ہو؟ اصل خطرہ یہ ہے کہ کہیں بریلوی طبقے کی رہنمائی کرنے والے پیر

بھی اس راستے پر چلنے کا فیصلہ نہ کر لیں۔ مذہبی جذبات کی بے حرمتی سے متعلق قوانین میں ترمیم کی مخالفت اگرچہ تشدد کی حد تک ہی سہی، ابھی شدت پسندی کی راہ سے بہت دور نظر آنے والے جذبے کی عکاسی کرتی ہے۔ تاہم یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ اگر بریلوی طبقے نے کبھی وسیع پیمانے پر جاری تشدد کی لہر میں شامل ہونے کا فیصلہ کر لیا تو پاکستان ایک سیکولر ریاست کے طور پر، بلکہ شاید ریاست کی کسی بھی شکل کے طور پر اپنا وجود برقرار نہیں رکھ سکے گا۔

چنانچہ اس ساری صورتحال کا انجام کیا ہوگا؟ کیا جب متعلقہ حکام اس نتیجے پر پہنچ جائیں گے کہ اب وقت آ گیا ہے کہ فیصلہ کن کارروائی کر دی جائے تو پنجاب بھی بونیر والی صورت حال کا شکار ہو جائے گا یا پھر حالات و واقعات کو اس طرح کا رخ اختیار کرنے دیا جائے گا جس کا نقشہ میں نے اس باب کے شروع میں کھینچا ہے، جس کے مطابق پنجاب بتدریج مگر ناگزیر طور پر ایک اور سوات کی شکل اختیار کرتا نظر آ رہا ہے؟ صورت حال کا منطقی نتیجہ تو یہی نظر آتا ہے کہ مستقبل قریب میں کوئی خاص اقدامات نہیں کیے جائیں گے۔ حالات خراب ضرور ہیں مگر ابھی شدید بگاڑ تک نہیں پہنچے۔ پنجابی طالبان ایک خاص حد تک تو تباہی اور غارت گری پھیلا سکتے ہیں، مگر ریاستی اقتدار تک رسائی نہیں حاصل کر سکتے۔ انتہاء پسندوں کی مساجد اور مدارس جہاں سے یہ جہادی کثیر تعداد میں برآمد ہو رہے ہیں، لال مسجد کے واقعے سے سبق سیکھ چکے ہیں اور ان کی سرگرمیوں کی نگرانی بھی کی جا رہی ہے۔ لشکر طیبہ ابھی تک ریاست کی مخالفت پر نہیں آئی۔ قبائلی علاقوں اور سوات میں بھی صورت حال پہلے سے بہتر نظر آتی ہے۔ پاکستانی طالبان کو ان کے بہت سے محفوظ ٹھکانوں سے باہر دھکیلا جا چکا ہے، اور اگرچہ ان کے مکمل خاتمے کے ابھی کوئی آثار نظر نہیں آتے، تاہم اب وہ کسی فوری خطرے کی صورت ایسے نہیں منڈلا رہے جیسے پہلے منڈلاتے نظر آتے تھے۔ ایسی صورت میں فیصلہ سازوں کو خطرے کا بگل بمشکل ہی سنائی دے گا جو کہ مصیبت کے سر پر نازل ہونے سے قبل کسی قسم کی کارروائی سے گریز کرنے کے عادی ہیں۔

اگرچہ حکومت پنجاب میں کسی قسم کی لڑائی کرنے سے گریزاں نظر آتی ہے مگر حالات کو درست سمت میں ڈالنے اور یوم حساب کو نزدیک آنے سے روکنے کے بہت سے اور طریقے بھی موجود ہیں۔ جاگیردار سیاست دان جو ملکی نظام کو چلانے کی اداکاری کرتے نظر آتے ہیں خود اپنے ہی طبقے پر محصولات عائد کرنے کے عمل کا آغاز کر کے مدرسوں کے متبادل کے طور پر سرکاری شعبے

میں تعلیم کی اصلاح کے لئے ہنگامی بنیادوں پر منصوبوں کی تکمیل کے لئے وسائل اکٹھے کر سکتے تھے۔ افرادی قوت کی بہتری کے لئے پہلے سے زیادہ سرمایہ کاری بھی معیشت کو جدید خطوط پر استوار کرنے اور وباء کی طرح پھیلتی ہوئی اس غربت میں خاطر خواہ کمی لانے میں معاون ثابت ہوتی جو کہ بہت سے غریب و نادار افراد کے لئے شدت پسندی ایک بہت پر کشش متبادل بنا کر رکھ دیتی ہے۔ یہ، بلاشبہ طویل المیعاد حکمت عملیاں ہیں اور ان کے نتائج برآمد ہونے میں کئی برس، اور شاید کئی عشرے لگ جائیں گے۔ تاہم اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کیونکہ پاکستان اس طرح کا کوئی کام بھی نہیں کرے گا۔ وہ کم سے کم پولیس کو پیشہ ورانہ بنیادوں پر استوار کرنے اور اس کے حجم میں اضافے کے لئے کچھ حقیقی سرمایہ کاری کر سکتے تھے، مگر وہ ایسا بھی اس وقت تک کرتے نظر نہیں آتے جب تک کہ فوج ان پر دباؤ نہ ڈالے۔ جیسا کہ میں نے پہلے اشارہ کیا ہے جاگیردار سیاست دانوں نے سارا کا سارا ملبہ فوج پر ڈالنے کی کوشش کی ہے جو اس بات پر خفا نظر آتی ہے۔ تاہم یہ کہنے کی ضرورت نہیں ہے کہ فوج کو مزید اختیارات اور ذمہ داریاں سونپنے سے، جبکہ اس کے ساتھ ہی اس کی ناراضگی اور غصے میں اضافے کی وجوہات بھی پیدا کی جا رہی ہوں، اس امر کا کوئی خاص امکان نظر نہیں آتا کہ پاکستان میں جمہوریت پھلے پھولے گی۔

پاکستان پہلے ہی اس حد تک پہنچ چکا ہے جہاں حالات کو کم سے کم قلیل مدت کے لئے مزید بگاڑے بغیر پنجاب میں شدت پسند مذہبی قیادت کے خلاف کوئی کاروائی نہیں کی جا سکتی۔ تاہم وہ جتنا عرصہ انتظار کرتا رہے گا حالات امکانی طور پر اتنے خراب ہوتے چلے جائیں گے۔ اگر شدت پسندوں کی مساجد اور مدارس کو مناسب حد کے اندر اندر بند کرنے کے عمل کا آغاز نہیں کیا جاتا تو پھر ہو سکتا ہے کہ اسے پنجاب کے بڑے شہروں میں شدت پسند دیو بندیوں اور آخر کار لشکر طیبہ کے خلاف بھی کاروائی کرنی پڑ جائے۔ تاہم سنجیدہ مسائل سے پہلوتہی کرنے کے رجحان کے پیش نظر اس حوالے سے کوئی امید کرنا مشکل نظر آتا ہے کہ جلد ہی کوئی قدم اٹھایا جائے گا۔ تاہم اگر کوئی قدم نہیں بھی اٹھایا جاتا تو پھر بھی مجھے شبہ ہے کہ جب ملک کے اندر دہشت گردی کے واقعات ناقابل برداشت حدوں کو چھونے لگیں گے یا دہشت گرد تنظیمیں عمارتوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیں گی تو پنجاب میں آخر کار بونیر والی صورت حال پیدا ہو جائے گی۔ اگر جلد نہ کہ بدیر یہ صورت حال پیدا ہو جائے اور شدت پسند مذہبی عناصر اپنی حدود سے آگے بڑھنے لگیں جیسا کہ بونیر میں ہوا تھا تو

یہ دراصل پاکستان کے لئے خوشی کا باعث نہیں ہوگا۔ ان طاقتوں کو جتنا زیادہ عرصہ خود خود کو مستحکم کرنے کا موقع ملتا رہے گا، وہ اتنی زیادہ دہشت ناک آزمائش بنتی چلی جائیں گی۔ اور اگر پاکستان کسی وقت ان کے خلاف کچھ کرنے پر بھی آمادہ ہو جائے تو کوئی فیصلہ کن نتیجہ برآمد نہیں ہوگا۔ حکومت بڑی آسانی سے طوالت پکڑتے ہوئے ایسے تصادم میں دھنس سکتی ہے جس کے نتیجے میں بہت زیادہ تباہی اور مصیبت کا سامنا تو کرنا پڑ جائے مگر کوئی حتمی فتح حاصل نہ کر سکے۔

کیا پاکستان پر آخر کار شدت پسند اسلامی قوتیں غالب آجائیں گی؟ میں یہ اعتراف کرنا چاہوں گا کہ مجھے کافی حد تک یہ یقین کرنا ممکن نہیں لگ رہا کہ اصل میں ایسا ہوگا۔ پاکستان کی صورت حال پر گہری نگاہ رکھنے والے اگر تمام نہیں تو اکثر تجربہ کار ماہرین جن سے میں واقف ہوں میری اس رائے سے اتفاق کرتے ہیں۔ آخر یہ کس طرح ممکن ہے کہ 16 کروڑ افراد پر مشتمل قوم جن کی اکثریت ایک نسبتاً روادار، پرامن قسم کے اسلام پر یقین رکھتی ہے بنیاد پرست مذہبی جنونیوں کی ایک محدود سی تعداد سے مغلوب ہو کر رہ جائے؟ فوج یقیناً اس طرح کی صورت حال کی نوبت ہی نہیں آنے دے گی۔ اور پاکستانی ہمیشہ کی طرح اس مشکل سے جوں توں کر کے نکل ہی جائیں گے۔ مگر ہم اس سوال کا جائزہ موجودہ صورتحال کے تناظر میں لے رہے ہیں۔ اب سے پانچ، دس، یا بیس برس بعد صورت حال کافی حد تک مختلف رخ اختیار کر سکتی ہے۔ الجیریا میں اسلامی انتہاء پسندوں کو شکست دے دی گئی تھی، مگر شاہ ایران نے ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ روس نے بالشویک کی محدود تعداد سے شکست مان لی تھی اور جرمنی کو ان قدامت پسندوں نے نازیوں کے حوالے کر دیا تھا جن کا خیال تھا کہ وہ ہٹلر کو بہتر طریقے سے کنٹرول کر سکتے تھے۔ ہر صورت حال اپنی جگہ پر منفرد ہوتی ہے، مگر ماضی کی مثالیں موجود ہیں۔ عقل کا تقاضا یہ ہے کہ ناں کبھی نہ کی جائے۔

جو چیز بہت یقینی نظر آرہی ہے وہ یہ ہے کہ پاکستان طویل عرصہ تک انتہاء پسندوں کی آماجگاہ بنا رہے گا، خواہ پاکستان ان سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے جیسے اقدامات بھی کرتا رہے۔ بونیر کے بعد پیش آنے والے واقعات یہاں بہت کچھ منکشف کرتے نظر آتے ہیں۔ فوج سوات اور جنوبی وزیرستان سے پاکستانی طالبان کا پیچھا کرنے کے قابل تھی، مگر ایک کھوٹے سکے کی طرح وہ ہر وقت کسی اور جگہ آموجود ہوتے ہیں۔ اگر فوج انہیں مکمل طور پر شکست نہیں دے سکتی، جیسا کہ نظر آرہا ہے، تو وہ انہیں کم از کم مسلسل بھاگتے رہنے پر تو مجبور کر سکتی ہے۔ حکومت جب کبھی

بھی پنجاب کے اندر شدت پسندوں کی مساجد اور مدارس کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کرتی ہے یا پھر اسے مجبور ہو کر سرائیکی پٹی کے شہری علاقوں میں پنجابی طالبان کی بڑھتی ہوئی لہر کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وسائل کی قلت کے مسئلے کے پیش نظر یہی لگتا ہے کہ نتیجہ تقریباً تقریباً ویسا ہی برآمد ہوگا۔ اس امر پر یقین کرنے کی بھی کوئی خاص وجہ نہیں ہے کہ پاکستان مستقبل قریب میں ایسی شدت پسند اسلامی تنظیموں کے خلاف کوئی کارروائی کرے گا جن کی وہ ابھی تک حمایت کرتا چلا آ رہا ہے، جن میں افغان طالبان اور لشکر طیبہ سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، پاکستان کو ان تنظیموں کے ساتھ مسلسل روابط استوار رکھنے کے نتیجے میں جس طرح کے بھی خارجہ پالیسی مقاصد حاصل ہونے کی توقع ہو، اسے اتنا ہی یہ خوف بھی لاحق رہتا ہے کہ وہ کہیں اس کے دشمن ہی نہ بن جائیں۔

اس ساری بحث کا ایک ہی ناگزیر نتیجہ برآمد ہوتا ہے: جو کچھ بھی ہو، اس امر کا خاطر خواہ امکان موجود ہے کہ پاکستان آنے والے کئی برسوں بلکہ عشروں تک شدت پسند اسلامی سلطنت کا تقریباً گڑھ ہی بنا رہے گا۔ اس خطرے کے خاتمے کا امکان، یہاں اور دوسری جگہوں پر بھی، صرف اسی صورت میں موجود ہو سکتا ہے جب اسلامی دنیا کے بہت سے علاقوں کو گذشتہ تین عشروں کے زیادہ وقت میں اپنے اثرات کی بدولت مصائب سے دوچار کر کے رکھ دینے والی شدت پسندی بھی اپنے انجام کو پہنچ جائے۔ مگر یہ اور بھی وسیع تر موضوع ہے اور اس کا احاطہ کرنے کے لئے ایک الگ کتاب درکار ہے۔

پاکستانیوں کو اس صورت حال کا اتنا ادراک نہ ہو سکا کہ جب تیس برس قبل انہوں نے مجاہدین کو افغانستان میں بھیجنا شروع کیا تھا تو یہ ان کا مستقبل تھا جو ان کے لئے چشم براہ تھا۔ یہ سچ تھا کہ افغان مجاہدین مذہبی بنیاد پرستی پر یقین رکھتے تھے، مگر ان کا بنیادی ہدف سوویت حملہ آوروں کو اپنے وطن سے دھکیل باہر کرنا تھا۔ وہ دنیا کو جماعت اسلامی کے نقطۂ نظر سے دیکھتے تھے نہ کہ جہادی نقطۂ نظر سے۔ پاکستان سے جو بنیادی غلطی ہوئی وہ یہ تھی کہ وہ ان دونوں کے مابین پائی جانے والی تفریق محسوس نہ کر سکا۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی جب اسامہ بن لادن افغانستان آیا اور اس کی ملا عمر سے دوستی ہو گئی، اور مشاہدے یا صورت حال کے غلط ادراک کی بنیاد پر اسے یہ یقین ہو گیا تھا کہ وہ ان جہادیوں کو اپنے تابع فرمان رکھنے میں کامیاب ہو جائے گا جنہیں دشمن پر جھپٹنے کے

لئے کھلا چھوڑ دیا گیا تھا۔ اگر چہ اس دوران اس نے کچھ سبق سیکھ لئے تھے، مگر یہ نا کافی تھے۔ جب بھارتی پارلیمنٹ کی سیڑھیوں پر، ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے ملبے میں، اور قبائلی علاقوں کے بنجر، نہ بھولنے والے پتھریلے راستوں پر پاکستانی حکمرانوں پر باکمال منصوبے منکشف ہونا شروع ہو گئے تو اسی طرح ایک ڈگمگاتی ہوئی ریاست پر ان کی گرفت بھی کھلنے لگی۔ پاکستان نے برطانوی راج کی بجھتی ہوئی چنگاریوں سے بڑے جوش وخروش اور امیدوں کے مابین جنم لیا تھا۔ تاہم آزادی کے ساٹھ برس سے زیادہ عرصے کے باوجود اس کا وجود تقریباً ایک ایسی ریاست کے طور پر بھی جو اس کے بانی قائداعظم محمد علی جناح کے مطابق جنوبی ایشیا کے مسلمانوں کے لئے ایک سیکولر ریاست ہونی تھی، بہت حد تک خطرے سے دوچار نظر آتا ہے۔ اس کا آغاز نیک ارادوں سے ہوا تھا۔ مگر کوئی بھی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ اس کا انجام کیا ہوگا۔

10

حتمی گرہ کشائی

پاکستان کی شدت پسند اسلامی طاقتیں ابھی تک تو اس قابل نظر نہیں آتیں کہ ریاستی اقتدار کے حصول کے لئے جاگیرداروں اور فوج سے نبرد آزما ہوسکیں، تاہم اگر وہ کسی دن اپنے اس مقصد میں کامیاب ہوگئیں تو پھر کیا ہوگا؟ ایسی صورت میں حالات کیا رخ اختیار کریں گے؟ ایک امر یقینی نظر آتا ہے۔ اگر کسی نے اس صورت حال کی مزاحمت کی کوشش نہ کی تو پاکستان تیزی سے پوری دنیا کے جہادیوں کی جنت بن جائے گا۔ القاعدہ کو نہ صرف منصوبے بنانے اور ان پر عملدرآمد کرنے کے لئے ایک پورا ملک مل جائے گا بلکہ بین الاقوامی ہوائی اڈوں اور بندرگاہوں تک بھی رسائی حاصل ہوجائے گی۔ القاعدہ کی باقی ماندہ قیادت کو پاکستان میں ہی پڑے رہنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ ہاں، یہ بہت برا ہوگا، مگر جو چیز صورت حال کو بدتر بنا کر رکھ دے گی، لامحدود مدت کے لے بدتر، وہ یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے پاس ایٹمی ہتھیار ہیں۔ اگر ایٹم بم جہادیوں کے ہتھے چڑھ گیا تو وہ کیا کریں گے؟

پاکستان کے پاس اس وقت ایٹمی اسلحہ خانے میں سو سے زائد ایٹمی میزائل موجود ہیں۔ ان ہتھیاروں کو، جو کہ ہیروشیما کے برابر تباہی پھیلا سکتے ہیں، ایک سو سولہ طیاروں یا بالسٹک میزائلوں سے بھی چھوڑا جا سکتا ہے، جن میں سب سے زیادہ ہیبت ناک وہ ہے جو 1500 میل کی دوری تک بھی اپنے ہدف کو نشانہ بنا سکتا ہے۔ یوں بھارت کے تمام بڑے شہر نشانے پر آجائیں گے۔ آیا جہادی حقیقت میں ان کو استعمال کرنے کے قابل بھی ہوسکیں گے یا نہیں، یہ ایک الگ داستان ہے۔ ایٹمی ہتھیاروں کو ان کے چلانے والے سسٹم کے ساتھ جوڑنے اور پھر انہیں اپنے

اہداف تک پہنچانے کے لئے اچھی خاصی افرادی قوت اور تکنیکی مہارت کی ضرورت ہوتی ہے۔ پاکستان میں یہ وسائل صرف اور صرف فوج کے پاس ہیں۔ اگر شدت پسندوں کی طرف سے اقتدار پر قبضہ کرنے کی کاروائی یا کوششوں کے دوران پاکستان فوج بکھر یا منتشر ہو کر رہ گئی جیسا کہ ایران کے اسلامی انقلاب کے دوران ایرانی فوج کے ساتھ ہوا تھا، تو عین ممکن ہے کہ صریحاً محدود افادیت کے حامل ایٹمی ہتھیار جہادیوں کے ہتھے چڑھ جائیں۔ یہ غالباً صرف ایک عارضی دھچکہ ہی ہوگا کیونکہ فوج دوبارہ مستحکم ہوسکتی ہے اور اس کی ایٹمی مہارت بھی از سرِ نو تشکیل پا سکتی ہے۔ اس دوران جہادی انفرادی ایٹمی ہتھیار ملک سے باہر نکال لے جانے میں کامیاب ہو کر بھارت اور مغربی ممالک کے لئے مسلسل دردِ سر بنے رہیں گے۔ کسی بھی صورت میں یہ واحد طریقہ ہوگا جس کے ذریعے وہ اس قابل ہوسکیں گے کہ امریکہ پر کسی بھی مناسب وقت کے دوران حملہ کر دیں کیونکہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیار اٹھا کر پھینک دینے کے لئے استعمال ہونے والے ساز و سامان کو اتنی دور نہیں پہنچایا جا سکتا۔

بھارت اتنا خوش قسمت نہیں ہے۔ اگر پاکستانی بری فوج اور فضائیہ شکست خوردگی یا تعطل کا شکار نہ ہوئیں اور جہادی حکومت سے تعاون پر آمادہ ہو گئیں تو بھارت خود کو فوری طور پر خطرے میں گھرا پائے گا۔ امریکہ میں کام کرنے والی نیشنل ریسورسز ڈیفنس کونسل نے مئی 2002 میں جموں میں ہونے والے قتلِ عام کے بعد پیدا ہونے والے جنگی خطرے کے دوران جاری کی گئی ایک تحقیق میں تخمینہ لگایا ہے کہ اگر پاکستان نے بھارت کے پانچ کوئی سے بھی بڑے شہروں پر ہیروشیما جتنی طاقت کے ایٹم بم پھینک دیئے تو 15 لاکھ سے زائد افراد لقمہ اجل اور بیس لاکھ سے زائد زخمی ہو جائیں گے۔ اس منظر کشی سے یہ مفروضہ قائم کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایٹمی اسلحہ زمین سے بہت اوپر فضا میں ہی دھماکے سے پھٹ جانے دیا جائے گا جیسا کہ ہیروشیما میں ہوا تھا۔ تاہم زمین پر پھٹ جانے والا اسلحہ چلانا آسان ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں زیادہ خطرناک تابکاری پیدا ہوتی ہے۔ دوسرے منظر کی رو سے لگائے گئے تخمینے کے مطابق جس میں یہ مفروضہ قائم کیا گیا تھا کہ بھارت کے سات شہروں میں 12 عدد زمین پر پھٹنے والے ایٹم بم چلائے جائیں گے، صورت حال یہ ہوگی کہ ایک کروڑ سے زائد لوگ صرف تابکاری سے ہی ہلاک ہو جائیں گے۔ اس سطح کے حملوں سے بھارت تباہ نہیں ہوگا؛ آبادی کی اکثریت ہلاک ہونے سے بچ جائے گی۔

تاہم اس کے بڑے بڑے شہروں میں کاروباری اور صنعتی مراکز کی تباہی بھارت کو کئی عشروں تک کے لئے ایک پسماندہ اور مفلوک الحال ملک بنائے رکھے گی۔ زیادہ اہداف پر زیادہ بم گرائے جانے کا نتیجہ اور بھی زیادہ مصائب و تکالیف کی صورت میں نکلے گا۔ اس طرح کے تخمینوں کو سامنے رکھتے ہوئے بھارت نے ممبئی کی طرح کے لرزہ خیز واقعات کے بعد بھی خود کو کسی ایسی جنگ کی طرف دھکیلنے سے روکے رکھا ہے۔ حتیٰ کہ بھارت کو یہ بھی نظر آ رہا ہو کہ وہ پاکستان کے ساتھ روایتی جنگ فیصلہ کن طور پر جیت جائے گا تو اس کا آخر کیا فائدہ ہوا اگر پاکستان جوابی کاروائی کے طور پر ایٹمی حملے کر دیتا؟

ایک چیز جو پاکستان میں جہادیوں کے برسر اقتدار آنے والی صورت میں بھارت کو ایٹمی حملے سے محفوظ رکھ سکتی ہے وہ اس ملک کے اندر مسلمانوں کا اچھی خاصی تعداد میں آباد ہونا ہے۔ حتیٰ کہ لشکر طیبہ کو بھی ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں وہاں آباد اپنے مسلمان بھائیوں کو مارنے سے پہلے دو مرتبہ سوچنا پڑے گا۔ آخر ان کا اعلان کردہ ہدف بھارت کے مسلمانوں کو ہندوؤں کے تسلط سے آزاد کرانا ہے نہ کہ جلا کر بھسم کر دینا۔ تاہم حالات و واقعات بڑی آسانی سے قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔ اگر بھارت مزاحمت کا فیصلہ کرتا ہے تو کشمیر کے حوالے سے ایٹمی جنگ کی دھمکی دینی ضروری ہوگی۔ لشکر اس حوالے سے خود کو یوں بھی قائل کر سکتا ہے کہ بھارت میں رہنے والے اس کے ہم مذہب بھائی ایک عظیم مقصد کی راہ میں شہید ہو رہے ہیں۔ آخر اس کی کاروائیوں کا نتیجہ خود پاکستان کے اندر مسلمانوں کی اس سے بھی بڑی تعداد کی ہلاکت کی صورت میں نکلنے کا امکان ہے۔ تاہم اس طرح کے منظر کا حقیقت بننے کے لئے ضروری ہے کہ پاکستانی فوج بھی ان قوتوں کا ساتھ دینے پر تیار ہو اور فوج جانے بوجھے ایٹمی خودکشی کے تصور سے ہی گھبرا اٹھے گی۔

مجھے اس امر پر یقین کرنے میں مشکل پیش آ رہی ہے کہ پاکستانی فوج کسی بھی صورتحال میں جہادیوں کا ساتھ دے گی۔ اگرچہ، بلاشبہ ایسے افسران موجود ہیں جو جہادیوں کے لئے نرم گوشہ رکھتے ہیں، مگر ان کی تعداد اتنی تھوڑی ہے کہ وہ کوئی فیصلہ کن طاقت نہیں بن سکتے۔ فوج کی پاکستان طالبان اور دیگر شدت پسند دیو بندی تنظیموں کے ساتھ جس طرح کی ہمدردیاں بھی رہی ہوں، وہ ساری ہمدردیاں میدان جنگ کے دوران اور ان کی طرف سے کی گئی دہشت گرد کاروائیوں کے نتیجے میں ہونے والی ہلاکتوں کے ساتھ ملیامیٹ ہو کر رہ گئی ہیں۔ اس سے بھی

زیادہ اہم مشکل بلکہ میں کہوں گا ناممکن، یہ یقین کرنا ہے کہ فوج کبھی بھی کسی جہادی حکومت سے احکامات لینے پر رضامند ہوجائے گی۔ وہ لشکرطیبہ کے ساتھ اشتراک عمل پر تو تیار ہوسکتی ہے مگر اس کے اشاروں پر عمل کرنے پر تیار نہیں ہوسکتی۔ فوج خود کو پاکستان کے قومی دفاع کے حوالے سے حتمی فیصلہ ساز تصور کرتی ہے۔ یہ قوم کے مستقبل کے حوالے سے ایسے کوئی فیصلے نہیں ہونے دیتی جو اس کے نزدیک تباہ کن مضمرات کے حامل ہوسکتے ہیں۔ صرف جذبات سے عاری اور جی ہاں، جی ہاں کہنے والے فوجی ہی بڑی مسکینی کا مظاہرہ کرتے ہوئے احکامات بجالاتے ہیں۔ اور یہ پاکستانی فوج ہی ہے جس کا فیصلہ حتمی ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان پر جہادیوں کا موثر غلبہ صرف اسی صورت میں ہوسکتا ہے اگر فوج شکست خوردہ ہوجائے۔

ایک دھندلا یا غیر مبہم پہلو یہ بھی ہے کہ آیا جہادیوں کی طرف سے اقتدار پر قبضے کو روکنے کے حوالے سے جماعت اسلامی کا شدت پسندی پر مبنی نمونہ ایک عارضی متبادل ثابت ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے ضیاء الحق جماعت کے بہت قریب تھا اور فوج کے بہت سے اعلیٰ عہدیدار بشمول آئی ایس آئی کے سابق سربراہ حمید گل بھی ریٹائرمنٹ کے بعد اس کے ساتھ آملے تھے۔ اس حد تک کہ بنیاد پرستی کا رجحان رکھنے والے افسران سیاست کی طرف آجاتے ہیں، یہ لوگ جماعت میں شامل ہوگئے تھے۔ اس تنظیم پر لکھنے والے ایک علمی محقق نے مجھے بتایا تھا کہ اس کے ارکان پر دباؤ ہے کہ وہ زیادہ شدت پسند رویوں کا مظاہرہ کریں۔ اس کی قیادت نے انتہاء پسند دیو بندی تنظیموں کو ملک کے اندر دہشت گرد کاروائیاں کرنے پر تنقید کا نشانہ بنانے سے گریز کیا ہے، اور اس کی بجائے بھارت کو مورد الزام ٹھہرانے یا پھر ایسے سازشی نظریات گھڑنے کو ترجیح دی ہے جن کے مطابق ان کاروائیوں میں بلیک واٹر سیکیورٹی کمپنی کا ہاتھ ہے۔ جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے اس کے نزدیک نائین الیون کے بعد پیش آنے والے ہر برے واقعے کی ذمہ داری امریکہ پر عائد ہوتی ہے۔ تاہم ایک زیادہ شدت پسند جماعت اسلامی کم سے کم ایٹمی خودکشی کے راستے پر چلنے سے گریز کرے گی۔ اس امر میں شک کی زیادہ گنجائش نہیں ہے کہ اس کی پالیسیاں بھارت کے حوالے سے جنگجو آنہ ہوں گی، اور کشمیر پر تصادم کے امکان میں بھی یقینی اضافہ ہوجائے گا۔ تاہم جماعت کو چلانے والے لوگ جنونی نہیں ہیں اور نہ ہی وہ دہشت گردی میں ملوث ہیں اور انہیں روکا بھی جاسکتا ہے۔

امریکہ اور اس کے مغربی حلیفوں کو اصل خطرہ اس صورت میں ہوگا اگر پاکستان میں اقتدار ہٹ دھرم قسم کے اسلامی بنیاد پرستوں کے ہاتھ آ جاتا ہے۔ القاعدہ، شدت پسند دیوبندی تنظیمیں، اور لشکر طیبہ وغیرہ دہشت گردی کے بے شمار واقعات میں ملوث رہی ہیں، اور انہوں نے بہت ہی زیادہ درندگی اور انسانی جانوں کے حوالے سے، بہت ہی بے حسی کا مظاہرہ کیا ہے۔ خودکش اور فدائین حملوں کے رجحان اور ان کے اس عقیدے کے پیش نظر کہ شہادت جہاد کا اصل مقصد ہے اور اس کے نتیجے میں وہ سیدھے جنت میں جا کر دم لیں گے، یہ سوال کم از کم کھل کر سامنے آ جاتا ہے کہ آیا انہیں روکا جا سکتا ہے۔ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ سب سے عظیم خطرہ جو جہادیوں کے اقتدار میں آنے کی صورت میں پیش آ سکتا ہے وہ ایٹمی دہشت گردی کا خطرہ ہے۔ اگر اس طرح کا طبقہ پاکستان میں اچانک برسر اقتدار آ جاتا تو امریکہ کے سامنے صرف ایک ہی ممکن راستہ رہ جائے گا۔ وہ اس طرح کے حملے کا راستہ روکنے کے لئے بہت وسیع پیمانے پر جوابی کارروائی کی دھمکی دے گا، یا پھر یہ تیزی سے حملہ کر سکتا ہے تاکہ پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں پر قبضہ کر لے یا پھر انہیں تباہ کر دے تاکہ انہیں دہشت گرد مقاصد کے لئے استعمال ہونے سے روکا جا سکے۔

یہ افواہیں بھی گردش کر رہی ہیں کہ امریکہ اس طرح کی سپیشل آپریشن فورسز کو پہلے سے ہی تربیت دے رہا ہے جنہیں بحرانی صورت حال میں پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کو اپنے قابو میں کرنے کے مقاصد کے لئے استعمال کیا جا سکے۔ یہ امکان اس پریشانی کے تناظر میں اور بھی زیادہ بڑھتا نظر آ رہا ہے کہ دہشت گرد اس قابل ہو سکتے ہیں کہ فوج کے ان ہمدرد افسروں کی مدد سے جو متعلقہ مواد تک رسائی رکھتے ہیں، ایٹمی ہتھیار اپنے قبضے میں لے لیں۔ تاہم اس پریشانی کی بنیاد محض افواہیں ہیں نہ کہ زمینی حقائق ایٹمی میزائل ایک ایسا قیمتی اثاثہ ہیں جس کی پاکستان میں سب سے زیادہ کڑی نگرانی کی جاتی ہے۔ یہ ریاست کے تاج کا سب سے قیمتی ہیرا ہیں۔ فوج کسی بھی اور چیز کی نسبت اس کی حفاظت پر یقیناً بہت زیادہ وسائل صرف کرتی ہے۔ یہ بات بالکل ناقابل یقین ہے کہ فوج ایٹمی ہتھیار ایسی جگہوں پر چھپا کے رکھے گی جہاں پر دہشت گردی کے حوالے سے کسی بھی قسم کے خطرے کا سوچا جا سکے، یا پھر ایسے فوجیوں/شہری عملے کو اس کے قریب بھی بھٹکنے دے جن پر اسلامی شدت پسندوں کے ساتھ ہمدردی کا ذرا سا بھی شبہ ہو۔

یہ ہے وہ صورت حال جو اس وقت ہمارے سامنے ہے۔ تاہم اگر جہادیوں کے اقتدار

پر قابض ہونے کی صورت میں فوج کے اندر انتشار پھیل گیا، تو پھر امکان ہے کہ موجودہ تمام حفاظتی اقدامات غیر موثر ہو کر رہ جائیں۔ اگر اس وقت یہ فکر پائی جاتی ہے کہ ہوسکتا ہے دہشت گرد کسی ایٹمی ہتھیار پر قبضہ کرلیں یا پھر اس کو چلانے کی دھمکی دے کر کوئی مطالبہ منوالیں یا پھر اسے امریکہ میں کسی جگہ چلانے کی کوشش کر ڈالیں، تو پھر سوچیں کہ اگر جہادی حقیقت میں اسلام آباد پر قبضہ کرلیں تو ایسی صورت میں کس طرح کی پریشانیاں سامنے آسکتی ہیں۔ ایٹمی ہتھیاروں سے لیس ایران کو تو کچھ عرصے کے لئے نظر انداز کیا جاسکتا ہے، مگر ایک جہادی پاکستان کو نظر انداز کرنے کی کوئی گنجائش نظر نہیں آتی۔ یہ تصور کرنا آسان ہے کہ اس طرح کی صورت حال کے پیش نظر امریکہ حملے میں پہل کا فیصلہ کرتے ہوئے اپنے خصوصی تربیت یافتہ کمانڈو دستے، اگر ان کا وجود ہے تو، تعینات کردے گا، یا پھر پاکستان کے ایٹمی ہتھیاروں کا ذخیرہ رکھنے والی عمارت وغیرہ پر بمباری کرنے کی کوشش کرے گا، اگر اس کا سراغ لگایا جاسکا۔ تاہم اگر امریکہ کو یہ یقین ہو بھی گیا کہ پاکستانی ایٹمی ہتھیاروں پر قبضہ کرنے یا ان کا تباہ کرنے کی اس کی کوششیں بڑی حد تک کامیاب رہی ہیں تو پھر بھی اسے یقینی طور پر یہ پتہ نہیں چل سکے گا کہ سارا کا سارا اسلحہ تباہی کی نذر ہو گیا ہے یا نہیں۔ نہ ہی یہ، کسی صورت میں، یہ برداشت کر سکے گا کہ القاعدہ یا اس کے مقصد سے ہمدردی رکھنے والی کسی اور تنظیم کی سربراہی میں بننے والی جہادی حکومت دنیا کے چھٹے بڑے آباد ملک کا انتظام سنبھال لے۔

صورتحال کی نزاکت اس امر کی متقاضی ہوگی کہ امریکہ ملک کو جہادیوں کے چنگل سے آزاد کروانے کی کوشش کرے۔ مگر یہاں مشکل یہ نظر آتی ہے کہ امریکہ کے پاس اتنی بڑی فوج نہیں ہے کہ وہ پاکستان کے حجم کے برابر ملک پر قبضہ کر کے اس پر نظم و نسق برقرار رکھ سکے، جو کہ لازمی طور پر جہادیوں کی کثیر تعداد کے نرغے میں ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ یہ غالباً پاکستانی فوج کے بچے کھچے آثار کو فضائی طاقت کے استعمال سے تباہ کر کے رکھ دے۔ مگر پاکستان کو اسلامی شدت پسندوں کی گرفت سے آزاد کروانے کے لئے اچھی خاصی طاقت کی ضرورت ہوگی۔ ایسی صورت حال میں واضح حکمت عملی یہ ہوگی کہ بھارت کے ساتھ شراکت عمل کی جائے جس کو جہادیوں کو اقتدار سے باہر نکال پھینکنے میں کم سے کم برابر کی دلچسپی تو ضرور ہوگی۔ انڈو۔امریکن اتحاد کے ذریعے آپریشن اینڈیورنگ فریڈم کی طرح کی کاروائی پہلے کی نسبت وسیع پیمانے پر دہرائی جائے گی

جس میں امریکہ فضائی طاقت فراہم کرے گا اور انڈیا وسیع تعداد میں بری فوج فراہم کرے گا۔ یہ کسی طرح سے بھی ایک آسان کام نہیں ہوگا، خاص طور پر جیسا کہ امکان لگتا ہے، اگر جہادی پنجاب اور سندھ کے گنجان آباد شہروں میں روپوش ہو گئے جہاں وہ ایک باغی طاقت کے طور پر دوبارہ مستحکم ہو سکتے ہیں۔ اپنے فوجی دستوں کو تباہ کن ہلاکتوں/نقصان سے بچانے کے لئے بھارتی وحشت ناک قسم کے حربے استعمال کرنے کی طرف بھی مائل ہو سکتے ہیں، مثلاً محاصرہ کرنے کی حکمت عملی یا پھر شہری ماحول میں توپوں کا استعمال جس کے نتیجے میں سویلین آبادی کافی تکلیفوں کا شکار ہو سکتی ہے۔

اس امر کا اندازہ لگانا مشکل ہے کہ بھارتی پاکستان کے اندر کس حد تک گھس آنے کی کوشش کو سکتے ہیں۔ کیا وہ سارے کے سارے ملک پر قبضہ کرنے کی کوشش کریں گے، یا شاید دریائے سندھ تک آ کر رک جائیں گے؟ اس کا زیادہ تر انحصار اس پر ہے کہ اس وقت افغانستان کا کیا نقشہ ہوگا۔ کم سے کم بھی وہ باقی ماندہ جہادی قوتوں کو بھی گھیرا ڈالنے کی کوشش کریں گے اور انہیں سمندر تک فوری رسائی دینے سے انکار کر دیں گے۔ یہ پنجاب، سندھ، اور بلوچستان کے ساحلی علاقوں پر قبضے کے حوالے سے مثبت ثابت ہو سکے گا، جبکہ سندھ کے بالکل ہی پرلی طرف واقع پشتون علاقوں کو ایک طرح سے جہادیوں کے بے نام یا غیر آباد علاقے کے طور پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ جب ایک دفعہ گرد بیٹھ جائے گی تو بھارت اور اس کے امریکی حلیفوں کے سامنے پھر ایک فیصلہ کن سیاسی سوال اٹھ کھڑا ہوگا: پاکستان کے ان علاقوں کا کیا کیا جائے جو ان کے زیر انتظام آ چکے ہوں گے۔ کیا انہیں پاکستان کو سیاسی بنیادوں پر از سر نو تشکیل دینا پڑے گا، سویلین جاگیر داروں کو اقتدار واپس لوٹا کر اور اس کے ساتھ ہی ایک کم معاندانہ پاکستانی فوج کی تشکیل نو کرتے ہوئے؟ یا پھر پاکستان ریاست کی الجھن کو حتمی طور پر سلجھاتے ہوئے مقبوضہ علاقوں کو بھارت کے اندر ضم کرنے کا فیصلہ کر لیں گے؟

یہ حالات کی ایک بہت بڑی ستم ظریفی ہوگی اگر پاکستان کے وجود کا خاتمہ دوبارہ بھارت کے اندر ضم ہو جانے سے ہوا۔ جیسا کہ میں نے واضح کرنے کی کوشش کی ہے یہ بنیاد پرست اسلامی نظریات کی محبت نہیں بلکہ بھارت کے ساتھ عداوت کا جذبہ ہے، جس نے پاکستان کو اس جانب راغب کیا ہے کہ وہ ریاستی مقاصد کے حصول کے لئے جہادی تنظیموں کو استعمال کرے

اگر چہ یہ تصور افغانستان میں سوویت مخالف جہاد کے دنوں میں اس وقت ابھر کر ان کے سامنے آیا تھا جب اس طرح کی اولین تنظیموں کی تشکیل عمل میں لائی گئی، تاہم یہ کشمیری انتفادہ کے حق میں ان کو استعمال کرنے کا فیصلہ ہی تھا جس کے نتیجے میں مذہبی شدت پسندی کی ایک الگ تھلگ قسم کی لہر پوری کی پوری صنعت میں ہی تبدیل ہو کر رہ گئی۔ نائین الیون کے واقعے کے نتیجے میں افغان طالبان کو پاکستان کی طرف سے ملنے والی مسلسل حمایت کے پس پردہ بھی افغانستان میں بھارت کی خاطر خواہ طور پر موجودگی اور اس کے پاکستان کے دفاعی مستقبل پر پڑنے والے اثرات کے حوالے سے تفکرات کارفرما تھے۔ تاہم اگر سوڈان پر پڑنے والے امریکی دباؤ کے نتیجے میں اسامہ بن لادن کبھی بھی لوٹ کر افغانستان نہ آتا تو ایسی صورت میں طالبان، ہوسکتا ہے کہ ابھی تک ملک کے اندر ایک غالب طاقت ہی ہوتے اور اسلامی شدت پسندوں کے لئے پاکستان کی حمایت محض ایک خالص علاقائی مسئلہ ہی ہوتا، پاک۔ بھارت تعلقات میں ایک تلخ عنصر کی طرح مگر ذرا تلخ تر۔ پاکستان کے حوالے سے یہ کہنا درست نظر آتا ہے کہ یہ اپنے حصے کی بدقسمتی کا شکار رہا ہے۔

تاہم اسے بدقسمتی کہیں یا کچھ اور، مگر یہ ایک حقیقت ہے کہ، اب پاکستان شدت پسند اسلامی قوتوں اور مغرب کے درمیان جاری کشمکش میں مرکزی مقام حاصل کر چکا ہے۔ ادھر ادھر سے ہونے والی کھینچا تانی کے نتیجے میں پاکستان ان جہادی قوتوں کے ستم کا واضح نشانہ بن چکا ہے جن کو شہرت کی بلندیوں تک پہنچانے کے لئے اس نے بھرپور کوششیں کی ہیں۔ تاہم اس ساری صورت حال کے باوجود بھی پاکستان شدت پسند اسلامی تنظیموں کے ساتھ اپنا ناطہ مکمل طور پر توڑنے کے لئے تیار نہیں ہے، جیسا کہ افغان طالبان اور لشکر طیبہ کے ساتھ اس کے جاری روابط سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے۔ اگر چہ یہ سچ ہے کہ پاکستان کو خوف ہے کہ یہ تنظیمیں کہیں اس کی دشمن ہی نہ بن جائیں، مگر اس کے نزدیک بھارت کے ساتھ دشمن پر مبنی تعلقات میں یہ اس کے لئے کلیدی اثاثے کی طرح ہیں۔ یہ حکمت عملی خطے میں امریکی مفادات کے حوالے سے اہم مضمرات کی حامل ہے۔ پاکستان نے افغان طالبان کو قبائلی علاقوں اور بلوچستان کی صورت میں جو محفوظ پناہ گاہ فراہم کی ہے، اس کا براہ راست نتیجہ افغانستان میں امریکہ کے لئے پریشانیوں کی صورت میں ہی نکلا ہے۔ افغان طالبان نے ان علاقوں کو حملوں کی کمین گاہ اور ایسے محفوظ ٹھکانوں کے طور پر استعمال کیا ہے جہاں وہ حملے کے بعد واپس چھپ سکتے ہیں۔ نائین الیون کے بعد

برسوں میں القاعدہ کی مرکزی قیادت کو نسبتاً مربوط رکھنے میں ہوسکتا ہے کہ قبائلی علاقوں میں افغان طالبان کا تعاقب کرنے میں پاکستان کے تذبذب نے بھی اہم کردار ادا کیا ہو۔ کیونکہ اگر پاکستان نے آغاز میں ہی طالبان کا پیچھا کرنے کی کارروائی شروع کردی ہوتی تو عین ممکن ہے کہ اسامہ بن لادن کو چھپنے کا کوئی محفوظ ٹھکانہ ہی نہ ملتا۔ امریکہ نے پاکستان اور افغان طالبان کے مابین ربط ختم کروانے کی کوشش میں مالی امداد کے ساتھ ہی خطے کے اندر مسائل کے حل کے لئے مسلسل شراکت عمل کی یقین دہانی بھی کروائی ہے۔ مگر پھر بھی افغانستان میں بھارتی موجودگی کے حوالے سے پاکستان کے تفکرات دور نہیں ہوئے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ مسئلہ فوراً پھر اٹھ کھڑا ہوا ہے۔ آپ اس کو پسند کریں یا نہ کریں، مگر یہ حقیقت ہے کہ پاکستان کے لئے بھارت کے حوالے سے پریشانیاں باقی تمام پریشانیوں پر فوقیت رکھتی ہیں۔

سچی بات تو یہ ہے کہ امریکہ افغانستان کے مسئلے پر پاکستان کے اطمینان کے لئے غالباً کچھ زیادہ نہیں کرسکتا۔ بھارت نے وہاں اپنی بڑے پیمانے پر موجودگی کا جواز یہ پیش کیا ہے کہ وہ علاقے میں شدت پسندی کے پھیلاؤ کو طاقت کے بل پر روکنے میں معاونت کر رہے ہیں۔ مگر ستم ظریفی تو یہ ہے کہ افغانستان میں ان کی موجودگی کے باعث افغان طالبان کے لئے پاکستان کی حمایت کا سلسلہ جاری ہے۔ تاہم اگر بھارت کو وہاں اپنی موجودگی یا سرگرمیوں کا خاطر خواہ حد تک محدود کردینے پر راضی بھی کرلیا جاتا تو پھر بھی پاکستان کو یہی فکر لاحق رہتی کہ کرزئی کی قیادت مین شمالی اتحاد کی حمایت یافتہ افغان حکومت ان کو امریکہ کی وہاں سے روانگی کے بعد دوبارہ آنے کی دعوت دے سکتی ہے۔ ایک نئی حکمت عملی جو اس بنیادی صورت حال کو تبدیل کرسکتی ہے وہ پاک۔ بھارت تعلقات میں نمایاں طور پر بہتری لانے کا عمل ہے۔ اس کے لئے، تاہم، کشمیر کے حوالے سے کسی ایسے حل کا تلاش کرنے پڑے گی جس پر دونوں فریقوں کا اتفاق ہوسکے۔ مگر امریکہ کشمیر کے مسئلے پر براہ راست مداخلت کرنے یا پھر پاک۔ بھارت تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کسی بھی اہم سفارتی کوشش کی ذمہ داری اٹھانے سے انتہائی گریزاں نظر آتا ہے۔ اس نے اپنا کردار بنیادی طور پر ایک طرف رہ کر زور دار حوصلہ افزائی کرنے اور جب دونوں فریق جنگ کی پیش قدمی کرتے نظر آئیں تو بحرانی سفارتکاری کا راستہ اختیار کرنے تک محدود کرلیا ہے۔ امریکی کردار کی راہ میں اہم رکاوٹ بھارتی مخالفت ہے۔ بھارت کسی بھی طرح کی بیرونی مداخلت کے

سخت خلاف ہے اور بڑی سختی سے اس موقف پر ڈٹا ہوا ہے کہ تمام معاملات 1972 کے شملہ معاہدے کی اس تشریح کی روشنی میں کیئے جائیں کہ پاکستان کے ساتھ ہر طرح کے تنازعات کا فیصلہ لازمی طور پر دوطرفہ مذاکرات کے ذریعے ہوگا۔ جیسا کہ ہم نے آٹھویں باب میں دیکھا، دسمبر 2010 میں اس کی موت سے قبل افغانستان اور پاکستان کے لئے امریکہ کے خصوصی نمائندے رچرڈ ہالبروک کو دراصل بھارت اور کشمیر کے حوالے سے ذمہ داری سونپی جانی تھی، مگر بھارت کی طرف سے شدید مزاحمت کے باعث اس تجویز کو ترک کر دیا گیا۔

یقیناً، اگر امریکہ چاہتا تو وہ بھارت پر دباؤ ڈال سکتا تھا کہ وہ بیرونی مداخلت کے حوالے سے اپنا موقف تبدیل کرے۔ مگر اس طرح کا کوئی ثبوت موجود نہیں ہے کہ اس نے کبھی ایسی کوئی کوشش کی ہوگی۔ امریکہ نے بھارت کے ساتھ اپنے تعلقات بڑی محنت کر کے بہتر بنائے ہیں اور اس لئے وہ انہیں بگاڑنے کا خطرہ مول نہیں لینا چاہتا۔ بھارت ایک نوخیز عالمی طاقت ہونے کے ساتھ ہی ایشیا میں چین کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو روکنے میں امریکہ کا ممکنہ حلیف بھی ہے۔ بھارت کے معاملات پر کام کرنے کا طویل تجربہ رکھنے والے ایک اعلیٰ امریکی عہدیدار نے مجھے اعتراف کرتے ہوئے بتایا تھا کہ امریکہ کے بھارت کے ساتھ تعلقات اور باہمی روابط میں ایک طرح سے رومانویت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور یہ رشتہ محض سرد اعدادوشمار اور قومی مفادات تک محدود نہیں ہے۔ حتیٰ کہ اگر اس میں کچھ مبالغہ آرائی بھی پائی جاتی ہے تو پھر بھی اتنی حقیقت ضرور ہے کہ اگرچہ امریکہ کے پاکستان کے ساتھ موجودہ تعلقات کے پس پردہ نظریہ ضرورت کارفرما ہے اور ان میں عداوت اور منافقت کا عنصر بہت حد تک نمایاں ہے، مگر بھارت کے ساتھ امریکہ کے تعلقات زیادہ مستحکم بنیادوں پر استوار ہیں۔ پاکستان کے لئے اہمیت کے حامل بنیادی معاملات میں، جیسے مسئلہ کشمیر کے حل میں مدد کے حوالے سے بیرونی مداخلت اور افغانستان میں بھارتی موجودگی وغیرہ، امریکہ کا جھکاؤ ہمیشہ بھارت کی طرف ہوتا نظر آیا ہے۔ پاکستان، یقیناً معاملات کو اس رخ سے دیکھتا اور اپنی خفگی کا اظہار بھی کرتا رہتا ہے۔ اگر امریکہ کا جھکاؤ ذرا سا بھی پاکستان کی طرف ہوتا، جس کا مظاہرہ کرنے کے لئے وہ بھارت پر کم از کم کشمیر اور افغانستان کے حوالے سے ہی دباؤ ڈالتا نظر آتا، تو اسے پاکستان پر اپنی نیک نیتی کا کچھ نہ کچھ تاثر قائم کرنے میں کامیابی ہو جاتی اور یوں شدید قسم کے ان امریکہ مخالف جذبات میں بھی کچھ کمی آجاتی جو اس وقت

MashalBooks.org

ملک میں عام ہیں۔مگر اس نے ایسا نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔

چنانچہ اس ساری بات کے بعد اب اس امر پر یقین کرنے کی کوئی خاص وجہ نہیں رہ جاتی کہ بھارت کسی بھی صورت میں امریکی دباؤ میں آجائے گا، کیونکہ ایک تو ان معاملات پر وہ بہت حساس ردعمل ظاہر کرتا ہے، دوسرے امریکہ کی طرف سے بھی کوئی اثر ورسوخ استعمال نہیں کیا جاتا۔حتیٰ کہ امریکہ اور بھارت کے درمیان ایٹمی معاہدے کو بھی، جو کہ بھارتیوں کو خوش کرنے کے لئے کی جانے والی حالیہ امریکی کوششوں میں مرکزی اہمیت کا حامل تھا، بھارت میں کافی تنقید کا نشانہ بنایا گیا تھا۔اس طرح پاکستان کی جانب بھی امریکہ کی طرف سے سے اثرورسوخ کا فقدان نظر آتا ہے، کیونکہ امریکہ کو افغانستان میں اپنی فوجوں کے لئے رسد کی فراہمی کے لئے پاکستانی سرزمین استعمال کرنی پڑتی ہے۔چنانچہ اس فکر کا بھی معقول جواز موجود ہے کہ پاکستان پر بہت زیادہ دباؤ ڈالنے سے وہ حقیقتاً معاندانہ رویہ اختیار کر سکتا ہے اور یوں معاملات بگڑ کر رہ جائیں گے، بلکہ اچھے خاصے بگڑ جائیں گے۔ پاکستان اس صورت میں کیا کرے گا اگر امریکہ نے بلوچستان کے اندر افغان طالبان کو نشانہ بنانے کے لئے پری ڈیٹرز کا استعمال شروع کر دیا، یا پھر زمینی فوج بھیجنے کے ساتھ ہی قبائلی علاقوں میں انسان بردار لڑاکا طیارے بھی روانہ کر دیئے اس کے نتیجے میں دونوں فریق تیزی سے ایک مسلح تصادم یا حتیٰ کہ جنگ کی پھسلواں راہ پر بھی گامزن ہو سکتے ہیں۔کسی کو نہیں پتہ کہ اس کا کیا انجام ہوگا؟امریکہ کو پریشانی ہے کہ شدت پسند اسلامی تنظیمیں پاکستان کے ایٹمی اسلحے تک رسائی حاصل کر سکتی ہیں مگر ایسی صورت میں کیا ہوگا اگر پاکستان انہیں ایک عدد ایٹمی ہتھیار خود ہی فراہم کر دے؟

اثر رسوخ کے فقدان اور ایک جنونی اور ہٹ دھرم دشمن کی موجودگی کے باعث امریکہ کو افغانستان میں ایک انتہائی بھیانک مستقبل سے واسطہ پڑ سکتا ہے۔اوباما کی طرف سے بھیجی گئی اضافی فوج جب تک بنیادی صورت حال میں کوئی فیصلہ کن تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوجاتی، اس وقت تک امریکہ کے سامنے صرف دو ہی راستے باقی ہیں۔یا تو اس ملک کے اندر مستقل طور پر فوجیں تعینات رکھے یا پھر اس ملک کو مکمل طور پر یا اس کے اچھے خاصے علاقوں کو افغان طالبان کے حوالے کر دے۔موخر الذکر صورتحال میں یہ خطرہ مضمر ہے کہ نائین الیون سے قبل کی صورتحال لوٹ آئے اور افغانستان ایک مرتبہ پھر القاعدہ اور پوری دنیا کے بددل یا منحرف

مغرب مخالف نوجوان مسلمانوں کی جنت بن کر رہ جائے۔ اسی طرح سے بھارت کا بھی، مستقبل غیر یقینی نظر آ رہا ہے۔ شملہ معاہدہ ہو جانے کے تین عشروں بعد بھی یہ پاکستان کے ساتھ اپنے اختلافات حل کرنے میں ناکام ہو گیا ہے اور کسی طرح کی بیرونی مداخلت کے حوالے سے اس کے رویئے میں پائی جانے والی ہٹ دھرمی کے باعث حالات یقینی طور پر جوں کے توں ہی رہنے کا امکان ہے۔ کشمیر اس وقت دوسرے انتقاضہ کے تکلیف دہ دور سے گزر رہا ہے اور بھارت اس کو صرف طاقت کے وسیع استعمال کے ذریعے قابو کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر پاکستان اور بھارت کے درمیان تعلقات میں بہتری نہیں آتی یا پھر حالات مزید خراب ہو جاتے ہیں تو پھر اس امر کا امکان موجود ہے کہ پاکستان جہادیوں کے سرحد پار سرایت کر جانے کے عمل کی از سرِ نو بھرپور حمایت شروع کر دے۔ لشکر طیبہ کی ابھی تک صحیح و سالم حالت میں موجودگی اور پاکستان کی طرف سے اس کا نکیل ڈالنے کی ہمیشہ کی طرح سے غیر یقینی صلاحیت کے مظاہرے کے باعث بھارت کو ابھی تک ممبئی جیسے واقعات کے دوبارہ پیش آ جانے کے حقیقی امکانات کا سامنا ہے۔ ان کو یہ علم بھی ہے کہ جوابی کارروائی کی کسی قسم کی بھی کوشش، مثلاً آزاد کشمیر میں لشکر کے تربیتی مراکز پر حملے وغیرہ کا نتیجہ پاکستان کے ساتھ جنگ اور ایٹمی تصادم کے خطرے کی صورت میں نکل سکتا ہے۔

ایک آخری پیچیدگی کا ذکر کرتے ہوئے میں یہ کہنا چاہوں گا کہ اگر پاکستان اور بھارت کسی حد تک اپنے اختلافات چکانے میں کامیاب ہو ہی جاتے تو پھر بھی پاکستان کو اس سے، کم از کم قلیل مدت میں کوئی، خاص فائدہ نہ ہوتا۔ اگر اس نے آخر کار افغان طالبان کے خلاف کارروائی کرنے کا فیصلہ کیا ہوتا تو اس کے دشمنوں کی فہرست میں ایک اور کا اضافہ ہو جاتا۔ 2007 کے مجوزہ سمجھوتے کے خطوط پر کشمیر کے حوالے سے بھارت کے ساتھ امن معاہدہ اتنے گہرے اثرات کا حامل ہو سکتا ہے کہ لشکر طیبہ ریاست کی واضح مخالفت میں برافروختہ ہو کر رہ جاتی۔ اس طرح کے حالات میں غالباً امریکہ یا اس کا نیا دریافت کردہ دوست بھارت بمشکل ہی اس قابل ہوتے کہ ایسی تکلیف میں کوئی مدد کر سکتے۔ یہ پاکستان ہی ہے جس نے ان طاقتوں کو پروان چڑھایا اور اب یہ اس پر ہی منحصر ہے کہ ان کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے۔ مستقبل غیر یقینی ہے اور بنیادی سوال ابھی تک وہیں منڈلا رہا ہے: کیا وہ حالات کے تقاضوں کے پیش نظر کوئی مشکل فیصلہ کریں گے یا اس وقت تک اپنی اصلیت چھپاتے رہیں گے جب تک کہ جذبات سے مغلوب نہیں ہو جاتے؟

MashalBooks.org